قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2023 قیمت 15₹

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

بھارت پیارا دیش ہمارا

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

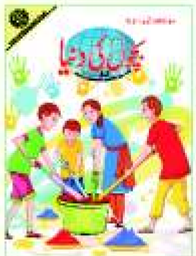

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:25، شمارہ:8، اگست 2023
مدیر : پروفیسر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم، نایاب حسن
ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید
قیمت-/15 روپے سالانہ-/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in
شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-2441519

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4
خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5
ادب: زاویے اور جہات
اردو فکشن پر بہار کے علاقائی اور تہذیبی اثرات — شہاب ظفر اعظمی 9
اردو بارہ ماسہ: ایک جائزہ — عمران احمد 13
طارق جمیلی کی نظم 'پورنیہ' — محمد مرغوب 19

جشن آزادی
تحریک آزادی میں ریاست رامپور کا کردار — رضوان لطیف خاں 21
پہلی جنگ آزادی اور نواب وزیر الدولہ — راشد میاں 23
تحریک آزادی میں مسلم رہنماؤں کا کردار — عبدالسلام 26
تحریک آزادی اور اردو شاعری — سجاد رشید 29

زبان و تعلیم
سوامی ویویکانند کے تعلیمی افکار — آفاق ندیم خان 32

قومی تعلیمی پالیسی 2020 — محمد اکبر القادری 34
لعل و گہر
علامہ سحر عشق آبادی — اسلم جمشید پوری 37
شمیم مظفر پوری کی افسانوی کائنات — علاء الدین خان 39
قیصر شمیم بحیثیت مترجم شاعر — بدر محمدی 42
مولانا عبدالماجد دریابادی کی ڈراما نگاری — شہباز ارشد 45

اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ دسترس — منصور خوشتر 47
شہر بین
سرزمین اجین سے اردو زبان و ادب کی بھینی بھینی خوشبو — غلام حسین 49
سلسلۂ صحافت
'نیا دور' ایک عہد ساز رسالہ — عشرت ناہید 53
خصوصی گفتگو
اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا ضروری ہے: الیاس اعظمی — اشتیاق سعید 56
خراج عقیدت
ولایت جعفری مرحوم کی یاد میں — سہیل کاکوروی 59
نیا آسماں نئے ستارے
فارسی ادب کی ترقی میں آنند رام مخلص کی خدمات — عامر فہد 61
رفعت سروش کی منظوم ڈراما نگاری — ونود کمار 64

مقبول عام ناول نگار: عادل رشید — محمد تنویر 67
کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 69
خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

ہمارا ملک 15راگست 1947 کو آزاد ہوا۔ حصولِ آزادی کا سفر بے شمار قربانیوں سے عبارت تھا۔ یہ پورا سفر کم وبیش ڈھائی سو سال اور مختلف تحریکوں پر مشتمل تھا۔ ان تحریکوں میں جس طرح مختلف طبقات و مذاہب سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں اور مجاہدین آزادی نے حصہ لیا، اسی طرح ان کے ذریعے ہمارے ملک کی مختلف زبانوں نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا اور ان زبانوں کے ادیبوں، صحافیوں اور شعرا و مصنفین نے فکری وتخلیقی سطح پر انگریزی حکومت کے خلاف ماحول سازی اور باشندگانِ وطن کے دلوں میں حصولِ آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔

اس ضمن میں اردو زبان و ادب کا کردار تاریخی رہا ہے۔ اس زبان کے شعرا، ادبا اور مصنفین نے بہت سے ایسے نعرے، اشعار اور الفاظ تحریک آزادی کو دیے، جنھوں نے ہندوستانیوں کے لہو کو گرم کر دیا اور بلا تفریق مذہب وملت سبھی کے سینوں میں آزادی کا جذبہ جوش مارنے لگا۔ انقلاب زندہ باد، سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے اور ان جیسے بہت سے اشعار اور نعرے ہر طرف گونجنے لگے۔ سبھاش چندر بوس کے ذریعے دیا گیا مشہور زمانہ نعرہ 'تم مجھے خون دو، میں تمھیں آزادی دوں گا' بھی اسی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

چونکہ اردو ایسی زبان تھی جس کے سمجھنے اور بولنے والے تمام متحدہ ہندوستان میں موجود تھے اس لیے تحریکِ آزادی کے دوران اردو ہی تمام اہلِ وطن کو ایک لڑی میں پرونے کا کام کر رہی تھی، ایک طرف لوگوں کو انگریزی ظلم و جبر اور استبداد سے آگاہ کیا جا رہا تھا، تو دوسری طرف غلامی کے طوق کو گردن سے اتار پھینکنے کی بھی پوری کوششیں ہو رہی تھیں۔ ہر زبان پر آزادی کا نعرہ تھا اور ہر شخص برطانوی سامراج کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے آمادہ و تیار، اس وقت جہاں ہمارے شعرا نے حب الوطنی اور جذبہ حریت سے لبریز نظمیں لکھیں، وہیں ہمارے ادیبوں اور تخلیق کاروں نے ایسی حوصلہ انگیز اور ہمت افزا تخلیقات پیش کیں، جنھوں نے لوگوں کو دیش کو آزاد کرانے اور غلامی کی زنجیر توڑ پھینکنے کے لیے میدان کارزار میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اردو شاعری کا اگر ہم اس حوالے سے جائزہ لیتے ہیں، تو درجنوں شعرا کے یہاں آزادی اور حب الوطنی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اردو شاعری میں ہمیں آزادی اور وطن پرستی کی گونج کچھ یوں سنائی دیتی ہے۔

ہے محبت اس وطن سے ، اپنی مٹی سے ہمیں	اس لیے اپنا کریں گے جان و تن قربان ہم
وطن کی پاسبانی جان و ایماں سے بھی افضل ہے	میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

تو دوسری طرف ہمارے افسانہ نگاروں اور تخلیق کاروں نے بے شمار ایسے افسانے اور کہانیاں تحریر کیں جن میں اس وقت کے سماجی مسائل کے علاوہ ملک کو درپیش غلامی کے مسائل و مضرات کو بھی موضوعِ تخلیق بنایا اور راست یا بالواسطہ طور پر اہلِ وطن کو آزادی کی اہمیت و معنویت اور غلامی کی لعنت سے باخبر کرتے رہے۔

اسی طرح اردو صحافت کا کردار بھی تحریکِ آزادی کو تیز کرنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بہت نمایاں اور ناقابل فراموش رہا ہے۔ 1857 کے انقلابِ آزادی میں جہاں ہمارے ملک کے سپاہیوں اور حب الوطنی و خودشناسی سے سرشار نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، وہیں اس میں اردو صحافت کی حصے داری بھی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس حوالے سے 'دلی اردو اخبار' اور مولوی باقر کی قربانی تاریخ آزادی کے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی میں زمیندار، اردوئے معلی، الہلال، البلاغ اور ہمدرد وغیرہ نے انگریزوں کی سازشوں اور ظلم و بربریت کو بے نقاب کرنے اور آزادی کی تحریک کو عروج بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس طرح اگر ہم تاریخ آزادیِ ہند کا کسی بھی ناحیے سے تجزیہ کریں، تو اردو زبان کا کردار نہایت روشن و تابناک نظر آتا ہے۔ آج بھی اردو زبان کا یہ کردار نہایت واضح ہے اور ادبی، تخلیقی و لسانی سطح پر وطن عزیز کے مشترکہ کلچر و ثقافت کے تحفظ اور قومی ہم آہنگی کی بقا کے لیے اس کی کوششیں نمایاں اور قابل فخر ہیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

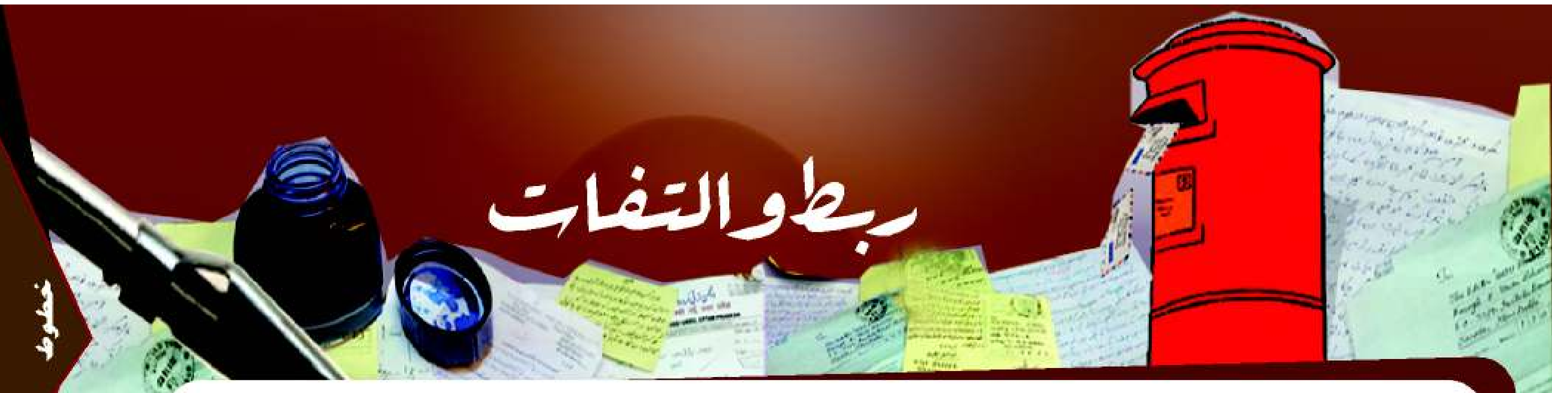

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ھے کہ ماھنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ھمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ھوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

قلم کے سمراٹ منشی پریم چند کی ادبیت سے مرصع تصویر سرورق کی قدر و قیمت بڑھا رہا ہے۔ ادب اور ادیب کے حوالے سے ان کے خیالات نے اس شمارے کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ آپ کی علم دوستی اور ذہانت کا کیا کہنا... موقع ومحل کے اعتبار سے 'اردو دنیا' کو ابتدا تا انتہا آراستہ کرنا، صد قابل ستائش ہے۔ اداریے کا حرف حرف ادبی دنیا میں سرقہ کے حوالے سے ادب کو پہنچنے والے نقصانات کا اشاریہ ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس کو تر و تازہ رکھنے کے لیے، ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کے لیے جدت فکر اور اظہار کے نئے وسیلوں اور ندرت الفاظ کے ساتھ خود اختراعی صلاحیتوں کا ہونا لازمی ہے۔

بہرحال! ادب: زاویے اور جہات، زبان اور زمینی صورت حال، خراج عقیدت، زبان اور تعلیم، لعل و گہر، سلسلۂ صحافت، عالمی ادبیات، خصوصی گفتگو، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا اور خبرنامہ اول تا آخر تمام مشمولات پر، فکر، کارآمد اور جامعات کے نصاب کے عین مطابق ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

'اُردو دنیا' جون 2023 ہدست ہوا۔ اس کا سرورق گلکاری سے مزین ہے جن میں سبز پتیاں الگ اپنی بہار دکھارہی ہیں۔ 'ہماری بات' میں یہ کارآمد بات بتائی گئی ہے کہ زبانوں تک جدید وسائل اور ٹکنالوجی کی رسائی کی وجہ سے لسانی اور ثقافتی منظرنامہ خاصہ وسیع ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے قدیم طرزِ تعلیم کے شدید مسائل سے راحت میسر ہوئی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیشتر تعلیمی اداروں میں ان سہولیات کا چلن عام ہوگیا ہے۔ ان سے سماج کا بڑا حصہ مستفید ہو رہا ہے اور قابل لحاظ حصہ محروم بھی ہے۔ پھر یہ کہ ان کی مدد سے کیا سکھایا جا رہا ہے اور کیا سکھایا جانا چاہیے اور اردو کتنی مستفید ہے اس میں جب تک وسیع النظری اور ذہنی کشادگی کا عمل دخل نہ ہو ہمیں اس سامان سے بہرحال اطمینان کا اظہار گاہے گاہے کرتے رہنا چاہیے۔ 'ربط و التفات' کے تحت دو خطوط درج ہیں۔ ص 7 پر 'اُردو دنیا' کے لیے کالم، زبان اور زمینی صورت حال سے متعلق مواد کے حصول کی خاطر سوالنامہ درج ہے جس میں دو درجن ضروری سوالات دیے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں درکار معلومات حاصل ہوسکیں۔ 'ادب زاویے اور جہات' اس میں پہلا مقالہ 'مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید' ہے، اس میں خاطر خواہ تبدیلی کرکے 'افسانے کی تنقید' پر اور یجنل مضمون لکھ کر اس کے ذیل میں مجنوں گورکھپوری کی آرا درج کی جاتیں تو ایک متاثر کن مقالہ تیار ہو جاتا اور یوں جابجا تعریف وتوصیف کی حاجت نہ ہوتی۔ تاہم اس میں فکشن (افسانہ طرازی) کے تحت داستانیں، افسانے، قصے، حکایتیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ منظوم قصے اور مثنویاں بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ بہرحال اس میں بہت کچھ قابل قدر نکات بھی پائے جاتے ہیں۔ دوسرا مقالہ 'حکیم مومن خاں مومن کے فارسی خطوط کا تنقیدی جائزہ' ایک اچھا مقالہ ہے کیونکہ اس میں مومن کے فارسی خطوط کا اُردو میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس لیے اس کی افادیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کی شروعات لفظ 'خط' کے معنی ووضاحت سے کی گئی ہے۔ پھر فارسی انشا پردازی کا فیضی ونعمت خاں سے ہوتے ہوئے مومن پر اختتام ایک خوشگوار ادبی تسلسل ہے۔ اس کے ہر پیراگراف میں بڑی دلجمعی سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بہرحال نہایت پرمغز ومفید مضمون ہے جس میں اُردو طلبہ کو یقیناً نئی معلومات کا حصول ہوگا۔ مضمون '.......ریاض خیرآبادی' سے سبھی واقف ہیں پر اس مضمون میں گویا اُن کے تعارف کی تجدید کی گئی ہے۔ اس پر نرگسیت کی جو وضاحت اس کے اپنے اساسی اجزا یعنی لوازمات سے کی گئی ہے وہ قابل تعریف اور پڑھنے کے لائق ہے۔ 'انشائیہ کا فن' اچھا مضمون ہے۔

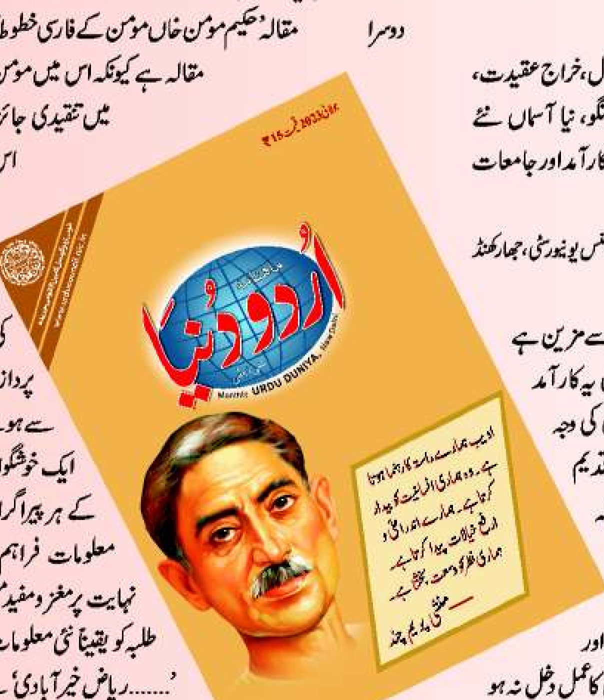

مصنفہ نے انشائیے کی ابتدا بطور ایک غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے کی ہے اور اس طرح ایک دلپذیر تمہید باندھی ہے۔ پھر انھوں نے وزیر آغا، سید محمد حسنین اور نیاز فتح پوری کی دی ہوئی تعریفیں پیش کی ہیں لیکن وہ ان سے غیر مطمئن نظر آتی ہیں جب وہ کہتی ہیں کہ ''یہ تمام تعریفیں ایک دوسرے سے کسی حد تک متضاد ہیں۔'' اور ان کے اس خیال سے عدم اتفاق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پھر محترمہ نے انشائیہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کئی لغات و قاموس کا حوالہ دیتے ہوئے لفظی تحقیق کی جو نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ قابل مطالعہ ہے۔ پھر اس کی فنی خصوصیات کو واضح کیا ہے اور پھر طنز، مزاح اور خاکہ سے اس کا موازنہ قابل مصنفہ کی تحقیقی وتنقیدی اہلیت کا بیّن ثبوت ہے۔ دراصل اس مقالے کو حاصل شمارہ کہا جاسکتا ہے جس کے لیے لائق و فائق مصنفہ اور 'اردو دنیا' کے ایڈیٹوریل کو بہت بہت مبارک باد دی جاتی ہے۔ دراصل ایسے مضامین، مضامین ہوتے ہیں ورنہ معروف وغیر معروف ہستیوں پر اندھا دھند لکھنے سے کیا حاصل۔ نہ ان کی حیثیت میں کمی بیشی ہوسکتی ہے اور نہ آپ کی کوئی خوبی سامنے آتی ہے۔ خیر۔ دیگر مضامین میں 'قرۃ العین حیدر کے سفرناموں......' اور منشی محمد الدین' مضامین ہیں۔ 'زبان اور زمینی صورت حال' میں جناب محمد اسماعیل کا تحریر کردہ 'زبانیں ہی ثقافت کی محافظ ہیں' شامل ہے۔ یہ اس لحاظ سے اچھا مضمون ہے کہ اس میں اُردو دنیا کے سوالنامے کی مدد سے تعلیم وتدریس اور دیگر سطحوں پر اُردو زبان کی صورت حال، دشواریوں اور بنیادی مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ 'کتاب دریچہ' میں جناب منظور احمد گنائی کا مضمون بعنوان 'جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا' شامل ہے۔ انھیں دراصل مقدمہ شعروشاعری، کلیات پروین شاکر اور 'غبار خاطر' جیسی کتابوں نے متاثر کیا۔

'لعل و گہر' میں مختلف شخصیتوں سے متعلق تین عمدہ مضامین شامل ہیں۔ اس کے بعد 'ذکر جگن ناتھ آزاد' اس میں پہلا مضمون 'جگن ناتھ آزاد کی حزنیہ شاعری' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے لکھا ہے کہ جگن ناتھ کی حزنیہ شاعری کا ان کی نجی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ایک تو ان کے والد تلوک چند محروم کی زندگی تمام تر رنج والم میں گزری اور وہی سلسلہ آزاد کی زندگی میں بھی جاری رہا۔ اسی پس منظر میں یہ مضمون لکھا گیا۔ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے رنج والم میں ان کے کلام کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے قاری آب دیدہ ہوجاتا ہے۔ پرتاثر اچھا مضمون ہے۔ اسی سلسلہ کا دوسرا مضمون 'وطن میں اجنبی: تقسیم اور ہجرت کے آئینہ میں' امتیاز احمد کا لکھا ہوا ہے جس میں جابجا اقتباسات دیے ہوئے ہیں۔ یعنی مصنف کا اپنا حصہ نہایت ہی مختصر رہ جاتا ہے۔

'خراجِ عقیدت' میں دو توصیفی مقالے دیے گئے ہیں۔ 'سلسلۂ صحافت' میں جناب خاور نقیب کا لکھا ہوا مضمون بعنوان 'اڈیشا کا پہلا اُردو اخبار ہفتہ وار مسلم گزٹ' شامل ہے۔ انھوں نے صحافت کی مختصر تاریخ سے شروعات کی اور اس میں اخبار وجرائد کی ایک طویل فہرست شامل کرتے ہوئے 'مسلم گزٹ' کے قدیم کرم خوردہ شماروں سے لے کر وہ 1937 تک کے شماروں تک پہنچے۔ صحافت میں تحقیق کی یہ اچھی کاوش ہے۔ پھر 'تحریک آزادی ہند اور اُردو اخبارات' جہانگیر احمد خان کا لکھا ہوا ہے جس کی تفصیلات کئی بار دہرائی جاچکی ہیں۔ تیسرا مضمون 'عوامی ترسیل اور نئی ٹکنالوجی' ہے۔ جس کے لیے مصنف جناب وثیق الرحمٰن داؤد علی ہیں۔ موجودہ دور میں یہ نہایت مناسب مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے ٹکنالوجی کے معنی ومفہوم کی وضاحت کی، پھر عوامی ترسیل، نئی ٹکنالوجی، باہمی ربط، میڈیا کے اقسام، سوشل میڈیا اور نیو میڈیا میں فرق، عوامی ترسیلی زبان اور اخیر میں سماج پر عوامی ترسیل اور نئی ٹکنالوجی کے اثرات جیسے موضوعات پر بڑی خوبی سے گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون نہایت اہم اور پڑھنے کے لائق ہے۔

'عالمی ادبیات' میں عربی ادب سے متعلق دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'بھکاریوں کی ہڑتال' جناب احسان عبدالقدوس کا تحریر کردہ اور جناب محمد قطب الدین کا ترجمہ کردہ ہے۔ دوسرا مضمون 'عربی ادب کا ایک ناول 'لقیطہ' اور سماج کی تصویریں' دیا گیا ہے۔ پڑھ کر دیکھ لیجیے شاید کوئی چیز آپ کے ادراک وفہم کو اپیل کرے۔ 'زبان وتعلیم' میں 'تعلیمی مسائل کی سماجی اساس' جناب محمد شاداب عالم نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے نہایت ترتیب سے تعلیمی مسائل اور ان کی وجوہات کو ترتیب سے پیش کیا ہے۔

'تاریخ وتہذیب' میں جناب شمیم قاسمی صاحب نے 'روہتاس.........' کے تحت تاریخ کے ایک باب کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ 'خصوصی گفتگو' کے ذیل میں ڈاکٹر شکیل احمد سے جناب ظہیر حسن ظہیر نے ادبی گفتگو کی ہے۔ فلم کے تحت جناب واثق الخیر نے ہندوستانی سینما کے 75 برسوں کا جائزہ لیا ہے۔

'طب اور اُردو' میں ڈاکٹر عبدالسمیع نے طب کے حوالے سے اُردو زبان پر سنسکرت کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' میں محمد رضا اظہری نے ''واجد علی شاہ اختر اور ان کی بیگمات کے خطوط کے بارے میں بتایا کہ یہ خطوط ان کی نثر نگاری کی واحد یادگار ہیں۔ 'کتابوں کی دنیا' میں کوئی گیارہ کتب پر تبصرے شامل ہے تاکہ آپ کو کتابوں کے انتخاب میں سہولت رہے۔ 'خبرنامہ' میں اُردو دنیا کی خبریں درج ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ بھرپور مواد سے معمور ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

جون 2023 کا تازہ ترین شمارہ ماہنامہ 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا۔ یوں تو سابقہ روایت سے متصل اس شمارے کے تمام مشمولات بھی قابلِ مطالعہ ہیں لیکن شمیم قاسمی کا مضمون بہ عنوان، 'روہتاس، آدیباسیوں کی قدیم جائے پناہ' انتہائی سیر حاصل، دلچسپ، معلوماتی نیز دستاویزی حیثیت کا حامل مضمون ومقالہ ہے جو صفحہ نمبر 68 سے صفحہ نمبر 72 یعنی پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ میں شکیل سہسرامی اس بہترین تحریر کے لیے اردو دنیا اور محترم شمیم قاسمی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شکیل سہسرامی: نزد رحمان مسجد، سمن پورہ، راجہ بازار، پٹنہ 14 (بہار)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2023 کا شمارہ موصول ہوا۔ مدیر صاحب نے اداریے میں زبانوں کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "زبانوں کو جدید وسائل اور ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی وجہ سے لسانی اور ثقافتی منظرنامہ خاصا وسیع ہوا ہے... ڈیجیٹل عہد میں تعلیم و تدریس کی سطح پر بہت سے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں... ان دونوں نکات سے اردو سے سائنس و ٹکنالوجی کو مربوط کرنا ہے اور اردو کو زمانے کی رفتار سے آگے بڑھانا ہے... قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ پر نہ صرف یہ کہ سائنسی، سماجی، نفسیاتی، تاریخی طبی علوم اور ادب اطفال کا وسیع ذخیرہ ہے بلکہ ادبیات پر مشتمل کتابوں کے علاوہ قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والے چاروں رسائل سہ ماہی 'فکر و تحقیق'، ماہنامہ 'اردو دنیا'، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اور ماہنامہ 'خواتین دنیا' کے شمارے موجود ہیں جن سے قارئین استفادہ کر سکتے ہیں۔

ربط و التفات کا کالم تنقیدی و تحقیقی شعور رکھتا ہے۔ مشمولات کی خوبیاں زیادہ، خرابیاں کم بیان کی جا رہی ہیں۔ بہتر ہوگا خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی بات ہو۔ اس شمارے کا پہلا مضمون 'مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید' جسے ظفر انصاری نے لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں مجنوں گورکھپوری کی اعلیٰ صلاحیت، اور تنقید نگاری پر عمدہ بحث کی ہے۔ نیلوفر حفیظ نے حکیم مومن خان مومن کے فارسی خطوط کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اگر فارسی کے ساتھ اردو خطوط بھی پیش ہوتے تو معلومات میں مزید اضافہ ہوتا۔ محمد یونس ٹھوکر کا مضمون 'کوچہ نرگسیت کا والہ و شیدا: ریاض خیرآبادی' بھی عمدہ مضمون ہے۔ ان کے علاوہ نوشین حسن نے 'انشائیہ کا فن' پر اچھی بحث کی ہے۔ سلسلہ صحافت کے تحت خاور نقیب، جہانگیر احمد خان، اور وثیق الرحمٰن داؤد علی کے مضامین شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عالمی ادبیات کے تحت احسان عبدالقدوس کی کہانی جس کا ترجمہ محمد قطب الدین نے 'بھکاریوں کی ہڑتال' کے نام سے کیا ہے، بہت عمدہ کہانی ہے۔ دوسرا مضمون پریتی بھارتیا کا 'عربی ادب کا ایک ناول 'لقیطہ'' ہے۔ یہ بہت اہم اور عمدہ ناول ہے۔ خصوصی گفتگو کے تحت ظہیر حسن ظہیر نے شکیل احمد سے ان کی زندگی اور ادب کے حوالے سے عمدہ گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ اس شمارے میں عدیلہ جسیم، الطاف احمد، محمد اسماعیل، منظور احمد گنائی، کے پی شمس الدین، عتیق الرحمٰن، عادل احسان، مشتاق احمد وانی، امتیاز احمد، ارشاد احمد، اکمل نعیم صدیقی، محمد شاداب عالم، شمیم قاسمی، واثق الخیر، عبدالسمیع، محمد رضا اظہری کے مضامین بھی شامل ہیں جن کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2023 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق کافی خوبصورت اور خوش رنگ ہے۔ شمارے کی ترتیب میں کوئی 18 شہ سرخیاں شامل ہیں۔ اداریہ (ہماری بات) میں جدید ترین تکنیکی وسائل اور ٹیکنالوجی کو تعلیمی اور تدریسی نظام کا حصہ بنانے کی بات کی گئی ہے اور آن لائن تدریس کی اہمیت و افادیت کو بیان کیا گیا ہے جو کہ آج کے دور کی اشد ضرورت ہے۔ خطوط کے ذیل میں دو خطوط درج ہیں جس میں پچھلے شمارے کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ص 6 پر سوالنامہ دیا گیا ہے جس کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو زبان کی خدمت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ادب: زاویے اور جہات کے تحت 6 مقالے درج ہیں۔ پہلا 'مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید' ہے جس سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے فکشن کے تعلق سے جو باتیں کی ہیں وہ اصولی نوعیت کی ہیں۔ دوسرا اہم مقالہ 'حکیم مومن خان مومن کے فارسی خطوط کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ یہ ایک بہترین تخلیقی اور تحقیقی مضمون ہے، جس سے حکیم مومن خان مومن کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس شمارے کے باقی سارے مضامین بھی موضوعات کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ رسالے کی خوبصورت ترتیب اور عمدہ مضامین کے انتخاب کے لیے ادارتی عملے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد حفظ الرحمن ندوی: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

اردو فکشن پر بہار کے علاقائی اور تہذیبی اثرات

شہاب ظفر اعظمی

زمانۂ قدیم سے صوبہ بہار تہذیب وتمدن،عظیم ثقافتی وراثت، علوم وفنون اور عرفان وآگہی کا سرچشمہ رہا ہے۔ بدھ،سیتا اور شرف الدین یحییٰ منیری کی یہ دھرتی جہاں عالم انسانیت کو امن و عدم تشدد کا پیغام دیتی رہی،وہیں یہاں کے باشندے غربت،افلاس،بھیک،بے روزگاری، بیماری،جہالت اور توہم پرستی کی دھند میں گم اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں رہے،یہ دلچسپ اور متضاد صورت حال اردو ادیبوں بالخصوص فکشن نگاروں کے لیے موضوع و مواد کی فراہمی کا اہم ترین ذریعہ رہی ہے۔

اردو تنقید کی روایت ہمیں بتاتی ہے کہ ادب کے لیے کوئی موضوع نہ پرانا ہوتا ہے اور نہ مقامی۔ ہر موضوع اپنے برتاؤ کے اعتبار سے نیا اور ہر مسئلہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے عالمی ہوسکتا ہے۔لیکن اکائی کی صورت میں کسی خاص علاقے کی اپنی تہذیبی وثقافتی شناخت ہوتی ہے۔ اس کے اپنے مسائل ہوتے ہیں جن کے تار وہاں بسنے والے ہر فرد کی سانسوں کے تار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے صوبہ بہار تہذیب وتمدن، عظیم ثقافتی وراثت، علوم وفنون اور عرفان وآگہی کا سرچشمہ رہا ہے۔ بدھ، سیتا اور شرف الدین یحییٰ منیری کی یہ دھرتی جہاں عالم انسانیت کو امن وعدم تشدد کا پیغام دیتی رہی، وہیں یہاں کے باشندے غربت، افلاس، بھیک، بے روزگاری، بیماری، جہالت اور توہم پرستی کی دھند میں گم اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہ دلچسپ اور متضاد صورت حال اردو ادیبوں بالخصوص فکشن نگاروں کے لیے موضوع ومواد کی فراہمی کا اہم ترین ذریعہ رہی ہے۔ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار 'رشیدۃ النسا' ہوں یا جدید دور میں اردو ناول کو نشاۃ ثانیہ سے ہم کنار کرنے والے سہیل عظیم آبادی، عبدالصمد، غضنفر اور ذوقی۔ ان سب کی تحریروں میں بہار کے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی امتیازات کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ زبان وبیان، انداز رہائش، طرز معاشرت، رسوم ورواج اور مسائل کے اعتبار سے بہار ملک کے دوسرے صوبوں سے بہت حد تک الگ دکھائی دیتا ہے جسے آزادی کے بعد سے آج تک ہر سروے میں ایک پسماندہ اور پچھڑا ہوا صوبہ بتایا گیا ہے۔ معاشی اور تعلیمی پسماندگی نے اسے ایسے مسائل سے دوچار کیا ہے جو اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی اسے حیرت انگیز طور پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ اردو فکشن نگاروں نے جن میں اکثریت کا تعلق اِسی پسماندہ صوبے سے رہا ہے، بہار کے مسائل پر کہانیاں لکھتے ہوئے یہاں کی معاشرتی، تہذیبی اور علاقائی خصوصیات کو مدنظر رکھا ہے۔ آزادی سے قبل رشیدۃ النسا اپنے ناول 'اصلاح النسا' اور شاد عظیم آبادی اپنے ناول 'ولایتی کی آپ بیتی' میں بہار کی تہذیبی اور معاشرتی تصویریں اگرچہ بڑی تفصیل سے پیش کرچکے تھے مگر آزادی کے بعد سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شین مظفر پوری وغیرہ کے ذریعے جس طرح سے مقامی مسائل وموضوعات پر کہانیاں لکھی گئیں اُن میں بہار کے ثقافتی اور تہذیبی شیڈس زیادہ تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سہیل عظیم آبادی کے ناولٹ 'بے جڑ کے پودے' یا افسانوی مجموعوں 'الاؤ' اور 'چار چہرے' کو نگاہ میں رکھیے۔ الاؤ اور چار چہرے کے متعدد افسانوں میں سہیل عظیم آبادی نے بہار کے گاؤں کے سیدھے سادے ماحول اور کرداروں کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ اُن کے شاہکار افسانے 'الاؤ' کی ساری فضا، اس کا نقطۂ عروج اور انجام ایک الاؤ سے مشابہ ہے۔ گاؤں کے سیدھے سادے کسان، ہندو اور مسلمان زمیندار اور پٹواری کے ظلم اور ان کی گھناؤنی سازشوں سے تنگ آچکے ہیں۔ وہ الاؤ کے گرد بیٹھ کر اس سے نجات کی تدبیر سوچتے ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے الاؤ ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور ان کی قوت مقاومت بھی دم توڑ دیتی ہے۔ سہیل نے اس افسانے میں بغیر کسی اخلاقی اپدیش یا رنگ آمیزی کے بہار کے گاؤں کے دکھ سکھ کی کہانی بیان کی ہے۔ گاؤں کی فضا اور ماحول میں جو حقیقت نگاری کی گئی ہے وہ اسے ایسا دائمی رنگ دے دیتی ہے کہ آج بھی وہ رنگ بہار کے گاؤں میں دکھائی دیتا ہے۔ ناولٹ 'بے جڑ کے پودے' میں اگرچہ شہر رانچی اور عیسائی مشنری کی فضا ہے مگر وہاں بھی سہیل نے ایسی ٹوپوگرافی کی ہے کہ نہ صرف چھوٹا ناگپور کی تہذیب بلکہ عیسائی طبقے کی معاشرت اور ان کی تہذیب وثقافت کے متعدد پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ چرچ کا میدان، ڈورمیٹری، مشن کا یتیم خانہ، مشن کمپاؤنڈ، عیسائیوں کی تہذیبی وتمدنی زندگی، چرچ اور کمیونٹی کے مسائل، عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت، رومن کیتھولک فیملی اور عیسائی کردار صوبہ بہار میں رچے بسے ایک مخصوص طبقے کی سائیکی، زندگی اور تہذیب کی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کی طرح ہی اختر اورینوی نے بھی اپنے افسانوں اور بالخصوص ناول 'حسرت تعمیر' میں

آدی باسیوں کی زندگی اور چھوٹا ناگپور کی ٹوپوگرافی کر کے ایک خاص معاشرت سے اردو فکشن کو آشنا کیا ہے۔ چھوٹا ناگپور مشترکہ بہار کا ایک سرسبز وشاداب حصہ ہے جہاں فطرت حسین مناظر، خوبصورت جھرنے، سرسبز پہاڑیاں قدرتی حسن کا لاجواب نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اختر اور ینوی نے وہاں کے قدرتی حسن کے ساتھ آدی باسیوں کی قبائلی تہذیب، ان کی غربت و افلاس، رسم و رواج، رہن سہن اور پسماندگی کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہاں کی تہذیب وثقافت کی تصویرکشی کے لیے جزئیات کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ اردو کے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ حسرت تعمیر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے اندر اپنے عہد کی بہت سی دھاراؤں، رجحانوں اور تحریکوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں جہاں روس اور چین کے انقلاب اور مسولینی کے زوال کے تذکرے ہیں وہیں بھارت چھوڑو تحریک کے لوازمات، چرخہ اور کھدر کی بحث، گاندھی جی کا نقطۂ نظر، انگریزوں کے اکھڑتے قدم، ان کی سازشیں اور تقسیم ہند کی باتیں بڑے حقیقی اور فطری انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

اختر اورینوی کی اہلیہ شکیلہ اختر کا نام بھی اس سلسلے میں اہم ہے کہ ان کا پورا افسانوی کینوس بہار اور اس کے تہذیبی اور ثقافتی منظرنامے پر محیط ہے۔ 'بہار' کو مرکز میں رکھ کر شکیلہ نے جتنے افسانے تحریر کیے ہیں کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کیے۔ ان کا سب سے مشہور افسانہ 'ڈائن' ہی اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ اپنے دور کے کئی مسائل اور معاملات سموئے ہوئے ہے۔ صوبہ بہار ایک پسماندہ اور پچھڑے علاقے کے طور پر جانا جاتا رہا ہے، جہاں تعلیمی پسماندگی نے توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی، دوچہرگی، غربت و افلاس اور طبقاتی کشمکش جیسی برائیوں کو سماجی زندگی کا حصہ بنادیا ہے۔ اِس کہانی کی نائکہ ایک بوڑھی عورت اور نہایت کریہہ شکل وصورت والی مچھوائن ہے جس کا پختہ رنگ اسے مزید خوفناک بنادیتا ہے۔ بڑھیا اپنی دیورانی کے کہنے پر ایک دن گاؤں کے رئیس کے گھر صبح صبح اُسے بقایا پیسے مانگنے آدھمکتی ہے۔ حویلی کی مالکن کا چند ماہ قبل انتقال ہو چکا ہے۔ گھر کی بیٹیوں کو اس حساب کتاب کا علم نہیں، لہٰذا وہ اسے نہ صرف دھتکار دیتی ہیں بلکہ اس پر پیسہ اینٹھنے کا الزام بھی عائد کردیتی ہیں۔ اسی درمیان گھر کی نوکرانیاں یہ انکشاف کرتی ہیں کہ یہ عورت ڈائن ہے اور ابھی تک نہ جانے کتنے لوگوں کا کلیجہ بھون کر کھا چکی ہے۔ دوسری جانب بڑھیا ان سب سے بے پروا مسلسل اپنی فریاد رکھے جارہی تھی:

''بی بی مچھلی کے دام۔ دام باکی ہے۔ اوہی لا ایلی ہے۔ اِگارہ آنہ پیسہ اور پہلے کے سوا گو روپیہ''

بالآخر اس کی دیورانی کو بلایا جاتا ہے جو بتاتی ہے کہ بڑی مالکن نے چند ماہ قبل پٹنہ جانے سے پہلے ڈیڑھ سیر مچھلی خریدی تھی اور عجلت میں پیسے نہ دے سکی تھی۔ اس کی تصدیق گھر کی ملازمہ کھلائی بوا بھی کرتی ہیں۔ اس پورے تماشے کے بعد گھر کی عورتیں سوا روپیہ بڑھیا کے آگے پھینکتے ہوئے قصہ ختم کرنے کی بات کہتی ہیں۔ لیکن اُس بڑھیا کو جیسے ہی یہ علم ہوتا ہے کہ بقایا بڑی مالکن کے ہاتھوں کا ہے، فوراً پیسہ واپس کردیتی ہے اور لاکھ کوششوں کے باوجود واپس نہیں لیتی۔ اُسی کے الفاظ سنیے:

''نا بیٹی نا۔ ہائے اب دوسر کے ہاتھ سے ان کر باکی پیسہ نا تو لیب اور نا لیوے دیب۔ ہائے ہمر مالکینی تو ہمر مائی باپ تھے لا۔ ای سوا گو روپیہ سے دن نا کٹ جائی''

خاص بہار کی دیہی معاشرت کی عکاسی کرتا یہ افسانہ نصف صدی کے بعد بھی اپنی معنویت کے اعتبار سے تروتازہ ہے کیوں کہ ڈائن نام دینا، کلیجہ بھون کر کھانے کا الزام لگانا، ایک خاص طرز کی زبان بولنا اور طبقاتی تفریق جیسے عناصر آج بھی بہار کے دیہی سماج کا حصہ ہیں۔ بہار کے ایسے بہت سارے مسائل پر شکیلہ اختر نے خاص بہاری اسلوب اور بہاری پس منظر میں افسانے لکھے ہیں جنھیں ایک دن، نفرت، دھندلکا، موسی اور شاید جیسی کہانیوں میں بہت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ نوجوان ناقد ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ''جس نے شکیلہ اختر کے افسانے نہیں پڑھے اس نے بہار نہیں دیکھا۔''

ذات پات، طبقاتی کشمکش اور چھوا چھوت جیسی سماجی برائیوں کی جڑیں بہار میں گہری پیوست ہیں۔ اس مسئلے پر شکیلہ اختر، شین مظفرپوری، ذکی انور سے موجودہ عہد کے عبدالصمد، صغیر رحمانی، غضنفر اور احمد صغیر تک مسلسل کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر صرف شین مظفرپوری کے ایک افسانے 'کسی سے کہنا نہیں' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

یہ افسانہ 'بہار' کے موجودہ سماج کی ایک تلخ حقیقت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور یہ حقیقت بہار کی زمین میں اس قدر مضبوط جڑیں پیوست کرچکی ہے کہ ہندوؤں ہی نہیں مسلمانوں میں بھی ذات پات کی تفریق نے پاؤں پسار لیے ہیں۔ شین مظفرپوری جو زمینی سچائیوں سے باخبر تھے انھوں نے بہاری معاشرے میں موجود اس برائی پر کھل کر اظہار کیا ہے۔

شکیلہ اختر کی طرح ہی شین مظفرپوری نے بھی اپنے افسانوں میں بہار کی معاشرت اور تہذیب کو کھل کر برتا ہے۔ اسی لیے بہار کی سماجی زندگی میں پھیلی ہوئی بہت ساری برائیاں ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ مثلاً حلالہ، طلاق، عقد بیوگاں پر افسانہ 'حلالہ'، جہیز کے موضوع پر افسانہ 'جہیز'، کثرت ازدواج پر 'سکنڈ ہینڈ وائف'، کثرت اولاد پر 'بھگوان کی اِچھا' ملاوٹ اور کالابازاری پر 'ثبوت' جیسے افسانے بہار کو زندہ تصویروں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔

تعلیم ہر معاشرے کا ایک اہم جزو ہے جو اس معاشرے کی تہذیبی، ثقافتی اور دانشورانہ پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ بہار کے تعلیمی نظام اور صورت حال کو موضوع بنا کر کئی افسانوں اور ناولوں میں گفتگو کی گئی ہے مگر خصوصی طور پر دو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جن کا موضوع ہی بہار کا تعلیمی نظام ہے۔ بولومت چپ رہو از حسین الحق اور مہاتما از عبدالصمد۔ حسین الحق کے ذریعے 'بولومت چپ رہو' میں پرائمری و مڈل اسکول کی تعلیم اور سکنڈری لیول پر ایجوکیشن

افسران کی نوکر شاہی سے بہار میں تعلیمی بدنظمی اور تعفن زدہ تعلیمی نظام کو اکسپوز کیا گیا ہے جو بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لیے اس ناول کو ہم بہاری سماج کا آئینہ یا سماج کا نقیب کہہ سکتے ہیں۔ پہلے اچھا عہدہ پانے کے لیے علمی صلاحیت اور قابلیت کی شرط تھی اور بعد میں پیسے کی ضرورت پڑی اور اب کسی جگہے میں کام کرانے کے لیے یا جگہ پانے کے لیے نہ علمی صلاحیت کی ضرورت ہے اور نہ قابلیت کی۔ کچھ دنوں تک پیسے کی ضرورت پڑی۔ پھر پیسے کے ساتھ سفارش کی اور اب جب سے ذات پات کی لعنت آئی تو اس شخص کی سفارش چاہیے جس ذات کا حاکم ہو۔ گویا تعلیمی نظام کے بہانے ناول نگار نے بہار میں

شین مظفرپوری نے اپنے افسانوں میں بہار کی معاشرت اور تہذیب کو کھل کر برتا ہے، اس لیے بہار کی سماجی زندگی میں پھیلی ہوئی بہت ساری برائیاں ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں، مثلاً حلالہ، طلاق، عقد بیوگان پر افسانہ 'حلالہ'، جہیز کے موضوع پر افسانہ 'جہیز'، کثرت ازدواج پر 'سکنڈ ہینڈ وائف'، کثرت اولاد پر 'بھگوان کی اِچھا' ملاوٹ اور کالا بازاری پر 'ثبوت' جیسے افسانے بہار کو زندہ تصویروں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔

کرپشن، رشوت خوری، اقرباپروری اور تعلیمی زبوں حالی کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ اس میں ہمارا پورا سماج برہنہ نظر آتا ہے۔ عبدالصمد کا ناول 'مہاتما' بہار میں اعلیٰ تعلیم کی صورت حال کا عکاس ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ بہار میں اعلیٰ تعلیم اقتدار پرستوں، تجارتی ذہن رکھنے والوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئی ہے۔ اس صورت حال کا ذمے دار کون ہے؟ سیاستداں، والدین یا خود اساتذہ؟ ناول اس تشویشناک صورت حال کا کوئی حل پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے اور مسئلے کی شدت کا احساس دلاتا ذہنوں پر ایک سوالیہ نشان ثبت کرتا ہے۔ ناول کا عنوان 'مہاتما' بے ایمان، ضمیر فروش، گھناؤنے کردار کے حامل اساتذہ کے لیے طنز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

بہار میں فرقہ وارانہ فسادات یہاں کے سماجی اسٹرکچر کو وقتاً فوقتاً مجروح کرتے رہے ہیں۔ یہ بہار کی معاشرت اور تہذیب پر اثرانداز ہوئے ہیں۔ بہار سے تعلق رکھنے والے اکثر فکشن نگاروں نے اس موضوع پر اپنے کرب کا اظہار کیا ہے۔ شکیلہ اختر، شین مظفرپوری، سہیل عظیم آبادی ہوں یا دور حاضر کے عبدالصمد، ذوقی اور حسین الحق۔ سب نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں مشترکہ تہذیب کو تار تار کرنے والے ایسے فسادات اور ان کے پس پشت کارفرما عناصر کو اظہار کا حصہ بنایا ہے۔ عبدالصمد کا ناول 'مہاساگر' ذوقی کا 'بیان' کوثر مظہری کا 'آنکھ جو سوچتی ہے' علی امجد کا 'کالی ماٹی' اور محمد علیم کا 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ بالخصوص آنکھ جو سوچتی ہے، اور میرے نالوں کی گمشدہ آواز، مکمل طور پر بہار کے دو شہروں کے فسادات پر مبنی ہیں۔ 'آنکھ جو سوچتی ہے' ہر چند کہ بہار کے شہر سیتامڑھی میں برپا ہندو مسلم فساد اور فرقہ وارانہ منافرت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے مگر فکری طور پر ایسے سوالات اٹھاتا ہے کہ فساد کا مسئلہ پورے عالم انسانیت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی طاقت کمزور طاقت کو روند رہی ہے، حیوانیت کا ننگا ناچ عروج پر ہے۔ بہار جیسے صوبے کا عام سچا اور سیدھا سادا نوجوان انتشار اور کساد بازاری کے کنارے بدلتی زندگی کو دیکھ کھڑا سسک رہا ہے۔ کوثر نے فسادات کی تفصیلات اور مناظر بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے پیش کیے ہیں جو حواس پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محمد علیم کا ناول 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' اسی موضوع پر نسبتاً بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔ کہانی بہار کے ایک شہر سے شروع ہوتی ہے مگر اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ پورے ہندستان پر منطبق ہو جاتی ہے۔ یہ ناول زندگی کا احتجاج ہے، ظلم بربریت اور خوف کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد کی آواز ہے۔ ناول کا دوسرا پہلو بہار کی معاشرت، گاؤں کی زندگی اور بہاری باشندوں کی نفسیاتی پیش کش ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ بہار میں تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی حد درجہ ہے۔ خاص کر مسلمانوں کے یہاں تو اس کا فیصد صفر کے برابر ہے۔ یہ پسماندگی نہ صرف ان کے اجتماعی مسائل کو ہوا دیتی ہے بلکہ انھیں استحصال کا شکار بھی بناتی ہے۔ یہ طبقہ کھانے پینے اور کھیتوں میں مزدوری کو ہی زندگی کا اولین مقصد سمجھتا ہے۔ یہ پسماندہ طبقہ بدلتی زندگی اور انقلاب سے دوچار سماج سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا تو خود کو مختلف برادریوں، بولیوں، مسلکوں اور رسموں میں محبوس کر کے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی گمشدگی کا رونا روتا ہے۔

آخر میں مشترکہ بہار کے تین ناولوں کا ذکر ناگزیر سمجھتا ہوں جو مکمل طور پر علاقائی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اول 'فائر ایریا' دوم 'تخم خوں' اور سوم 'کالی ماٹی'۔ 'کالی ماٹی' علی امجد کا ناول ہے جس میں انھوں نے صنعتی شہر جمشید پور کے کارخانے اور اس سے متعلق افراد کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ کارخانے میں مختلف جگہوں سے آکر بسنے والے افراد سے کام کرتے ہیں اس لیے فرقہ واریت، طبقاتی کشمکش اور مختلف تہذیبی و ثقافتی اقدار کے نقوش اس ناول میں نظر آتے ہیں۔ ناول سے پہلے علی امجد کی پیش کردہ تحریر کا یہ حصہ دیکھیے جس سے موضوع کی ثقافتی و تہذیبی اہمیت کا اندازہ ہو پائے گا:

''اس شہر کے اردگرد سیکڑوں میل میں آدی باسی، سنتھال، ہو، منڈاری، لوہے مینگنیز تانبے اور سونے کی زمین میں دفن خزانوں کے امین اب بنگالی، بہاری، اڑیہ، مدراسی، پنجابی، پٹھان، ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ جمع ہو کر ایک نئے معاشرے کا تانا بانا بن رہے ہیں۔ اپنی محبتوں، اپنی نفرتوں، اپنی علاحدہ علاحدہ انفرادی اور اجتماعی پہچان اپنے ساتھ لیے قدیم قبائلی نظام سے براہ راست صدیوں کی جست لگا کر بیسویں صدی میں صنعتی زندگی زندگی کی گہما گہمی اور افراتفری میں کھوئے ہیں۔''

(ایک قرض ماضی کا)

یہ ایک ایسے مخلوط معاشرے کی کہانی ہے جس میں مختلف مذاہب اور مختلف زبان کے لوگ محبت اور محنت کے بل بوتے پر خوشی اور غم بانٹتے ہیں اور شہر آہن کو ایک منفرد تہذیبی و ثقافتی شناخت عطا کرتے ہیں۔

الیاس احمد گدی کا ناول 'فائر ایریا' بھی ایک ایسے ہی کارخانے کو مرکز میں رکھ کر لکھا گیا ہے مگر 'کالی ماٹی' کے مقابلے میں زبان و بیان، علاقائی تہذیب اور موضوع کے لحاظ سے زیادہ ہمہ گیر اور حقیقت پسندانہ ہے۔ کوئلے کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں، اس سے وابستہ ٹھیکے داروں، سیاست دانوں اور غنڈے بدمعاشوں کی زندگی اور ان کے اعمال کے علاوہ آدی باسیوں، پسماندہ طبقوں اور بہار کے مختلف شہروں سے کام کی تلاش میں آئے غریبوں کے استحصال کا قصہ الیاس احمد گدی نے بڑی سچائی کے ساتھ ناول کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

'فائر ایریا' کا محور جس صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے وہاں کے مزدور منظم سیکٹر کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے ٹریڈ یونینزم ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ناول کا یہ پہلو ایسا ہے جو اب تک کہیں پیش نہیں ہوا تھا۔ الیاس احمد گدی نے ٹریڈ یونین کی سیاست کی مختلف شکلیں، اس کے مختلف رُخ اور اس کے زندگی و سماج پر اثرات کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس پیش کش

میں انھوں نے کرداروں کی تشکیل، پلاٹ کی بنت اور زبان و بیان کو پوری طرح بہار کے مختلف علاقوں سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ چونکہ ناول کے کردار آرہ، چھپرہ، بلیا، دربھنگہ، مگدھ، متھلا اور بھوجپور جیسے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ناول نگار نے نہ صرف ان کے عادات و اطوار، طرز رہائش میں فرق دکھایا ہے بلکہ ان کی زبان، لب و لہجے اور محاورات میں بھی حقیقی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ فائر ایریا کی تخلیق وہ شخص کر رہا ہے جو بہار کے جغرافیائی حدود، زبان، ماحول اور کلچر سے بخوبی واقف ہے۔ علاقائی زبان کی چند مثالیں دیکھیے :

''مسلا ہودلری کے مائی اب تو املی کے پیڑ میں آم لاگی''
دوسری بولی۔ ''ہاں بہن نالی میں گنگا بہے لاگل ای کلجگ ما'' (ص 28)

''میاں کے گھر کا بھات بھکوس کر واپس ہوا تو من ایک دم ہلکا ہو چکا تھا'' (93)

''چارا کشر کیا پڑھا دیے کہ ایکدم سے پنڈت ہو گئے مطلب یہ کہ گرو گڑ رہ گیا اور چیلا چینی ہو گیا۔'' (ص 79)

''کا ہو کولیری میں کام کرے کے من با کہ نا؟ کول وری کے گینتا جھوری تک ہم کو پہچانتا ہے کتنا دن ہو گئیل ہو؟ جب کچھ نیکھے جانت تو او چھری کے بھائی سنگ دوستی کیسے ہو گئیل۔'' (ص 48)

ایسے مخصوص علاقائی الفاظ اور محاورے کثرت سے استعمال ہوئے ہیں جو مخصوص معاشرے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دونا، ماں للوری، بھات، چوکھا، جھورا، پوکھر، گمٹی، کامن، ملکٹا، گانٹھ کا پورا، دیہہ جرا کے پوت، ڈھبری، بھکوسنی، بترو، منہ جھونسا، مہارو وغیرہ بہت سے الفاظ و تراکیب ہیں جن کا مطلب سیاق و سباق سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ الفاظ مکمل طور پر بہار کے مختلف علاقوں کی زبان اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

صوبہ بہار کا ایک بڑا حصہ طبقاتی جنگ یعنی دلت اور اعلیٰ ذات کی سماجی جنگ لڑتا رہا ہے۔ گذشتہ تین چار دہائیوں میں اس جنگ نے صورت حال خاصی حد تک بدل دی ہے۔ بہار میں 'دلت تحریک' اور دلت صورت حال کو مدنظر رکھ کر یوں تو سبھی فکشن نگاروں نے لکھا ہے مگر جن لوگوں نے اس پر زیادہ لکھا ہے ان میں جابر حسین، غضنفر، احمد صغیر اور صغیر رحمانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جابر حسین کی ڈائری 'سن اے کاتب' میں اکثر واقعات بہار کی دلت آبادی اور اس کے درد و کرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ مالن مائی، کلوا کہار، رام سیتھی، گاڑھو رام، رام روپ، مرنی، مالتی، جمنا نائی، شانتی دیوی وغیرہ ایسے کردار ہیں جو بہار کی اُس معاشرتی سطح کو اجاگر کرتے

> ''
>
> بہار کی علاقائی اور تہذیبی زندگی مذکورہ افسانوں اور ناولوں میں پوری طرح واضح ہوکر سامنے آتی ہے،یہ فکشن بہار کی خارجی حقیقتوں اور تجربوں کاهی احاطہ نہیں کرتا بلکہ خارجی وسیلے سے یہاں کے باشندوں کی ذات کے نہاں خانوں میں اتر کر ان کی خوابیدہ حس کو بیدار کرنے اور ان کے ساکت وجدان میں تحرک پیدا کرنے کی بھی سعی کرتا ہے۔
>
> ''

ہیں جس پر ہماری نگاہ بھی نہیں جاتی۔

احمد صغیر نے بھی دلتوں کے ساتھ ہونے والے اشرافیہ طبقات کے سوتیلے سلوک کو شدت سے محسوس کیا ہے اس لیے اردو میں شاید پہلا ایسا مجموعہ انھوں نے پیش کر دیا جو مکمل طور پر دلت کہانیوں پر مشتمل ہے۔ احمد صغیر کی نگاہ میں بہار کے مگدھ، بھوجپور، متھلا وغیرہ کے علاقے رہے ہیں جہاں یہ تفریق نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے۔

مکمل طور پر دلت مسائل کو موضوع بنا کر اردو میں دو ناول لکھے گئے ہیں۔ ایک غضنفر کا 'دویہ بانی' اور دوسرا 'صغیر رحمانی کا 'تخم خوں'۔ دویہ بانی کا تعلق بظاہر صوبہ بہار سے نہیں ہے مگر جس طرح کے مناظر، لفظیات اور جزئیات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نگاہ میں بہار کے ہی علاقے اور گاؤں رہے ہیں۔

مگر ناول کی شاعرانہ زبان اور قدیم روایت پر مبنی کہانی کی وجہ سے یہ دلتوں کی معاصر صورت حال کا عکاس نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے مقابلے میں صغیر رحمانی کا ناول 'تخم خوں' بہار کے دلت سماج اور ان کی معاشرت کو زیادہ حقیقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ جنوبی بہار میں شاہ آباد کا علاقہ بھوجپور ہے جو دھان کی زبردست پیداوار کی وجہ سے 'چاول کا کٹورا' بھی کہلاتا ہے۔ اِس علاقے میں نکسل موومنٹ اور دلت تحریک کی ایک طویل تاریخ رہی ہے۔ صغیر رحمانی نے اس تاریخ کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے اور ماضی قریب کے دلت جدوجہد، طبقاتی احتجاج اور اس سے وابستہ سیاست کا مشاہدہ بغور کیا ہے۔ اس لیے تخم خوں کا ہر صفحہ ان کے مطالعے اور مشاہدے کا عکاس ہے۔ انھوں نے دلت معاشرے کو اخباروں اور کتابوں سے نہیں جانا ہے بلکہ دلت کرداروں کے ساتھ جی کر ان کی سائیکی میں اترنے کی کوشش کی ہے۔

آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی شاعری میں ہوتا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں اجاگر ہوتی ہے۔'' بہار کی تہذیب و ثقافت کی روح بھی وہاں لکھے گئے فکشن کی مدد سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا بہار کی ایک ذہنی اور سماجی تاریخ اِس فکشن میں محفوظ ہو گئی ہے۔ یہ ناول صرف بہار کا نام استعمال نہیں کرتے بلکہ ان میں ہم صدیوں سے جوجھتے، جدوجہد کرتے انسانوں کی پوری تاریخ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ طوالت کے خوف سے ایسے بہت سارے ناولوں اور افسانوں کا ذکر نہیں ہو سکا ہے جن میں بہار کے علاقائی اور تہذیبی اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں ذکی انور، انور عظیم، ظفر اوگانوی، کلام حیدری، قاسم خورشید وغیرہ کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا اور خواتین کے مسائل کے ذکر کے لیے آشا پربھات، ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، اشرف جہاں اور نوشابہ خاتون وغیرہ پر بھی گفتگو کرنا چاہتا تھا، اختر آزاد، مجیر احمد آزاد اور خورشید حیات وغیرہ کے نئے موضوعات و مسائل کو بھی گرفت میں لینا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ شوکت حیات، پیغام آفاقی، ذوقی وغیرہ کے فکشن سے بہار کا عطر کشید کروں، اور بھی باتیں تھیں، اور بھی نکات تھے جنھیں وقت اور صفحات کی تنگی کے سبب چھوڑ دینا پڑا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ جائزہ اس کا اعتراف کروانے کے لیے کافی ہے کہ بہار کی علاقائی اور تہذیبی زندگی مذکورہ افسانوں اور ناولوں میں پوری طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہ فکشن بہار کی خارجی حقیقتوں اور تجربوں کا ہی احاطہ نہیں کرتا بلکہ خارجی وسیلے سے یہاں کے باشندوں کی ذات کے نہاں خانوں میں اتر کر ان کی خوابیدہ حس کو بیدار کرنے اور ان کے ساکت وجدان میں تحرک پیدا کرنے کی بھی سعی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے اردو فکشن کا ایک بڑا حصہ فکری و موضوعاتی سطح پر بہار کی زندگی اور معاشرے کے مختلف النوع گوشوں اور جہتوں کا بخوبی احاطہ کرتا ہے اور دونوں سطح پر اردو ناول نگاری کے دامن کو وسعت و تنوع سے ہمکنار کرتا ہے۔

■

Dr.Shahab Zafar Azmi
Associate Professor & Head
Department of Urdu
Patna University Patna 800005
drshahabzafar.azmi@gmail.com
Mob;8863968168

عمران احمد

اردو بارہ ماسہ

ایک جائزہ

بارہ ماسہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں عورت اپنے شوہر سے جدائی اور ہجر کو موسم کے بدلتے مزاج کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ابتدا میں یہ صنف منظوم عشقیہ داستانوں کا ایک جز ہوا کرتی تھی لیکن بعد میں اپنی مقبولیت کی وجہ سے اس نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی۔ بارہ ماسہ ایک عوامی صنف شاعری ہے۔اس کے ابتدائی نقوش ہمیں گیارہویں اور بارہویں صدی میں لکھے جانے والے جین بارہ ماسوں میں ملتے ہیں،جس میں برہ ورنن،رتو ورنن اور شرنگار رس کی شاعری کے بعض لوازمات کے ساتھ ماحول کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ان بارہ ماسوں میں تشبیہ و استعارے،تلمیح اور تمثیل کا جو اسلوب بروئے کار لایا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر پرکاش مونس لکھتے ہیں:

''بارہ ماسوں کی باقاعدہ ابتدا جین سادھوؤں کی شعری تصنیفات سے ہوتی ہے، جن میں لوک کتھائیں، عوامی روایتیں اور نیم تاریخی قصے بیان کیے گئے ہیں،جن کے ضمن میں بارہ ماسے آئے ہیں۔''

(تنویر احمد علوی کا جہان معانی جلد اول ص 495)

بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس صنف شاعری کی ابتدا سنسکرت سے ہوئی ہے۔کیونکہ رامائن جیسی اہم تصنیف میں چار موسموں کا ذکر کیا گیا ہے جس میں بسنت، برسات، جاڑا اور جاڑے کے بعد کا موسم اہم ہے۔اسی طرح کالی داس نے اپنی تصنیف میں چھے موسموں کا ذکر کیا ہے۔ان کا بارہ ماسہ گرمی سے شروع ہوکر بسنت پر ختم ہوتا ہے۔ جب کہ بیسل دیو راس کا بارہ ماسہ کارتک سے شروع ہوکر کنوار پر ختم ہوتا ہے۔ پندرہویں صدی میں گنپت کوی کا لکھا ہوا بارہ ماسہ پھاگن سے شروع ہوکر چیت پر ختم ہوتا ہے۔ ہندی ساہتیہ کوش میں بارہ ماسے کے ابتدائی نقوش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

''سنسکرت میں چھ موسموں کا بیان عظیم شاعروں کا ایک ضروری حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔لیکن ہر ایک ماہ کی الگ الگ نشاندہی کرکے شوہر کے فراق میں جھیلے جانے والے دکھوں کو بیان کرنا ہندی بارہ ماسوں کی نجی خصوصیت ہے۔''(متاع بارہ ماسہ ص 41)

شمالی ہند میں کئی مختلف زبانوں میں صنف بارہ ماسہ رائج اور مقبول ہوئی۔مثلاً پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بنگالی،مراٹھی،اودھی اور ہندی میں عمدہ بارہ ماسے لکھے گئے ہیں۔بھگتی کال کے شعرا نے خاص طور پر اس جانب توجہ دی۔اودھی زبان کے اہم شعرا میں قطبن، جائسی اور منجھن شمار کیے جاتے ہیں۔ پندرہویں صدی کے ہندستانی شعر و ادب میں اس پایے کی ادبی تصانیف کے نقوش ملتے ہیں۔ اردو میں عوامی شعر و ادب کی جو روایت رہی ہے ان میں بارہ ماسے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔افضل کی بکٹ کہانی کو عموماً اردو کا پہلا بارہ ماسہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ شمالی ہند کے اس شاعر کا پورا نام محمد افضل اور تخلص افضل تھا۔ بکٹ کہانی کا زمانہ تصنیف 1625 ہے جس کا ذکر اردو کے قدیم تذکروں میں بھی موجود ہے۔افضل کے اس بارہ ماسے کو حافظ محمود شیرانی، پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اردو میں جتنے بھی بارہ ماسے لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب 'لوک ساہتیہ' کے گیت کی روایت سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بارہ ماسہ ایک مستقل صنف کی صورت میں سامنے آیا۔اردو کے یہ بارہ ماسے مختصر گیت ہی نہیں بلکہ طویل اور اپنی جگہ پر ایک مکمل عشق نامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ لفظ بارہ ماسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بارہ مہینوں سے ہے۔ یہ ایک مرکب ہندی لفظ ہے اور حرفی طور پر یہ لفظ مذکر ہے اور دو اجزا پر مشتمل ہے۔ اسی نسبت سے اسے بارہ ماسہ کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں سال کے بارہ مہینوں کے درد جدائی کی تفصیل ہوتی ہے۔ دراصل بارہ ماسہ ایک پریم کہانی ہے۔ یہ درد و غم میں مبتلا منظوم عشقیہ داستان ہے۔ بارہ ماسے میں ایک مجبور عورت اپنے محبوب کے درد جدائی و ہجر کو بیان کرتی ہے۔ بارہ ماسے میں عورت کے جذبات اس کی اپنی زبان میں پیش

بارہ ماسہ ایک عوامی صنف شاعری ہے۔اس کے ابتدائی نقوش ہمیں گیارہویں اور بارہویں صدی میں لکھے جانے والے جین بارہ ماسوں میں ملتے ہیں،جس میں برہ ورنن، رتو ورنن اور شرنگار رس کی شاعری کے بعض لوازمات کے ساتھ ماحول کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ان بارہ ماسوں میں تشبیہ و استعارے، تلمیح اور تمثیل کا جو اسلوب بروئے کار لایا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔

کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے فراق میں تڑپتی ہے اور سال کے ہر مہینے میں موسم کے مزاج کے ساتھ اپنے دل کے احوال بیان کرتی ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں پر رشک کرتی ہے کہ انھیں اس طرح کے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہے اور وہ دردِ جدائی سے انجان ہیں۔ وہ اپنے عاشق کو بلانے کے لیے کبھی کسی ملا تو کبھی کسی پنڈت اور جیوتشی کے پاس جاتی ہے کہ شاید وہ کوئی ایسا نسخہ بتا دے جس سے اس کا بچھڑا ہوا محبوب واپس آجائے۔ یہی کرتے کرتے سال کے گیارہ مہینے بیت جاتے ہیں۔ بارہویں مہینے میں اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اس کا محبوب پردیس سے واپس آجاتا ہے۔ اس طرح اس کا درد و غم خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اردو زبان کی مشہور لغت 'فرہنگ آصفیہ' میں بارہ ماسے کا مفہوم اس طرح سے پیش کیا گیا ہے:

''وہ نظم جس میں ہندی کے بارہ مہینوں کی تکلیف اور کیفیت، فراق زدہ عورت کی طرف سے بیان کی جاتی ہے۔'' (فرہنگ آصفیہ جلد اوّل مطبوعہ لاہور)

ہندی ساہتیہ کوش میں بارہ ماسے کی ادبی اصطلاح کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

''بارہ ماسہ لوک گیتوں کی وہ قسم ہے جس میں کسی مجبور عورت کے سال کے ہر ایک ماہ میں محسوس کیے ہوئے دکھوں اور دل گداز حالتوں کی تفصیل پائی جاتی ہے۔''

(متاع بارہ ماسہ ص 15)

بارہ ماسہ ایک بیانیہ صنف ہے اور صنف کے اعتبار سے بارہ ماسہ نظم میں داخل ہے۔ یہ بیانیہ ایک کرداری ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں قدرتی مناظر کی مصوری اور موسیقی کی اصطلاحیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ بارہ ماسہ بارہ ٹکڑوں یا بندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بارہ ماسے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر ماہ کے جذبات اور محسوسات ہندی مہینوں کی ترتیب کے مطابق الگ الگ پیش کیے جاتے ہیں۔ تمام بارہ ماسوں میں جدائی کے کرب کے ساتھ ساتھ موسموں کے اثرات، تہواروں کا ذکر اور قدرت کے مناظر کا بیان ملتا ہے۔ بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو بارہ ماسہ ایک روحانی تجربہ بھی ہے اور سادھنا بھی ہے۔ اس کے اندر بدلتے موسم میں عورت کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بارہ ماسے میں ہر مہینہ حد درجہ رومانی ہوتا ہے۔ فراق کے لمحوں میں گرفتار عورت کی ذہنی کیفیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر موسم کی رومانیت کتنی گہری ہے۔

نہ مجھ کوں بھوک دن، نا نیند راتا
برہ کی درد سوں سینہ پراتا

پیا کی یاد میں روتی پھروں ہوں
جدائی کی اگن میں نیت جڑوں ہوں

بارہ ماسے کے اقسام کے حوالے سے بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انجام کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک قسم وہ جس میں شروع سے لے کر آخر تک فراق و اضطراب کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں سال کے اختتام پر بھی عاشق کی حالتِ زار اُسی طرح برقرار رہتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا اختتام وصلِ یار پر ہوتا ہے۔ بارہ ماسے کی ان دونوں اقسام میں پہلی قسم کو المیہ اور دوسری قسم کو طربیہ کہا جا سکتا ہے۔ بارہ ماسہ خواہ المیہ ہو یا طربیہ اس کی تکمیل چند اہم لوازمات سے مل کر ہوتی ہے۔ ان عناصر میں یادِ محبوب، غمِ ہجراں اور تمنائے وصل اہم ہیں۔ اردو بارہ ماسے میں ان تینوں حالتوں کی سچی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ترکیبی عناصر بارہ ماسوں کے لیے اہم خیال کیے جاتے ہیں۔

بارہ ماسے میں زبان و بیان اور اسلوب نسوانی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ریختی میں عورتوں کے جذبات کا اظہار خود عورتوں کی زبان میں کیا جاتا ہے اسی طرح اس صنف میں بھی جذبات اور خیالات کے اظہار کے لیے نسوانی زبان کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ مگر اس مماثلت میں ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ بارہ ماسے کا دامن ابتذال اور سوقیت سے بے داغ نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''ریختی میں صرف عورتوں کی زبان کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ پیشہ ور عورتوں کے مبتذل جذبات، بازاری اور عامیہ زبان میں ادا ہوتے ہیں۔'' (متاع بارہ ماسہ ص 38)

اس کے علاوہ اگر دیکھا جائے تو فنی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ ریختی کے لیے فارسی بحروں کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا جب کہ بارہ ماسے میں ایسی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ بارہ ماسے کی کائنات کافی رنگا رنگ اور متنوع ہے۔ اس میں عشقیہ جذبات کی کامیاب تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سماج اور تمدن اور قدرتی مناظر کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔ مثلاً

ہوا میں ہووے نیرنگی نہ کیوں کر
ہزاروں رنگ اڑیں جب یوں ہوا پر

بارہ ماسے کے لیے کوئی خاص یا مخصوص ہیئت متعین نہیں کی گئی ہے۔ اس میں شاعر کو اس بات کی پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے محسوسات اور جذبات شوق کے لیے جس شکل کو مناسب سمجھے اس کا استعمال کر سکتا ہے۔ شاعر کے لیے کم و بیش یہی آزادی بحر و وزن کے سلسلے میں بھی نظر آتی ہے۔ بحر و وزن کا استعمال شاعر کی طبیعت پر منحصر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف بارہ ماسے مختلف ہیئت اور بحر میں لکھے گئے ہیں۔ قدیم شعرا نے اپنے بارہ ماسوں میں ہندی دوہا، دوہرے کو شامل کیا ہے۔ یہ طریقۂ کار اس عہد میں بے حد مقبول تھا۔ اردو شاعروں نے زیادہ تر بارہ ماسے مثنوی کی شکل میں لکھے ہیں۔ اودھی کے عموماً سبھی شاعروں نے بارہ ماسے کو دوہا اور چوپائی کی ہیئت میں لکھا ہے۔ لیکن بعض دیگر شعرا نے خصوصاً محمد عبداللہ علم متزادادی اور ترجیع بند کی صورت میں لکھا ہے، جب کہ عبداللہ نے غزل کی ہیئت میں لکھا ہے۔ قطبی، جائسی، عثمان اور قاسمی شاہ کے بارہ ماسے چوپائی کے وزن میں لکھے گئے ہیں۔ وہاب اور افضل کے بارہ ماسے بحر ہزج مسدس محذوف میں لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح منشی ڈوری لال کا ایک مختصر بارہ ماسہ ترجیع بند کی شکل میں ملتا ہے جو صرف آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں کنوار، کارتک اور اگہن کا حال ایک ہی بند میں کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

کنوار نند کے کنوار نہ آئے
کارتک سیج نہ سہاتی
اگہن بسر گئی سدھ تن من کی
بَن بَن ڈھونڈھن جاتی
من موہن سوہن بن ہے نہ چلن دن راتی

(متاع بارہ ماسہ، ص 43)

درج بالا اشعار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بارہ ماسہ لکھنے کے لیے شاعر کو کسی مخصوص ہیئت کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو بارہ ماسے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے بارہ ماسوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان

بارہ ماسے میںزبان و بیان اور اسلوب نسوانی انداز میںپیش کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ریختی میں عورتوں کے جذبات کا اظہار خود عورتوں کی زبان میں کیا جاتا ہے اسی طرح اس صنف میں بھی جذبات اور خیالات کے اظہار کے لیے نسوانی زبان کو بروئے کار لایا جاتا ہے،مگر اس مماثلت میں ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔

میں زبان، ہیئت اور جذبات و احساسات میں یکسانیت نظر آتی ہے لیکن شاعر اپنے لب و لہجے اور ذاتی اظہار کی انفرادیت سے ان میں تنوع پیدا کر دیتا ہے۔ بارہ ماسے کی بنیاد درد وغم اور جستجو و آرزو پر قائم ہے۔ اس کے خاص موضوعات ہجر اور فراق کی واردات ہیں۔ مشرقی معاشرہ شوہر پرست تسلیم کیا جاتا ہے۔ مشرقی عورتوں کے لیے اپنے شوہر کی جدائی سے زیادہ اور کیا کرب ہو سکتا ہے؟ مشرقی عورتیں اپنا حسن و شباب، زیب و زینت اور خلوص و محبت سب کچھ اپنے شوہر کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ برہن کو جب اپنے شوہر کے فراق کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس کا برملا اظہار اپنی زبان میں کرتی ہے۔ ہجر میں عورت کی اس کیفیت کی ترجمانی میر حسن نے کچھ اس طرح سے کی ہے۔

محبت میں سودا سا ہونے لگا
جنوں، تخم، وحشت کا بونے لگا

ہجر و فراق میں جنسی نزاکت کے لطیف جذبات اور درد انگیز محسوسات اور باطنی اضطراب کو شاعروں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اس کی عکاسی بھی کی ہے۔ لیکن ایسی صورت کی بھرپور ترجمانی ہمیں صرف بارہ ماسے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ بارہ ماسے میں عورت کی اس بے قراری اور تڑپ میں اس کی شگفتگی اور اس کا انتہائی خلوص پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے بیان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہوتا جو نفرت اور بے زاری کی غمازی کرتا ہو۔ بارہ ماسے میں عورت اپنے جمالیاتی تجربے میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے کلام میں محبوب کے کھو جانے کا نہ صرف احوال ملتا ہے بلکہ جدائی کا کرب بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بارہ ماسوں میں حسّی جذباتی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں عورت اپنی سکھیوں سے مخاطب ہو کر اپنے کرب کی عکاسی کرتی ہے۔ بارہ ماسوں میں موسم کے ذکر کے ساتھ اپنی باطنی کیفیتوں کے بیان کا احساس ملتا ہے۔ عورت اپنے درد و بے چینی اور کشمکش کو رومانی انداز میں پیش کرتی ہے۔ بارہ ماسوں میں مہینوں اور موسموں کی کیفیت بنیادی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ بارہ ماسے کے انھی نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

”تمام بارہ ماسوں کا مزاج ایک جیسا ہے اس لیے کہ ایک ہی جذبہ اپنے مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش ہوتا رہتا ہے۔ ہر موسم کی کیفیت عورت کے پورے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مختلف موسم گہرے احساس کے آہنگ کو چھیڑتے رہتے ہیں، اس قدر کہ ہر موسم کی رومانیت اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ عورت شیریں دیوانگی کا پیکر بن جاتی ہے۔“

(بارہ ماسہ کی جمالیات، ص10)

بارہ ماسے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عورت کے دل گداز، جدائی میں اس کے دل کی کسک، حیا کے ساتھ محبت کی بے خودی، اس کی وفا سپردگی اور اس کی حرماں نصیبی کی تفصیلات ملتی ہیں۔ بارہ ماسے میں عورت کی وفا شعاری اور مرد کی بے اعتنائی کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ اس میں پیار اور جلن کی داستان سنائی جاتی ہے۔ بارہ ماسے میں برہن کی تمام جسمانی، ذہنی اور عملی کیفیات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ غم زدہ برہن کے اس صدمۂ جاں کا اظہار سال کے گیارہ مہینے تک مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ جب بارہواں مہینہ بھی ختم ہونے کے قریب آتا ہے تو اس کے آنسوؤں کا تار ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا بچھڑا ہوا محبوب واپس آ جاتا ہے۔ اور آخر میں اس برہن کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ افضل کے اس شعر میں اس کیفیت کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

جو آیا ماہ پھاگن کیا کروں ری
سجن پردیس نت دکھ بھروں ری
ارے ظالم ترے پیاں پڑوں رے
دل و جان تجھ اوپر قرباں کروں رے
کہے برہن کہ پھاگن مانس آیا
سکھوں نے روپ رنگا رنگ بنایا

تمام بارہ ماسوں کا مزاج ایک جیسا ہے اس لیے کہ ایک ہی جذبہ اپنے مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش ہوتا رہتا ہے۔ ہر موسم کی کیفیت عورت کے پورے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مختلف موسم گہرے احساس کے آہنگ کو چھیڑتے رہتے ہیں، اس قدر کہ ہر موسم کی رومانیت اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ عورت شیریں دیوانگی کا پیکر بن جاتی ہے۔

ہندی کے بارہ مہینے بالترتیب چیت، بیساکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادو، کنوار، کارتک، اگہن، پوس، ماگھ اور پھاگن ہیں۔ ان بارہ مہینوں کو برہن شوہر کی جدائی میں رو رو کر گزارتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ گزارے لمحات کو یاد کر کر کے اسے واپس بلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ بارہ ماسوں میں فرقت کے احوال کا آغاز عام طور پر اساڑھ ماہ سے شروع ہوتا ہے۔ البتہ بعض شعرا کے یہاں اس کی ابتدا چیت سے اور کسی کے یہاں ساون سے بھی ہوئی ہے۔ اردو ادب میں زیادہ تر بارہ ماسے اساڑھ یا ساون کے مہینوں سے شروع کیے گئے ہیں۔

ہندی کے پہلے ماہ چیت میں چہار جانب جشن کا ماحول ہوتا ہے، خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ لیکن برہن داخلی طور پر تنہا محسوس کرتی ہے کیوں کہ اس مہینے میں محبوب اس کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ بیساکھ مہینے میں عورت اپنے محبوب سے گزارش کرتی ہے کہ تم واپس آ جاؤ تو زندگی میں رونق آ جائے۔ جیٹھ اور اساڑھ کے مہینے میں گرمی کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ محبوب کے آنے کی آس میں برہن تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اساڑھ کے بعد ساون کا مہینہ آتا ہے جس میں خوب بارش ہوتی ہے۔ عورت کا دل اپنی تمام تر نسوانی خصوصیات کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ مگر وہ اس موسم میں بھی محبوب کے ملنے کی امید میں تنہا رہتی ہے۔ بھادو ماہ میں بھی برہن کی کیفیت ویسی ہی رہتی ہے۔ اس موسم میں فطرت رقص کرتی دکھائی دیتی ہے مگر اس کے نینوں سے آنسو برستے ہیں۔ بجلی کی چمک اور کڑک سے اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے۔ کنوار کا مہینہ کم جان لیوا نہیں ہے۔ چاندنی راتیں اس کے لیے دکھ درد کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ کارتک میں دن چھوٹے ہوتے ہیں جب کہ راتیں لمبی ہوتی ہیں۔ یہ لمبی راتیں برہن کو ڈستی ہیں۔ اگہن اور پوس کی راتوں کا لطف محبوب کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ ماگھ مہینے میں برہن کو اپنے محبوب کے ملنے کی آس بڑھ جاتی ہے۔ پھاگن مہینے میں ہر طرف رنگوں کی برسات ہوتی ہے۔ بالآخر اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اس کا محبوب واپس آتا ہے۔

جس طرح شعری اصناف کی تکمیل کے لیے ہیئت اور بحر و وزن جیسے ترکیبی عناصر ناگزیر ہیں اسی طرح بارہ ماسے کو دلچسپ اور اثر انگیز بنانے کے لیے چند بنیادی لوازمات کی پابندی ضروری ہے۔ یہاں پر چند اہم لوازمات کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے:

الف: برہن کے داخلی جذبات اور اس کی باطنی کیفیات محض قیاس اور تخیل پر مبنی نہ ہوں۔

ب: سال کے بارہ مہینوں کا ذکر بالترتیب ہو۔ ہر ماہ کی موسمی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس میں ہونے والے تہواروں، میلوں کا بیان کیا جانا چاہیے۔

ج: قدرتی مناظر اور موسموں کا ذکر اس طور سے کیا جائے کہ اس کے ذریعے شعلۂ ہجر اور درد فراق میں شدت پیدا کی جا سکے۔

د: مناظر فطرت اور کوائف موسم کی تصویر کشی کرتے وقت ضرورت سے زیادہ تخیل اور مبالغے سے کام نہ لیا جائے

بلکہ ان کی مصوری اس انداز میں کرنی چاہیے کہ وہ فطری اور حقیقی معلوم ہوں۔

س: بارہ ماسے میں پُر اثر و عام فہم زبان و بیان کا استعمال کرنا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو شاعر کو چاہیے کہ وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرے جس سے برہن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہو سکے۔

ص: بارہ ماسہ لکھتے وقت شاعر کے لیے لازمی ہے کہ وہ الفاظ تکرار اور طول طویل کلام سے پرہیز کرے۔

ل: ہر ماہ کی جدائی اور بے قراری کا احوال اس ماہ کی قدرتی خصوصیات اور تہواروں کی رنگا رنگی اور مناظر کی مرقع نگاری کے ساتھ کی جانی چاہیے۔

اردو میں بارہ ماسہ نگاری کا آغاز تقریباً 17 ویں صدی کے ربع اوّل سے ہوتا ہے اور اب سے سو سال قبل اس صنف کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ لیکن بارہ ماسے نے اپنی اس مختصر سی مدّت میں اردو شاعری میں کئی اہم نمونے چھوڑے ہیں۔ اردو میں بارہ ماسہ لکھنے والوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ راقم الحروف نے اپنے اس مضمون میں اردو ادب میں دستیاب چند اہم بارہ ماسوں کا اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

بکٹ کہانی۔ افضل: افضل کی بکٹ کہانی اردو کا پہلا بارہ ماسہ ہے۔ اردو ادب میں بارہ ماسہ لکھنے کی روایت کا آغاز انھی کے سر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بکٹ کہانی کو اردو ادب کی تاریخ کا پہلا بارہ ماسہ تسلیم کیا گیا ہے۔ شمالی ہند کے اس شاعر کا نام محمد افضل تھا اور تخلص افضل۔ افضل کا شمار ہندی کے اہم شاعروں میں بھی ہوتا ہے۔ ہندی زبان میں انھوں نے کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس تخلیق کے آخری شعر میں خود کو افضل کے ساتھ گوپال بھی لکھا ہے۔

بیادِ دل رُبا خوش حال می باش
گہے افضل گہے گوپال می باش

بکٹ کہانی پہلی دفعہ 1625 میں شائع ہوئی جب کہ اس نادر شعری تخلیق کی طبع ثانی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی کے علمی و تحقیقی مجلّے ''قدیم اردو'' کے جلد اوّل میں 1965 میں کی۔ بکٹ کہانی بارہ ماسہ ہے جسے مثنوی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ پروفیسر نورالحسن نے بکٹ کہانی کے اشعار کی تعداد 321 بتائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پہلے 325 اشعار تھے۔ بعد میں چار اشعار نکال دیے گئے ہیں۔ یہ چار اشعار دو بار شامل ہو گئے تھے جس کی بنا پر اسے خارج کر دیا گیا۔

بکٹ کہانی بحر ہزج مسدس الآخر میں لکھی گئی ہے۔ اگر زبان و بیان کے تعلق سے بات کی جائے تو یہ بارہ ماسہ کسی ایک زبان اور بولی تک محدود نہیں بلکہ اس میں دہلی اور اس کے نواح میں بولی جانے والی کھڑی بولی، اودھی، مگدھی، بھوجپوری کی بولی ٹھولی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ بکٹ کہانی کو جدید اردو کا پہلا ادبی و لسانی نقش بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے بارہ ماسوں کی طرح بکٹ کہانی کے موضوعات میں برہن کے درد جدائی کی عکاسی ملتی ہے۔ بکٹ کہانی کا پہلا شعر۔

سنو سکھیوں! بکٹ میری کہانی
بھئی ہوں عشق کے غم سوں دِوانی

افضل کی بکٹ کہانی کا آغاز ساون کے مہینے سے ہوتا ہے اور اساڑھ کے مہینے پر ختم ہوتا ہے۔ پہلے ماہ کے آغاز سے پہلے 57 اشعار پر مشتمل عشق نامہ پیش کیا گیا ہے۔ ماہ ساون کا بیان دس اشعار پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے ماہ بھادو میں پندرہ اشعار ہیں۔ بکٹ کہانی میں ہر مہینے کے اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ بارہ ماسہ بکٹ کہانی کے اسلوب کی بات کی جائے تو یہ اپنے عہد کی ریختہ گوئی کی عکاسی کرتی ہے۔ بکٹ کہانی کے بہترین حصوں میں ماہ ساون، بھادو اور پھاگن ہیں جو خارجیت اور داخلیت کا ربط و آہنگ ہے۔ یہ بارہ ماسے کا اہم حصہ مانا جاتا ہے۔

بارہ ماسہ عزلت: بکٹ کہانی کے بعد اردو کے اہم بارہ ماسوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس شعری کلام کے تخلیق کار میر عبدالولی عزلت ہیں۔ عزلت گجرات کے رہنے والے تھے۔ عزلت اردو کے علاوہ فارسی اور ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور نرگن تخلص کرتے تھے۔ ان کے اردو دیوان میں بارہ ماسے کے علاوہ کہہ مکرنیاں، کبت دوہرے، چھند، سورٹھا، جیسے شعری کلام پائے جاتے ہیں۔ افضل کی بکٹ کہانی کے بعد اردو میں بارہ ماسہ عزلت کو زیادہ قدیم قرار دیا جا سکتا ہے۔ سبھی بارہ ماسوں کا موضوع ایک جیسا معلوم ہوتا ہے مگر شاعر کی فنکارانہ صلاحیت اور تحریری انداز سے یہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بارہ ماسہ عزلت کا آغاز اساڑھ کے مہینے سے ہوتا ہے۔

اساڑھ آیا ہے لے بادل کی فوجیں
کہ تیغیں برق کی ماریں ہیں موجیں

عزلت کے اس بارہ ماسے میں برہن کے درد و غم کی کیفیت کا بہت ہی تفصیلی بیان ملتا ہے۔ البتہ اس کے برعکس اس میں موسم کا حال مختصر ہے۔ عزلت نے ہر مہینے کے بیان کو چار سے پانچ اشعار میں قلم بند کیا ہے۔ اس بارہ ماسے میں پورا زور برہن کے بیان پر دیا گیا ہے جو اپنے معشوق کی یاد میں تڑپتی ہے۔ اس بارہ ماسے کی بحر وہی ہے جو افضل کی بکٹ کہانی کی ہے۔ اس میں جس طرح برہن کے ساتھ ساتھ مہینوں اور تہواروں کی عکاسی کی گئی ہے اس سے بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عزلت نے اپنی واردات عشق کی تصویر پیش کی ہے۔

بارہ ماسہ وحشت: میر بہادر علی وحشت نے بارہ ماسہ وحشت لکھ کر اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اردو کے قدیم بارہ ماسوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس بارہ ماسے کے متعلق معلومات سب سے پہلے میر حسن کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اس بارہ ماسے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ وحشت نے اس بارہ ماسے کو اردو کے پہلے بارہ ماسہ نگار افضل کی تقلید اور اپنے دوستوں کی فرمائش پر لکھا تھا۔

عزیز کچھ نہ پوچھو حال میرا
برا ہے ان دنوں احوال میرا

بارہ ماسہ وحشت کا فکری پس منظر، طرز تحریر اور انداز افضل کی بکٹ کہانی سے مختلف ہے۔ یہ بارہ ماسہ تو ہے ہی ساتھ ہی اس میں ساقی نامے کا عکس بھی نظر آتا ہے کیوں کہ اس میں شروع سے لے آخر تک ایک ساقی سے خطاب کا سلسلہ رہتا ہے۔ اس بارہ ماسے کی ایک خوبی اور ہے جو دوسرے بارہ ماسوں سے مختلف ہے وہ یہ ہے کہ اس میں برہن کے درد جدائی کو کسی نسوانی زبان کے بجائے مرد کی زبان سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر نے عورت کے احساسات و جذبات کے ساتھ موسمی کیفیت کی عکاسی بہت ہی پر اثر طریقے سے کی ہے۔ اس کی اپنی انھی خوبیوں کی وجہ سے اسے اردو بارہ ماسوں میں بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔

بارہ ماسہ ربانی: عبداللہ انصاری کے اس بارہ ماسے کو اردو کے اہم بارہ ماسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عبداللہ انصاری کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سے تھا۔ اس بارہ ماسے کا طبع اوّل احمدی علی گڑھ کی جانب سے 1323 ھ میں ہوا۔ یہ تصنیف 84 صفحات پر مشتمل ہے۔ آخری صفحے پر کوئی نشان یا شمار موجود نہیں ہے۔ اس کا سرورق سادہ ہے۔ اس بارہ ماسے کے شروع میں پہلے حمد باری تعالیٰ اور پھر نعت رسول پیش کی گئی ہے۔ حمد اور نعت رسول کے بعد مناجات عبداللہ انصاری کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔ تنویر احمد علوی نے ان کی تعداد 27 لکھی ہے جب کہ ان کی تصنیف میں 30 اشعار درج ہیں۔ دعائیہ کلمات کے بعد سبب تالیف لکھا ہے جو 224 اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی طرح نول کشور کی جانب سے شائع بارہ ماسہ صرف 12 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر

'بہ عون صناع مکیں ومکان وفضل خلاق زمیں وزماں سبحانہ تعالیٰ' درج ہے۔عبداللہ انصاری بارہ ماسے کی تالیف کے محرکات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"افضل اور مفتی الٰہی بخش کی بکٹ کہانی سے وہ گہرے متاثر ہوئے۔ اسی تاثر کے تحت انھوں نے یہ تالیف تصنیف کی ہے۔"

(اردو میں بارہ ماسہ مطالعہ اور متن ص 136)

دوسرے بارہ ماسوں کی طرح اس میں بھی درد وغم کی تمام کیفیات موجود ہیں۔بارہ ماسے کی ابتدا اساڑھ ماہ سے ہوتی ہے۔اس میں ہر ماہ کے اشعار کی تعداد مختلف ہے۔اس بارہ ماسے کا آغاز خواب دیکھنے کے ذکر سے ہوتا ہے جس میں داستانی قصوں اور روایتی کہانیوں کے انداز پر کسی انجان آدمی کو دیکھ کر مجازی عشق میں مبتلا ہو جانے کی بات کی گئی ہے۔اس بارہ ماسے کی زبان میں اردو کے کھرے پن کی عکاسی موجود ہے۔اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کے علاوہ ہندی الفاظ کو ایک ہندستانی عورت کے روایتی کردار میں پیش کیا گیا ہے جو اس بارہ ماسے کی اہم خصوصیات میں شامل ہے۔

بارہ ماسہ بکٹ کہانی از عبداللہ انصاری: اس بارہ ماسے کا ذکر سب سے پہلے مسعود حسین خاں نے کیا ہے۔انھوں نے لکھا کہ عبداللہ انصاری نے نہ صرف افضل کی بکٹ کہانی کی تقلید کی ہے بلکہ انھوں نے اسی عنوان سے بکٹ کہانی بھی لکھی ہے۔انھوں نے اس کا زمانہ تصنیف 1823 کے قریب درج کیا ہے۔اس بارہ ماسے کی بحر وہی ہے جو افضل کی بکٹ کہانی کی ہے۔

بارہ ماسہ بکٹ کہانی از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی: بکٹ کہانی کا نام آتے ہی افضل کے بارہ ماسہ کی طرف ذہن جاتا ہے لیکن تنویر احمد علوی نے اپنی تصنیف میں اس بارہ ماسے کا تذکرہ کیا ہے۔مفتی صاحب نے اپنی اس تصنیف کی تخلیق افضل کے بارہ ماسے کو سامنے رکھ کر کی جس کا برملا اظہار انھوں نے کیا ہے۔

سنی ہوگی بکٹ تم نے کہانی
سب اوس کے خامہ کی آتش فشانی
ولیکن میں جو دیکھا اوس کو سارا
طبیعت نے مری اک جوش مارا
یہ آیا دل میں کہیے اک کہانی
بیاں ہو جس میں سوزِ دل نہانی

زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے دونوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔مگر ایک بنیادی فرق ضرور نظر آتا ہے۔افضل کی بکٹ کہانی میں حمد ونعت کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جب کہ مفتی صاحب نے اپنی بکٹ کہانی میں ابتدا میں پہلے حمد اور پھر نعت تحریر کی ہے۔ایک دوسری بات یہ کہ اس میں ہریانوی اور برج بھاشا سے زیادہ کھڑی بولی کا استعمال کیا گیا ہے۔اس بارہ ماسے کی مدد سے کھڑی بولی کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے جو اردو کا اصل روپ تسلیم کی جاتی ہے۔

بارہ ماسہ مرد بیوگ: اس بارہ ماسے کے مصنف کا نام لالہ ممن لعل ہے۔اس کی اشاعت گیان پریس سے 1895 میں ہوئی۔ممن لعل کا تعلق مراٹھا علاقے سے تھا۔راقم الحروف کی معلومات میں یہ اب تک کے بارہ ماسوں میں سب سے کم اشعار پر مشتمل ہے۔یہ کتاب کل آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اس بارہ ماسے کا آغاز ہندی کے چوتھے مہینے اساڑھ سے شروع ہوتا ہے اور جیٹھ کے مہینے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ہر ماہ کے بیان کے پہلے ایک دوہا اور آخر میں چوپائی شامل ہے۔اس بارہ ماسے میں برہن کے جذبات و احساسات کے ساتھ موسمی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔لالہ ممن لعل کا تعلق چوں کہ مراٹھا علاقے سے تھا اس لیے اس میں مراٹھا علاقے کی بولی کے ملے جلے اثرات پائے جاتے ہیں۔اس بارہ ماسے کے مطالعے سے اس علاقے کی تہذیب و ثقافت اور بولی ٹھولی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بارہ ماسہ نیہہ: اس بارہ ماسے کے تخلیق کار مولوی حفظ اللہ قادری ہیں۔مولوی صاحب کا شمار اپنے عہد کے اہم شعرا میں کیا جاتا تھا۔وہ نہ صرف اردو کے شاعر تھے بلکہ فارسی اور اودھی زبان کے شعرا میں بھی شمار کیے جاتے تھے۔وہ ان تینوں زبانوں میں اپنا تخلص الگ الگ استعمال کرتے تھے۔اردو شاعری میں ان کا تخلص بندہ، فارسی میں حفیظ اور اودھی میں نیہہ تھا۔مولوی صاحب کی پیدائش کی کوئی مستند تاریخ تو نہیں ملتی، البتہ تنویر احمد علوی نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ وہ پچاس سال کی عمر میں 1860 میں انتقال کر گئے۔یہ بارہ ماسہ کب لکھا گیا اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی مگر ان کی تاریخ انتقال سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قدیم بارہ ماسوں کا ایک اہم نمونہ ہے۔اس بارہ ماسے کی ابتدا میں ہر ماہ کے نمبر درج کیے گئے ہیں اور اسی نسبت سے ابتدائیہ اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ اس بارہ ماسے کی ابتدا اساڑھ مہینے کے بیان سے ہوتی ہے۔

آیا ماس اساڑھ کا پیتم ناہیں پاس
گھٹا گھٹائے ویت ہے سوپی درش کی ہیں ناہیں

بارہ ماسہ نیہہ کی فنی خوبیوں کا ذکر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ہر ماہ کے بیان کے لیے اشعار کی تعداد متعین نہیں کی گئی ہیں۔یہ ایک ایسا بارہ ماسہ ہے جس کی شروعات کسی تمہید کے بغیر کی گئی ہے۔اس بارہ ماسے کو سید نذر الحسن قادری نے مرتب کیا ہے۔اس کی اشاعت مکتبہ قادری رام پور سے 1975 میں ہوئی۔

بارہ ماسہ سندر کلی: اس کا شمار اردو کے اہم بارہ ماسوں میں ہوتا ہے۔یہ بارہ ماسہ راج رتن کنور اور سندر کلی کی داستان پر مبنی ہے۔ابتدا میں حمد باری تعالیٰ اور اس کے بعد نعت شریف پیش کی گئی ہے۔اس بارہ ماسے کا آغاز اساڑھ مہینے سے ہوتا ہے۔بارہ ماسہ سندر کلی کو ایک ہی زمین میں پیش کیا گیا ہے لیکن اشعار کی تعداد مختلف ہے۔اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر ماہ کا بیان ہندی دوہرے سے شروع ہوتا ہے اور اختتام فارسی کے شعر پر ہوتا ہے۔اس بارہ ماسے میں ہر ماہ کا بیان بے ترتیب ہے۔ہر مہینے کے بیان سے پہلے باقاعدہ اس ماہ کا عنوان درج نہیں کیا گیا ہے بلکہ دوہرے میں ہی اس مہینے کا نام پیش کر دیا گیا ہے۔مثلاً

اساڑھ آیا نپٹ گرمی پڑے ری
نپٹ گرمی ستی دیہی جرے ری

اس بارہ ماسے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہدہد کو بطور پیغام لانے لے جانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس میں بارہ مہینوں کے بیان کے بعد آخر میں تاریخ اسلام کا ذکر کیا گیا ہے خصوصاً حضرت خضر کا بیان شامل ہے۔البتہ اس بارہ ماسے میں قصے پن کی کمی محسوس کی جا سکتی ہے۔مگر ہدہد کا کردار انفرادیت کا حامل ہے۔سندر کلی کو اس کی شعری خوبیوں کی وجہ سے اردو کے معروف بارہ ماسوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بارہ ماسہ کنول دی: اس بارہ ماسے کے مصنف بہار کے صوفی بزرگ حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ہیں۔یہ شعری تخلیق ان کے مجموعہ کلام گوہر جوہری میں داستان کے عنوان سے شامل ہے۔تنویر احمد علوی نے اپنی تصنیف میں اس بارہ ماسے کو اس کی ہیروئن کی مناسبت سے کنول دی لکھا ہے۔دوسرے بارہ ماسوں کی طرح یہ بارہ ماسہ بھی اساڑھ سے شروع ہوتا ہے اور جیٹھ کے مہینے پر ختم ہوتا ہے۔اس میں بھی برہن کے ورنن کے ساتھ ساتھ موسمی کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ماہ اساڑھ کا بیان شروع کرنے سے پہلے تمہیدی اشعار پیش کیے گئے ہیں جن کی تعداد 34 ہے۔پہلا مہینہ اساڑھ کا بیان 21 اشعار پر مشتمل ہے مگر اساڑھ ماہ کا عنوان درج نہیں کیا گیا ہے۔جوہری نے اپنی اس شعری تخلیق میں برہن کے درد و غم اور احساسات و جذبات کو بھر پور انداز میں پیش کیا ہے۔مگر اس کے برعکس انھوں نے آنے والے مہینوں میں موسمی کیفیات اور میلوں ٹھیلوں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے۔زبان و بیان کے لحاظ سے یہ بارہ ماسہ توجہ طلب

ہے۔اس بارہ ماسے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر ماہ کے بیان کے ساتھ ساتھ ایک پنچھی کو قاصد کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ہر ماہ میں الگ الگ پنچھیوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً اساڑھ میں بھنگم کو قاصد بنایا گیا ہے، جب کہ ساون میں کوکلا، بھادو میں کوئل اور ماگھ میں کبوتر کو قاصد کے طور پر استعمال کیا ہے۔اسے اردو کے اہم بارہ ماسوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

بارہ ماسہ نجیب: اس بارہ ماسے کے مصنف کا نام میاں نجیب ہے۔وہ اپنے عہد کے معروف شاعروں میں شمار کیے جاتے

اردو ادب میں بارہ ماسہ لکھنے والوں کی فہرست مختصر ہے۔ درج بالا بارہ ماسوں کا اختصار سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے اہم بارہ ماسوں کے نقوش ملتے ہیں ان میں 'بارہ ماسہ دین محمد سنگھ'، 'بارہ ماسہ سید محمد یاسین احمد'، 'بارہ ماسہ خیر شاہ' اور 'بارہ ماسہ سادھن' اہمیت کے حامل ہیں۔

تھے۔اس بارہ ماسے کا قلمی نسخہ ''ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، نذر باغ،ٹونک، راجستھان'' میں محفوظ ہے۔اس کا آغاز بھی اردو کے دوسرے اہم بارہ ماسوں کی طرح ماہ اساڑھ سے ہوتا ہے جس کا عنوان 'ساون کا آیا مہینۂ' کے نام سے درج ہے۔اس بارہ ماسے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ مصنف نے ہر ماہ سے متعلق اشعار کے آخر میں اپنا تخلص پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر ایک شعر پیش خدمت ہے۔

نجیب اس طرح سے اساڑھ بیتا
نجا تو کیوں نہ آیا میرا میتا

اس بارہ ماسے میں بھی ایک فراق زدہ عورت اپنے محبوب کی یاد میں برہ ورہن کرتی ہے کہ اس کا شوہر واپس آجائے۔میاں نجیب نے جتنی دلچسپی سے برہن کے درد جدائی کی عکاسی کی ہے اتنی موسمی کیفیات کی مصوری نہیں کی ہے۔اگر دیکھا جائے تو اس بارہ ماسے کا نسبتاً یہی پہلو کمزور ہے۔مصنف نے اس بارہ ماسے کی تخلیق کے وقت لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہادوغیرہ جیسی عشقیہ داستانوں کے فراق و درد کو ذہن میں رکھا ہے۔اس کے علاوہ اردو ادب کا یہ واحد بارہ ماسہ ہے جس میں راجستھان کی مقامی بولیوں کو شامل کیا گیا ہے۔اس بارہ ماسے کی فضا ہندستانی ہے جس میں لوک گیتوں کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ شمالی ہند کے بارہ ماسوں میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

بارہ ماسہ وہاب: اس کے مصنف کا نام وہاب ہے جن کا تعلق بھوجپوری علاقے سے تھا۔وہ علاقائی بولی اور لوک گیتوں سے بخوبی واقف تھے۔اس بارہ ماسے کا آغاز اساڑھ مہینے سے ہوتا ہے۔اس کی ابتدا حمد ونعت کے بغیر سیدھے ماہ اساڑھ سے ہوتی ہے۔ اس میں فراق زدہ برہن کے جذبات واحساسات کی عکاسی منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی موسمی کیفیات کی منظر کشی نمایاں ہے۔اس کے علاوہ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اس علاقے کی ریت ورواج کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بارہ ماسہ اردو شاعری کے اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جسے اردو لوک ساہتیہ کی روایت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بارہ ماسہ رنج: اس بارہ ماسے کے مصنف کا نام کیا ہے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، البتہ ان کا تخلص رنج تھا۔اس بارہ ماسے کی شروعات حمد ونعت سے ہوتی ہے۔اس کے بعد ماہ اساڑھ کے درد وغم کی کیفیت کا بیان ملتا ہے۔ کچھ دوسرے بارہ ماسوں کے مصنفین کی طرح رنج کو بھی موسمی منظر نامے پیش کرنے میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی انھیں ایک برہن کے جذبات کی عکاسی کرنے میں تھی۔موضوعات سبھی بارہ ماسوں کے ایک جیسے ہیں لیکن ہر ایک کا پیش کرنے کا انداز مختلف ہے۔ اس میں ایک لڑکی جس کی شادی نوعمری میں کر دی جاتی ہے لیکن جب جوان ہوتی ہے تو اس کا پیا پردیس میں ہوتا ہے۔ اسی کی تلاش میں وہ 'اک تارا' لے کر نکل پڑتی ہے۔اگر زبان و بیان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو کے نئے پن سے بہت قریب ہے۔رنج کو ہندی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس کلام میں ہندی اور فارسی الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ انھی تمام خوبیوں کی وجہ سے بارہ ماسہ رنج کو اردو کی بہترین ادبی کاوشوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

بارہ ماسہ مقصود: اس بارہ ماسے کا تعارف مصحفی نے اپنے تذکرے 'تذکرۂ ہندی' میں کیا ہے جس میں انھوں نے مقصود کو ایک بازاری شاعر لکھا ہے۔ مصحفی کے علاوہ اردو ادب میں مقصود کا ذکر بہت کم شعرا نے کیا ہے۔مقصود نے اپنا یہ بارہ ماسہ اپنے دوستوں کی فرمائش پر لکھا ہے۔مقصود کا یہ بارہ ماسہ برہن کی جذبات نگاری، معاشرتی حقیقت پسندی اور موسم کی منظر کشی کے لحاظ سے ایک بہترین شعری کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ اس میں عام فہم زبان و بیان کا استعمال کیا گیا ہے۔اگر بارہ ماسے کے ادبی محاسن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔

اردو ادب میں بارہ ماسہ لکھنے والوں کی فہرست مختصر ہے۔ درج بالا بارہ ماسوں کا اختصار سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے اہم بارہ ماسوں کے نقوش ملتے ہیں ان میں 'بارہ ماسہ دین محمد سنگھ'، 'بارہ ماسہ سید محمد یاسین احمد'، 'بارہ ماسہ خیر شاہ' اور 'بارہ ماسہ سادھن' اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ کچھ ایسے بارہ ماسوں کا پتا چلتا ہے جن کے متن دستیاب نہیں ہیں۔ان میں بارہ ماسہ اکرم رہتکی، بارہ ماسہ ریحان اہم ہیں۔اردو محققین کی تحقیقی کاوشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے بارہ ماسے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کی زبان و بیان اردو کے بارہ ماسوں سے قدرے مختلف ہے۔ ان میں بارہ ماسہ خیرا شاہ، بارہ ماسہ عاشق رسول، بارہ ماسہ الٰہی بخش، بارہ ماسہ قاصد، بارہ ماسہ رام چندر، بارہ ماسہ بینی مادھو اور بارہ ماسہ ظالم سنگھ اہم ہیں۔عہد حاضر میں اگر دیکھا جائے تو چند بارہ ماسے ہی تحریر کیے گئے ہیں۔اردو میں عوامی شاعری کی جو روایت رہی، ان میں بارہ ماسے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس روایت کے مطالعے سے علاقائی تہذیبوں، روایتوں اور مقامی بولیوں سے سماجی رشتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔انھی تمام خوبیوں کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ترویج وترقی میں بارہ ماسے کا اہم کردار رہا ہے مگر عہد حاضر میں اس صنف کی طرف بہت کم توجہ دی گئی جو ایک لمحہ فکریہ ہے۔

کتابیات

1 اردو میں بارہ ماسہ کی روایت: مطالعہ ومتن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی نئی دہلی، 1988
2 شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسہ کی روایت: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، نئی دہلی، 2005
3 تنویر احمد علوی کا جہانِ معانی جلد اول: ڈاکٹر ثمر جہاں، نئی دہلی 2017
4 بارہ ماسے کی جمالیات: شکیل الرحمٰن، نئی دہلی، 2012
5 متاع بارہ ماسہ: الطاف حسین ندوی، علی گڑھ، 1979
6 بارہ ماسہ جیہہ: سید نذر الحسن قادری، رامپور یوپی، 1974
7 بارہ ماسہ مرد بیوگ: لالہ من لعل، نئی دہلی، 1895
8 افضل کا بارہ ماسہ جدید تحقیق کی روشنی میں: نظامی پریس لکھنؤ، لکھنؤ، 1989
9 بارہ ماسہ سندر کلی

■

Dr. Imran Ahmad
Lecturer,Dstrict Institute of Education and Training Ikauna, Shrawasti
District Shrawasti-271845
Mob-9652559916,9511435693
Email-imranhcu13@gmail.com

طارق جمیلی کی نظم 'پورنیہ' کا تجزیاتی مطالعہ

محمد مرغوب

فنکار یا تخلیق کار کافی حساس ہوتا ہے۔ کسی بھی واقعے سے متاثر ہو کر اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے تو وہ فن پارے کی شکل میں منظر عام پر آتا ہے۔ اور قاری اسے پڑھ کر لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ طارق جمیلی نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے خیالات اور اپنے احساسات کو نظم 'پورنیہ' میں پیش کر کے اردو ادب میں کارہائے نماں انجام دیا ہے' رہ کے وادی میں ہمالہ پہ نظر رکھتا ہے' مصرع کو پڑھ کر ان کی فکری وفنی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کے معیاری شاعر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے اس حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانش لکھتے ہیں:

''اس نظم میں شاعر کی باریک بینی اور نکتہ رسی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ نظم پورنیہ کی منظوم تاریخ بھی ہے اور ان کی محاکاتی شاعری کا نمونہ بھی، جہاں فطرت کے آغوش میں پھیلے ہوئے رنگ مناظر کا شاعر نے دلکش اور شگفتہ نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔''

(بحوالہ مضمون پورنیہ اور طارق جمیلی: انتخاب پورنیہ ص 40)

بیسویں صدی میں پورنیہ (جو سیما نچل کے نام سے جانا جاتا ہے) کو ایسا مخلص ادیب و شاعر ملا جس نے اس کی اصل تصویر کھینچ کر ملک و بیرون ملک میں شہرت دوام عطا کرنے کا موقع دیا۔

طارق جمیلی نے پورنیہ کو تاریخ کے اوراق سے نکال کر محاکاتی شاعری کا نمونہ بنا دیا۔ جس کے آغوش میں فطرت کی حسین منظر کشی کی ہے۔ شاہ اکرام الحق اکرام نظم 'پورنیہ' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جناب طارق جمیلی نے پورنیہ کے بکھرے ہوئے حسن و جمال سے بھرپور مناظر کو سمیٹ کر اس سلیقے سے الفاظ و ترکیبات کا جامہ پہنایا ہے کہ پورنیہ ایک سپنوں کا دیش نظر آنے لگتا ہے ان کے حساس دل ان مناظر کے پیچھے قدرت کی خاموش موسیقی کے سرگم سنائی دیتے ہیں۔ یہ لوہے لکڑ کی تہذیب بھلے ہی پورنیہ کی شکل آنے والے زمانے میں بگاڑ کر رکھ دے لیکن پورنیہ کا دلکش چہرہ طارق جمیلی کی نظم میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔'' (بحوالہ انتخاب پورنیہ، ص 40)

طارق جمیلی نے نظم 'پورنیہ' میں نہایت صاف و سادہ الفاظ استعمال کر کے ایک رواں دواں شاعری کا دریا بہا دیا ہے۔ جس کے سبب ان کی نظم میں فکر وفن کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

بتا کس نے تجھے اس نام سے پہلے پکارا تھا
نگر کے روپ میں مجھ کو سنا کس نے سنوارا تھا
گھنے جنگل درختوں پیڑ پودوں کی قطاروں نے
کہ تالابوں میں پورنیوں کے پھولوں کی بہاروں نے
بتا کس نے تری گردن میں ڈالی پیار سے بانہیں
لگائی کس نے ماتھے پر ترے اس نام کی بندی
بسایا تجھ کو پوروں نے سجایا سین نے تجھ کو

اس طرح استفہامیہ انداز بیاں نے نظم کی دلکشی کو اور بڑھا دیا۔ طارق جمیلی قاری کو آنے والے مصرعے میں حقیقت سے روشناس بھی کراتے ہیں کہ پورنیہ شہر ہے وہاں کے گھنے جنگلوں کی وجہ سے یوں موسوم ہوا اس کی اصل 'پورا ارینہ' ہے جس کے معنی جنگل ہی جنگل ہوتے ہیں اور پورین لفظ سے کمل کے پھول کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس طرح منظر کشی کا عمدہ نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ طارق جمیلی نے تاریخ کی نشاندہی کرتے ہوئے راجہ پورن کا ذکر کیا ہے جس نے پورنیہ کو اسی سلطنت کی راجدھانی بنایا تھا اور بنگال کے آخری راجہ لکشمن رائے سین نے آباد کیا اس طرح سات مصرعوں سے قاری کو سب کچھ پتہ چل جاتا ہے جس کی تلاش ایک مورخ کو ہمیشہ رہتی ہے یہ سماجی علوم سے طارق جمیلی کی دلچسپی کا بھی پتہ دیتی ہے شمس جلیلی (پورنیہ) طارق جمیلی کی نظم 'پورنیہ' پر گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جناب پروفیسر طارق جمیلی نے اپنی نظم پورنیہ میں ضلع پورنیہ اور دیار پورنیہ کے جغرافیائی ماحول اور مناظر قدرت کی منظر کشی تو کی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ دینی، اخلاقی، سماجی حالات اور کیفیات کا بھی نہایت ہی دلکش پیرائے میں اظہار کیا ہے۔''

(بحوالہ: مضمون مشہور عالم نظم 'پورنیہ' پر کچھ، از انتخاب پورنیہ ص 6)

طارق کی نظم 'پورنیہ' میں کیفیت اور فضا بندی کا انداز نرالا ہے۔ وہ ایک حساس اور باریک بیں شاعر اور حقیقت شناس نظر کے مالک ہیں۔ پورنیہ کی پرسکون رومانی فضا، شبنمی ٹھنڈک، شعلہ ابراہیم کی سی نرمی، سیمل اور کنول کی دلفریب رنگینیاں ان کی شاعری کو ساز دل کا نغمہ بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ترہت سے پورنیہ کا سفر کے اجنبی ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ چند اشعار بطور خاص ملاحظہ

اجنبی شہر کا میں اجنبی شہری ٹھہرا
اجنبی قطروں سے بنا ہے سمندر گہرا
ایک برسات میں پتھر پہ دوب اگتی ہے
کل جہاں پر تھی ندی آج وہاں بستی ہے
دیکھتے دیکھتے ہی شہر میں کھنڈر ڈھلتے
اتنے عرصے میں تو دشمن بھی ہیں اپنے بنتے
آ بھری بزم میں سینے سے لگالوں تجھ کو
تو مجھے اپنا کہے، میں کہوں اپنا تجھ کو

نظم کے مطالعے سے یہاں کی ندیاں، برسات، پھونس کے مکانات، یہاں کی آتشزدگی، شادی بیاہ کی رسمیں، سودخور مہاجن، پچھوا اور پوربی ہوائیں سب کے سب قاری کو مسحور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مشتاق احمد نوری اپنے مضمون طارق جمیلی اور نظم 'پورنیہ' پر اظہار خیال کرتے ہیں:

''پورنیہ کو جتنا طارق جمیلی نے سمجھا، محسوس کیا اور دل کی گہرائیوں میں اتارا، اتنا شاید پورنیہ والوں نے بھی

نہیں سمجھا۔ پورنیہ کی عظمت کے اگر کسی نے گیت گائے، اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اس کے موسم اس کے ریت ورواج اس کی فصلوں اور اس کی محبتوں کو گیت کے مالے میں پیرو یا وہ صرف طارق جمیلی ہیں۔ اتنا ڈوب کر اتنی طویل نظم لکھنا سب کے بس کا روگ نہیں۔'' (بحوالہ انتخاب پورنیہ ص 15)

نظم (پورنیہ) کو اگر ایک جملے میں لکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر دنیا میں منظوم تاریخ نویسی کے مقام کا تعین کیا جائے گا تو ایک نام نظم 'پورنیہ' کا بھی ہوگا۔

طارق کی نظم 'پورنیہ' میں کیفیت اور فضا بندی کا انداز نرالا ہے۔ وہ ایک حساس اور باریک بین شاعر اور حقیقت شناس نظر کے مالک ہیں۔ پورنیہ کی پرسکون رومانی فضا، شبنمی ٹھنڈک، شعلہ ابراہیم کی سی نرمی، سیمل اور کنول کی دلفریب رنگینیاں ان کی شاعری کو ساز دل کا نغمہ بنا دیتی ہے۔

یہ نظم صرف خارجی شواہد کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی بلکہ اس میں سماجی وتہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے طویل عرصے تک اس کا محاسبہ کیا ہے اور مختلف تجربات ومشاہدات سے دوچار ہوکر منظوم کیا ہے۔

نظم 'پورنیہ' ایک طویل نظم ہے جس میں تقریباً ایک سو دس (110) اشعار ہیں اور بحروں کا بدلنا بھی اس نظم کو منفرد رنگ وروپ دیتا ہے۔ اس میں نغمگی بھی ہے اور ترنم بھی، آشفتہ بیانی بھی ہے اور تاریخ دانی بھی، قدرتی مناظر بھی ہیں۔ کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم کو پڑھنے کے بعد قاری پورنیہ کی سیر کو جائے اور وہاں وہ سب نہ ملے جس کا ذکر اس نظم میں پورے زور شور سے کیا گیا ہے، لیکن شاعر کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ جب خوبیاں بیان کرتا ہے تو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ اور اس معاملے میں طارق جمیلی کو معراج حاصل ہے ان کی شاعری الہامی شاعری کے زمرے میں چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نظم پورنیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں ''پروفیسر طارق جمیلی کے شعری سرمائے کا سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے مناظر وماحول کے متنوع پہلو پیش کیے ہیں کہیں گیت کے انداز بیان، کہیں فطرت کے پرکشش مناظر کی صورت میں، کہیں اپنے مسکن ودیار پورنیہ کی نیم قصباتی فضا کی پینٹنگ اتارتے ہیں غرض طارق جمیلی نے جگہ جگہ فطرت نگاری اور منظر کشی کے سلسلے میں اپنی بہترین ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔'' (بحوالہ انتخاب پورنیہ، ص 25)

طارق جمیلی نے نظم پورنیہ لکھ کر پورنیہ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اردو ادب میں شہر پورنیہ کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اگر چہ عہد قدیم سے شہروں پر نظمیں لکھی جا رہی ہیں، غالب، صفی لکھنوی، اور حرمت الا اکرام ایسے نام ہیں جنھوں نے مختلف شہروں پر نظمیں لکھ کر اس عہد کی تصویر کشی کی ہے، دلی، لکھنؤ، ممبئی، دکن، عظیم آباد اور بنارس جیسے بڑے شہروں پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں پورنیہ نظم کی معنوی خوبیوں کے پیش نظر شمس جمیلی نے بہت فکر انگیز جملے تحریر کیے ہیں:

''پورنیہ (پورین) کنول کا دیش رہا ہے یہاں کے شعر وادب کے دیش میں گل بوٹے کھلانا طارق جمیلی کا حصہ ہے جناب طارق نے اس نظم کو تخلیق کر کے پورنیہ کے تمام قرضے مع سود بیباق ادا کر دیا ہے، یہ ادبی شہہ پارہ زعفران زار کشمیر ہے جو جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی۔'' (ایضاً ص 40)

طارق صاحب کی علمی وادبی اور فنکارانہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا، میتھلا یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول ایوارڈ 1984 کلا ساہتیہ پنچ یوم، پریم چند ایوارڈ 1994 گرو نانک جینتی ایوارڈ 2005 بہار اردو اکادمی سہیل عظیم آبادی ایوارڈ 2013 بہار اردو اکادمی سہیل عظیم آبادی ایوارڈ 2015 اور شان سیمانچل ایوارڈ 2019 طارق جمیلی کی ادبی زندگی 1952 سے شروع ہو کر زندگی کے آخری ایام تک رہی۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے مثلاً:

آگ اور پانی (ڈرامہ) (1967)، شکست کی آواز (ڈرامہ)، (1980)، نظم پورنیہ (1985)، آزاد شرارے (انشائیے) (1987)، سورہ یٰسین 2007، قلم جاگ رہا ہے (انشائیے) (2007)، جذب دروں (شاعری) (2009)، عرش گیاوی حیات وخدمات (تحقیق) (2009)، نقش جمیل۔ اور مقالات طارق جمیلی (2021)

احسان قاسمی پروفیسر طارق جمیلی کے حوالے سے ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''طارق جمیلی صاحب اردو ادب اور گنگا جمنی تہذیب کا ایک روشن منارہ اور شاید ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی آخری نشانی بھی، ان سے مل کر جو حاصل کرنا چاہتے ہو کرلو یہ متانت، یہ سنجیدگی، یہ وقار، یہ خلوص، یہ شفقت، یہ محبت، یہ ایمانداری، یہ صبر، یہ سکون، یہ تحمل، یہ بردباری، یہ قناعت، یہ گہرائی وگیرائی، یہ ادب نوازی، یہ منکسر المزاجی، یہ علم بانٹنے کی چاہت... زندگی میں لوگ بہت سارے ملیں گے، مگر ایسا استاد پھر نصیب نہ ہوگا بے شک غزل گو ملیں گے، نظم نگار ملیں گے، افسانہ نگار ملیں گے، انشا پرداز ملیں گے، ڈرامہ نگار ملیں گے، محقق اور تنقید نگار ملیں گے مگر یہ سارے اوصاف کسی ایک مرکز پر جمع ہو جائیں ایسا کوئی شخص نہ ملے گا۔'' (مقالات طارق جمیلی، ص 204)

طارق جمیلی کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں جو مقام ملنا چاہیے وہ اسے میسر نہیں ہوا یہی نہیں ناقدین اور قلم کاروں نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جس کے وہ حقدار تھے طارق جمیلی نام ونمود اور جھوٹی تعریف کے قائل بھی نہیں تھے وہ ادب کے ایک سپاہی کی طرح اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ عصر حاضر کے ناقد حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''پروفیسر طارق جمیلی کا شمار ایسے افراد میں کیا جا سکتا ہے جن کے حصے کی شہرت دوسروں کو مل گئی اور غیر معمولی استعداد اور اہلیت کے باوجود اردو معاصر منظر نامہ پر ان کا نام ثبت نہ ہو سکا۔ طارق جمیلی کو اس کا گلہ نہیں مگر دکھ اس بات کا ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں جب دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے تو چھوٹے شہروں کی بنیاد پر تنقید اور تاریخ میں اس طرح کی المیاتی صورت حال کیوں کر پیدا ہوئی ہے۔'' (ایضاً، ص 192)

یہ قدرتی مناظر کی دھوپ چھاؤں اور ان کی مترنم بحروں نے نظم کی چاندنی کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور الفاظ کی نشست و برخاست نے نظم کو پرلطف بنا دیا ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے مناظر وماحول کے متنوع پہلو پیش کیے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ طارق جمیلی نے نہ صرف پورنیہ سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کی پوری تاریخ اور اس کے تمام حسن وجمال کو اس نظم میں سمیٹ لیا ہے۔ الغرض طارق جمیلی کی طویل نظم 'پورنیہ' اپنے خوبصورت انداز بیاں اور فطرت نگاری کے لیے ممتاز ہے۔ جو ان کے ہم عصروں کو نصیب نہیں ہے۔ آخر میں میں اپنی بات طارق جمیلی کی اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

اک چہرہ ہوں میں بھی مجھے اس کی نہ خبر تھی
آئینہ دیا جس نے میرے ہاتھ وہ تم ہو
چھن جائے جو یادوں کا خزانہ تو کرم ہو
لیکن نہیں بھولوں گا جو اک بات وہ تم ہو

■

Md. Marghoob Alam
Asst Prof., Dept of Urdu
Ram Krishna College
Madhubani - 847211 (Bihar)
Email: marghoobmd6@gmail.com

تحریکِ آزادی میں ریاستِ رامپور کا کردار

رضوان لطیف خاں

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ سابقہ ریاست رامپور (حالیہ ضلع رامپور اتر پردیش) کا 1857 کی جدوجہدِ آزادی میں منفی کردار رہا۔ کسی حد تک یہ خیال درست بھی ہے لیکن اس کا اطلاق اہالیانِ رامپور کی اکثریت پر نہیں کیا جاسکتا، البتہ والیِ رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم انگریزوں کے ہم نوا و معاون تھے۔ مختلف تاریخی ماخذ اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت کرتے ہیں کہ بے شک والیِ رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم نے انگریزوں کی ہر ممکن مدد کی اور اسی صلے میں 1857 کا انقلاب ختم ہونے کے بعد ان کو انگریزی سرکار سے مراعات اور خلعت وخطابات بھی عطا ہوئے لیکن نواب کے زیر سایہ رہنے والے عوامی طبقے میں بیشتر لوگ وہ تھے جنھوں نے انگریزوں کی مدد کرنے پر نواب کو دو بدو برا بھلا بھی کہا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عوام الناس کے اعمال وافعال وقت کے غبار میں گم ہوکر ناپید ہوجاتے ہیں جب کہ مشہور لوگوں کی سرگذشتِ اعمال تاریخ کا حصہ بنتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رامپور کے حریت پسندوں کو نواب رامپور کی انگریز نوازی کھا گئی، حالانکہ رامپور وہی سرزمین ہے جہاں حریت پسندوں نے 1857 سے بھی 60 سال قبل بلکہ سلطان ٹیپو شہید سے بھی تین چار سال قبل انگریزوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی تھی جس میں لاتعداد انگریز سپاہی اور چونتیس بڑے افسران مارے گئے تھے۔ اتنا بڑا نقصان اُس دور کی کسی جنگ میں انگریزوں کا نہیں ہوا تھا لیکن حریت پسندانِ رامپور یہ جنگ ہار گئے تھے البتہ ان کی بہادری کے کارنامے، جذبۂ حریت اور انگریزوں سے نفرت کا جذبہ تاریخ کے صفحات میں اس طرح محفوظ ہوگیا کہ خود ابوطالب اصفہانی لندنی جیسے انگریز نواز تاریخ نویس نے بھی ان حریت پسندوں کے جوشِ شجاعت اور جذبۂ حریت کا اعتراف کیا ہے۔ تاریخ میں یہ جنگ 'جنگِ نجوخانی' یا 'جنگِ دوجوڑہ' کے نام سے معروف ہے۔

رامپور میں روہیلوں کی اکثریت تھی۔ یہ وہی روہیلے تھے جو سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں افغانستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور شمالی ہند کے علاقہ کٹھیر میں پھیل گئے، شروع میں ان کا دائرہ کار پیلی بھیت، آنولہ وغیرہ شہروں تک محدود رہا لیکن اپنی اولوالعزمی اور بالا ہمتی سے انھوں نے فتوحات میں مسلسل اضافہ کیا، یہاں تک کہ بریلی، رامپور، مرادآباد، سنبھل، بدایوں جیسے وسیع خطہ ارض پر ان کی حکومت قائم ہوگئی اور یہ علاقہ کٹھیر سے بدل کر روہیل کھنڈ کہلانے لگا۔ اِدھر روہیلے اپنا دائرۂ عمل وسیع کررہے تھے اور دوسری طرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں دخل اندازی اور قبضہ کرنے کی پالیسی پر مسلسل عمل پیرا تھی۔ بنگال میں والیِ بنگال سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد انھوں نے میسور اور اودھ پر نظریں گاڑنا شروع کردی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ سلطنتِ دہلی کی حمایت یافتہ بڑی ریاستوں کو تباہ یا مفلوج کرکے براہ راست ہندوستان کی مرکزی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ انگریزوں کے ہمنوا ہوگئے تھے اسی لیے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر 1774 میں میران پور کٹرہ شاہجہانپور کے مقام پر روہیلہ نواب حافظ رحمت خاں سے جنگ کی جس میں حافظ رحمت خاں کی شہادت ہوگئی۔ جنگ کے بعد صلح وصفائی کا عمل شروع ہوا اور حافظ رحمت خاں کے اکثر فرزند وظیفہ یاب ہوئے یا جاگیر سے نوازے گئے جب کہ فیض اللہ خاں نے کوشش کرکے رامپور کی ریاست حاصل کرلی، اس طرح 1774 میں ریاست رامپور کا قیام عمل میں آیا جس کو انگریزوں اور والیِ اودھ کی حمایت حاصل تھی۔

نواب فیض اللہ خاں کی وفات (1794) تک تو سب کچھ ٹھیک چلتا رہا لیکن اس کے بعد ان کے فرزند اکبر محمد علی خاں والیِ ریاست ہوئے تو روہیلوں اور نواب کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ نواب کو انگریزوں اور اودھ کے حمایت یافتہ ہونے کا غرہ تھا جب کہ روہیلے ان دونوں سے نفرت کرتے تھے۔ انجام کار روہیلوں نے نواب محمد علی خاں کو قتل کردیا، حالانکہ اس دور کے اکثر تاریخ نویس اور تذکرہ نگاروں کا بیان یہ بھی ہے

کہ نواب کے قتل میں صرف روہیلے ہی نہیں بلکہ نواب کے حقیقی برادرِ اصغر غلام محمد خاں بھی شریک تھے۔ نواب محمد علی خاں کے قتل پر بیک وقت اودھ اور انگریزوں کو جھٹکا لگا، روہیلے ان دونوں طاقتوں کو پہلے ہی اپنے جوشِ شجاعت اور خوئے آزادی سے خوف زدہ کر چکے تھے، یہ نیا واقعہ تو بغاوت کا کھلا اعلان تھا اس لیے انگریزوں اور اودھ کے نواب آصف الدولہ نے صف بندیاں شروع کردیں۔ روہیلوں کو خبر ملی تو وہ بھی تیاریاں کرنے لگے۔ اس دور میں رامپور فوج کے سپہ سالار اور قبائلی روہیلوں کے سربرآوردہ سردار غلام مصطفیٰ خان عرف نجو خان اکوزئی آخون خیل تھے۔ نجو خان کی قیادت میں رامپور کی فوج نے پیش قدمی کی۔

''24 اکتوبر 1794 جمعہ کو سنکھا ندی پل کے مغرب میں موضع بھٹورہ کے لاہی کھیڑہ کے اطراف یہ جنگ لڑی گئی، بریلی سے لگ بھگ پندرہ کلو میٹر دور بریلی رامپور شاہراہ پر سڑک کے بائیں جانب یہ جگہ ہے، ریلوے اسٹیشن کا نام بھٹورا ہے اور اس قصبے کا نام فتح گنج غربی ہے۔''[1]

''روہیلے بڑی بے جگری سے لڑے۔ بقول مصنف عماد السعادت روہیلوں نے تلنگوں کے سر اُڑانا شروع کیے اور ان کے جوش کا یہ عالم تھا جس آدمی کے سر پر پٹھان کی تلوار پڑ گئی ککڑی کی طرح اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اگر بندوق کی نال پر پڑی تو اس کے بھی دو حصے کر دیے۔ تمام پٹھان سوار انگریزی فوج میں اِس سرے سے اُس سرے تک نکل گئے اور خوب دادِ شجاعت دی۔ ڈھائی سو کے قریب گورے اور پچاس سردار کھیت رہے اور دو ہزار کے قریب تلنگے مارے گئے۔ مارے جانے والوں میں کرنل، میجر، کپتان، لفٹنٹ سمیت کئی بڑے سردار (افسران) تھے۔''[2]

''.....سخت جنگ ہوئی جس میں نواب مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں اور دوسرے سردار بلند خاں بڑی بہادری سے لڑکر شہید ہوئے۔ یہ لڑائی جنگِ دوجوڑہ کے نام سے مشہور ہے کئی شاعروں نے اس لڑائی کے سلسلہ میں جنگ نامے لکھے ہیں جس طرح راجپوتوں کی تاریخ میں آلہا اودل یادگار ہیں اسی طرح روہیلوں کی تاریخ میں نجو خاں اور بلند خاں کے نام مشہور ہیں۔''[3]

مشہور مورخ نجم الغنی خاں نجمی نے اخبار الصنادید میں بیان کیا ہے کہ انگریزی فوج کے چونتیس بڑے افسران روہیلوں کے ہاتھوں مارے گئے لیکن عین وقت پر انگریزوں کی چال بازی سے جنگ کا نقشہ پلٹ گیا اور روہیلے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔ یہ اور بات کہ ہار کر بھی وہی سرخرو رہے اور ان کا جانی نقصان انگریزی فوج کے مقابلے نصف ہی رہا۔ تاریخ میں رامپور کی فوج کے بہادروں کا یہ حریت پسندانہ کارنامہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا اور آج بھی سپہ سالار فوج غلام مصطفیٰ خان عرف نجو خاں، حضرت شاہ خاں عرف سنو خاں، سر بلند خاں عرف بلند خاں، محمد عبدالحکیم خاں، حضرت نور خاں، محمد مقیم خاں، محمد حسن خاں، محمد سعید خاں، قلندر خاں، محمد عمر خاں جیسے حریت پسند افراد کے نام عزت سے لیے جاتے ہیں۔ انگریز اور ان کے پروردہ تاریخ نویس اس جنگ کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ ایسی ذلت آمیز شکست ان کو کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی یہ اور بات کہ آج تک اس جنگ میں مارے جانے والے انگریزی فوج کے افسران کی یادگار کے طور پر ہر سال 24/ اکتوبر کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

> **تاریخ گواہ ہے کہ انگریزوں نے ریاست رامپور کی تباہی کے بعد اودھ کا بھی وہی حشر کیا جو رامپور کا ہوا تھا۔ انگریزوں کے حمایت یافتہ نواب بنائے جانے لگے اور سلطنت کے مختلف امور میں انگریز دخیل ہوگئے یہاں تک کہ نواب واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں مختلف بے سر وپا الزامات لگا کر ریاست پر انگریزوں نے مکمل قبضہ کرلیا۔**

اس جنگ میں روہیلوں کی شکست کے بعد ریاست رامپور میں انگریزوں کا عمل دخل مکمل طور سے ہو گیا، انہی کی حمایت سے والیانِ ریاست کی تخت نشینی ہونے لگی اسی لیے والیانِ رامپور اور ان کے افرادِ خاندان کا انگریزوں کا ہم نوا وہم خیال ہونا فطری بات تھی۔ روہیلوں کی اکثریت اس جنگ کے بعد در بہ در ہوئی اور بہت سے نامور سردار ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔

1857 کے انقلاب کا شعلہ بلند ہوا تو ایک بار پھر ریاست رامپور کے حریت آشناؤں کے ذہنوں میں انگریز سامراج سے بغاوت ونفرت پھر تازہ ہوگئی' لیکن والیِ ریاست نواب یوسف علی خاں ناظم کا انگریزوں کا ہم نوا ہونا' معاشی تنگی' اتحاد کی کمی اور کثرت نہ ہونا عوام کی وہ کمزوریاں تھیں جن کے سبب وہ چاہ کر بھی انگریزی کی مخالفت نہ کر سکے البتہ ان سخت حالات میں بھی رامپور کے بہت سے مجاہدینِ آزادی رامپور چھوڑ کر جنرل بخت خاں' نواب خان بہادر خاں اور شہزادہ فیروز شاہ کی افواج میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ جھانسی، حیدر آباد اور دیگر ریاستوں میں جا کر بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان مجاہدین کے مختصر احوال مختلف تاریخی کتب میں بکھرے پڑے ہیں جنھوں نے رامپور سے نکل کر مجاہدینِ آزادی کا بھرپور ساتھ دیا اور حب الوطنی کا حق ادا کیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ انگریزوں نے ریاست رامپور کی تباہی کے بعد اودھ کا بھی وہی حشر کیا جو رامپور کا ہوا تھا۔ انگریزوں کے حمایت یافتہ نواب بنائے جانے لگے اور سلطنت کے مختلف امور میں انگریز دخیل ہوگئے یہاں تک کہ نواب واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں مختلف بے سر وپا الزامات لگا کر ریاست پر انگریزوں نے مکمل قبضہ کرلیا۔

1857 کے جرأت مندانہ محاذ کے کئی برس بعد رامپور میں یہ شعلہ ایک بار پھر مولانا محمد علی جوہر جیسے مجاہدِ آزادی کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا اور انھوں نے حب الوطنی کا حق ادا کرتے ہوئے انگریز سامراج کی بھرپور مخالفت کی۔

جدوجہدِ آزادیِ ہند میں جنگِ نجو خانی (1794) کے بعد وقتاً فوقتاً مجاہدانہ کردار ادا کرنے والوں میں جنرل نیاز محمد خاں رامپوری، سید محمد حسن، مولوی خاں رامپور، طرہ باز خاں اور مولانا محمد علی جوہر جیسے مجاہدینِ آزادی کے نام ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

حواشی

1. نواب خان بہادر خان : روہیلہ اتہاس کے سندربھ میں (ہندی) از زیبا لطیف، صفحات 46/58، ناشر: رامپور رضا لائبریری، رامپور 2004
2. تحریکِ آزادی میں علما کا کردار 1857 سے پہلے از فیصل احمد بھٹکلی ندوی، ص 410، ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر 119، ندوۃ العلما لکھنؤ 2003
3. تذکرہ شعرائے روہیل کھنڈ جلد اول، از سید تعظیم علی شایاں نقوی، ص 71، ناشر: سید تعظیم علی شایاں نقوی بریلوی، کراچی پاکستان 1991

اس کے علاوہ مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے بھی جزوی استفادہ کیا گیا: ☆ اخبار الصنادید جلد دوم از نجم الغنی خاں نجمی رامپوری. تاریخ اودھ از کمال الدین حیدر۔ نوابین اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی رشتے از ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی بریلوی۔ تاریخ آصفی از ابو طالب اصفہانی' اردو ترجمہ ڈاکٹر ثروت علی۔ نجو خان شہید از عبداللہ خالد۔

■

Rizwan lateef khan
202,Gole Market Aptmts
Joha bai Zakir Nagar
Near Rehmani Masjid
Okhla, New Delhi-110025

راشد میاں

پہلی جنگِ آزادی اور نواب وزیر الدولہ

سابق راجپوتانہ اور موجودہ راجستھان کی واحد مسلم افغان ریاست ٹونک (محمد آباد) کے بانی نواب امیر الدولہ بہادر عرف امیر خاں کی حیات کا کثیر عرصہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی میں گزرا۔ اس نبرد آزمائی میں اکثر انھوں نے انگریزوں کو شکستِ فاش دی۔ لیکن بالآخر تھارہ جانے پر بحالتِ مجبوری اور بادلِ نخواستہ امیر خاں نے ایک باعزت معاہدے کی رو سے 1817 میں ریاست ٹونک حاصل کی تھی۔ اس کی اہم وجہ بقول ڈاکٹر مجد اریہ تھی کہ ''ایسے نازک مرحلے پر ہندوستان میں کوئی طاقت امیر خاں کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔''[1]

چونکہ نواب امیر خاں اور اُن کا لشکر فطری طور پر انگریزوں کے حریف تھے۔ ظاہر ہے وہ اس معاہدے سے قلبی طور پر خوش ہونے والے نہیں تھے۔ یہی جذبہ اُن کی اولاد و احفاد میں بھی کارفرما ہونا لازمی تھا۔ بعد وفات امیر خاں اُن کے فرزند ارجمند وزیر محمد خاں 1834 میں مسند نشیں ہوئے۔ اُن کا عہدِ حکومت تقریباً 30 سال 1864 تک رہا۔ مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی سے وزیر محمد خاں کا نہایت قریبی رشتہ تھا۔ وہ اُن کی والدہ امیر بیگم کے حقیقی خالو تھے۔ وزیر محمد خاں کی تربیت بھی قلعہ معلیٰ دہلی میں ہوئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی نے انھیں 'وزیر الدولہ امیر الملک بہادر نصرت جنگ' کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

نواب وزیر الدولہ اپنے والد ماجد نواب امیر الدولہ کی طرح سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ آزادیِ ملک سے وابستہ تھے۔ آپ سید صاحب سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور مع اہل خانہ اُن سے بیعت بھی تھے۔ ریاست اور حکومت برطانیہ کے مابین ہوئے معاہدے کے تحت نواب وزیر الدولہ نے کھلے طور پر تو مجاہدینِ آزادی کا ساتھ نہیں دیا، البتہ در پردہ وہ مجاہدینِ آزادی کو بھرپور مالی و اقتصادی تعاون کرتے رہے۔ اُن کے کئی حقیقی رشتے داروں، احباب و فوجی ملازمین نے نہ صرف پہلی جنگِ آزادی 1857 میں حصہ لیا۔ بلکہ سرگرمی سے جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔ مؤرخ ہنومان سنگھل اپنی اہم تصنیف 'تاریخ ریاست ٹونک' میں ناتھو رام کھڑگاوت کی کتاب 'رول آف راجستھان ان دی اسٹرگل آف 1857' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حالانکہ نواب خود انگریزوں کے بہترین فرماں روا اور وفاداروں میں اونچے مقام پر فائز تھے۔ لیکن ان کے فوجیوں اور کئی رشتے داروں نے نہ صرف بغاوت کی، بلکہ دہلی تک پہنچ کر اپنی بغاوت کا اعلان بھی کیا۔''[2]

نواب وزیر الدولہ کے سید احمد شہیدؒ سے گہری عقیدت و بیعت ہونے کے سبب کئی موقعوں پر وہ اُن کی تنظیم 'تحریک محمدیت' کی مال و اسباب سے مدد کیا کرتے تھے۔ اس کی تفصیلات آپ کی اہم تالیفات وصایائے وزیری، اور وقائع احمدی میں بطورِ خاص موجود ہیں۔ وقائع احمدی ضخیم کتاب ہے جو کئی جلدوں میں تحریر ہوئی ہے۔ مشہور ہے کہ یہ تصنیف ریاست ٹونک کی تاریخی مسجد قافلہ کے احاطے میں صاحبزادہ محمد علی خاں کے زیرِ نگرانی تحریر کی گئی ہے۔ جب سید احمدؒ اور سید اسمٰعیلؒ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے تو نواب وزیر الدولہ نے ان کے اہل و عیال، مہاجرین و مجاہدینِ آزادی کو ٹونک کے محلّہ قافلہ و محلّہ غول میں جگہیں دے کر نہ صرف بسایا بلکہ اُن کی بیواؤں کی بھرپور مدد بھی کی۔

اس سلسلے میں دہلی میں مقیم ٹونک کے مشہور ادیب و مؤرخ سید ساجد علی ٹونکی نے اپنی اہم تصنیف ''ٹونک میں اردو کا فروغ'' میں لکھا ہے کہ:

''نواب وزیر الدولہ کے دورِ حکومت کا سب سے اہم واقعہ 1857 کی جنگِ آزادی کا ہے۔ جب بڑے بڑے علما و فضلا، ادبا و شعرا اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے نواب وزیر الدولہ نے نہ صرف مہاجرین کو ٹونک میں پناہ دی بلکہ ان لوگوں کو ٹونک کے مغربی علاقے کے محلّہ غول میں آباد کیا۔''[3]

سید احمد شہیدؒ کی بیواؤں، اولاد و احفاد و دیگر لواحقین کو بھی مذکورہ محلّہ غول و قافلہ (ٹونک) کی حویلیوں و مکانات میں بسایا گیا۔ نواب وزیر الدولہ نے سید احمدؒ اور سید اسمٰعیلؒ کے اہل خانہ کی سکونت کے پختہ انتظامات کیے تھے۔ سید احمد شہیدؒ کی زوجہ سیدہ زہرہ سے ایک لڑکی سیدہ سائرہ کی ولادت ہوئی تھی۔ سیدہ سائرہ کے لڑکے سید اسحٰق عرف کلو میاں (سید احمد شہیدؒ کے نواسے) سے منسوب حویلی محلّہ غول سے ملحق علاقے میں آج بھی موجود ہے، جس کا راہِ عام والا ایک بڑا حصہ 'عظمت منزل' کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی سے متعلقہ مجاہدین و مہاجرین کے سلسلے کے بعض خاندان آج بھی مذکورہ علاقے میں سکونت پذیر ہیں۔

نواب وزیر الدولہ کو سید احمد شہیدؒ سے انتہائی قلبی عقیدت و نسبت تھی۔ اس کا ثبوت اُن کی اہم تالیف وصایائے وزیری سے بھی فراہم ہوتا ہے، جس میں بارہا سید احمدؒ کا ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ وصایائے وزیری کے حوالے سے مشہور عالمِ دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی مابہ الامتیاز تصنیف 'سیرت سید احمد شہیدؒ' میں لکھا ہے کہ:

''اس کتاب میں مختلف مناسبتوں سے پینسٹھ مقامات پر نواب صاحب نے عاشقانہ وارفتگی اور مریدانہ عقیدت مندی کے ساتھ حضرت سید صاحب اور آپ کے رفقا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حالات و کمالات درج کیے ہیں۔''[4]

سید احمدؒ کی شہادت کے بعد اسی نہج پر ہندوستان کے تمام مذاہب کی عوام اور والیانِ ریاست نے متحد ہو کر 1857 کی پہلی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ اس جنگ کی قبل

از وقت شروعات ہونے اور کسی منظّم منصوبے کے تحت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مقصد میں یہ جنگ ناکام تو ہوئی مگر یہ جنگ ہندوستانیوں کو نعمتِ آزادی سے آشنا کرانے، وطن کی محبت سے سرشار کرانے، عوام میں جذبۂ آزادی بیدار کرانے، عوام کو ایک نئی راہِ آزادیٔ ملک سے ہمکنار کرانے میں کامیاب ہوئی۔ بعد میں اسی راہ پر چل کر برٹش حکومت سے نجات حاصل کرکے ملک آزاد ہوا۔

اولین جنگِ آزادی میں شریک نواب وزیرالدولہ کے حقیقی رشتے داروں میں برادر صاحبزادہ محمد منیر خاں کے علاوہ اُن کے ماموں میر عالم خاں و عظیم اللہ خاں نے بطورِ خاص حصہ لیا تھا۔ ان میں صاحبزادہ محمد منیر خاں کو تو بیڑیاں ڈال کر قلعے میں قید کردیا گیا تھا۔ کچھ عرصے میں اُن کا وہیں انتقال بھی ہوا۔ اسی طرح عظیم اللہ خاں بھی قلعے میں بند کرکے نظر بند کردیے گئے۔ اور میر عالم خاں شدید جنگ میں شہید ہوگئے۔ اُن کے دولڑکوں شیر عالم خاں اور شاہ عالم خاں کو زخمی حالت میں گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔

دراصل میر عالم خاں دہلی کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے اقربا میں تھے۔ وہ بادشاہِ دہلی کی کمک رسائی اور جنگِ آزادی میں شریک ہونے کی غرض سے دہلی جارہے تھے۔ نواب وزیرالدولہ نے برطانیہ حکومت کے دباؤ میں سپاہی بھیج کر انھیں روکنا چاہا۔ لیکن میر عالم خاں نے رکنے کے بجائے سپاہیوں سے جنگ کرنا بہتر سمجھا۔ اس جنگ میں میر عالم خاں موقعے پر ہی شہید ہوگئے۔ ٹونک میں یہ سانحہ میر عالم خاں کے مکان سے ملحق گھیر میں واقع ہوا۔

عہد حاضر کے مشہور شاعر، صحافی، مصنف و مترجم مرحوم مخمور سعیدی واُن کے برادر خورد فضل الرزاق خاں ارشد عرف چھوٹے میاں شیر عالم خاں کے پوتے اور میر عالم خاں کے پرپوتے تھے۔ اُن کے اہل وعیال آج بھی یہاں سکونت پزیر ہیں۔ ریاست ٹونک میں جنگ آزادی 1857ء سے متعلق شہادتوں میں مقامی طور پر میر عالم خاں اولین شہید تھے۔ فضل الرزاق خاں ارشد (برادر خورد مخمور سعیدی) نے اپنے ایک مضمون 'جنوں کی حکایاتِ خونچکاں' میں لکھا ہے کہ:

''میر عالم خاں صاحب کے دونوں بیٹے شاہ عالم خاں اور شیر عالم خاں جو میر عالم خاں کی شہادت کے بعد زخمی حالت میں گرفتار کرلیے گئے تھے اور قلعہ امیر گڑھ میں قید کردیے گئے تھے، کچھ مدت بعد نواب صاحب جاؤرہ نے وزیرالدولہ پر زور ڈال کر انھیں اپنے پاس بلالیا تھا۔ برسوں بعد وہ ٹونک واپس آئے۔''[5]

ریاست ٹونک سے ڈیڑھ ہزار سے زائد لوگوں کی فوج دہلی جنگ میں شامل ہونے پہنچی تھی۔ جو ماہ اگست 1857 میں دہلی کی مختلف جنگی جھڑپوں میں حصہ لیتی رہی۔ ان میں کئی افراد شہید ہوئے تو کئی گرفتار۔ ان جانباز شہیدوں میں خود نواب وزیرالدولہ کے پٹہ بازی کے استاد اور غالب کے دوست دہلی کے طالع یار خاں کے فرزند اسفند یار خاں اور صفدر یار خاں کا بھی نام شامل ہے۔ اس کا ذکر مرزا غالب نے اپنے ایک مکتوب میں نہایت پُرسوز انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب نہ جاسکے۔ یہیں (دہلی) رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔''[6]

دراصل طالع یار خاں کے دونوں فرزند دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے حفاظتی دستے میں ملازم تھے۔ جب ایک انگریز افسر نے بادشاہ سے بدکلامی کی تو اسفند یار خاں سے وہ برداشت نہیں ہوئی اور انھوں نے اُسے گولی مار کر وہیں ختم کردیا۔ اس واقعے کا ذکر بھی مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

''غدر میں طالع یار خاں ٹونک میں تھے۔ لیکن اُن کے بیٹے اسفند یار خاں اور اصغر یار خاں دہلی میں تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر کی سرکار میں ملازم ہوگئے تھے۔ اسفند یار خاں نے بادشاہ سے سخت کلامی پر ریزیڈنٹ انگریز کو دشمن برج پر چڑھتے ہوئے گولی سے ٹھنڈا کردیا تھا۔ جب بادشاہ مقبرہ ہمایوں چلے گئے تو دونوں بھائی الور (راجپوتانہ) منتقل ہوگئے تھے۔''[7]

بعد میں مخبروں کی اطلاع پر انھیں الور سے گرفتار کرکے دہلی لایا گیا۔ مقدمہ چلنے کے بعد انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ دہلی منتقل ہونے سے قبل طالع یار خاں کے دونوں لڑکے ٹونک میں ہی ملازم و مقیم تھے۔ طالع یار خاں قدیم دہلی کے علاقے بلی ماران کے ساکن تھے۔ مرزا غالب ان کے نزدیک ہی گلی قاسم جان میں رہتے تھے۔ غالب اور طالع یار خاں کے درمیان باہم مراسلت و دوستانہ مراسم تھے۔ اس سلسلے کا ایک اہم مضمون ٹونک کے تاج الادبا مولانا منظور الحسن برکاتی نے بعنوان 'غالب کے ایک دوست' ماہنامہ 'شاعر' کے ماہ فروری 1970 کے شمارے میں شائع کروایا تھا۔ بعض حوالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نواب وزیرالدولہ نے طالع یار خاں اور اُن کے لڑکوں کو رہائش کے واسطے ایک حویلی ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ پھر بعد میں ماہانہ وظیفہ کے بدلے ایک گاؤں وزیرپور جاگیر میں عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی (مرحوم) اولین صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج ٹونک نے بھی اس ضمن میں جو تحقیق کی تھی اس کے مطابق ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ کے عوض گاؤں وزیرپور جاگیر میں دینے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی نتائج کے آخر میں لکھا ہے کہ:

''......چنانچہ تلاش کے بعد ایک اور سند ملی جو 2/ذی قعدہ 1271ھ مطابق 1854 کی تحریر شدہ ہے۔ اس میں استاد طالع یار خاں اور اُن کے دونوں صاحبزادے صفدر یار خاں اور اصغر یار خاں کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے بجائے ایک گاؤں الموسوم 'وزیرپورہ' جاگیر میں عطا کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔''[8]

نواب وزیرالدولہ کے عہد میں ریاست ٹونک سے پہلی جنگِ آزادی 1857 میں شریک ہونے والے افراد میں غیر مسلم حضرات بھی شامل تھے۔ واضح ہو کہ نواب وزیرالدولہ نے ہندوؤں کے عدالتی معاملات کے فیصلوں کے لیے مفتیان کرام کے ساتھ ہندو پنڈتوں کا بھی تقرر کیا تھا۔ نواب وزیرالدولہ کی فوج کے غیر مسلم حضرات میں بعض سردار بھی شامل تھے۔ مقامی غیر مسلم عوام وافسران نے بھی مجاہدینِ آزادی کا پورا ساتھ دیا تھا۔ ریاست کے وجود سے متعلق معاہدہ کرانے والے ریاست ٹونک کے اولین وکیل رائے زنجن لال کے بیٹے برج لال کے مجاہدینِ آزادی کا ساتھ دینے کا ذکر مختلف حوالوں سے کتب میں موجود ہے۔

ریاست ٹونک کے پرگنات میں بھی پہلی جنگِ آزادی کے اثرات رونما ہوئے۔ بالخصوص پرگنہ نیماہیڑہ کے حاکم بخشی غلام محی الدین خاں و پردھان پٹیل تاراچند نے نیچ چھاؤنی کے باغی فوجیوں اور مجاہدینِ آزادی کا حد درجہ تعاون و مدد کی تھی۔

19/ستمبر 1857 کو کپتان شاروس نے کرنل جیکسن کے ساتھ 83 ویں کمپنی کی انگریزی فوج کو نیماہیڑہ کے قریب لاکر عامل کو حکم دیا کہ نیماہیڑہ میں ٹونک نواب کے جو 300 فوجی ہیں وہ اپنے ہتھیار انگریز فوج کے سامنے رکھ دیں۔ فوج کے منع کرنے پر عامل اور غلام محی الدین خاں دونوں نے کرنل جیکسن کے پاس پہنچ کر کہا کہ وہ خود تو اپنے ہتھیار دے سکتے ہیں لیکن فوج نے منع کیا ہے۔ شاروس نے تھوڑے وقفے سے عامل کو پھر کہلوایا کہ اگر فوج نہیں مانتی تو وہ (عامل اور حاکم) فوراً کپتان کے سامنے حاضر ہوں۔ جب حالات زیادہ بگڑنے لگے تو فوجیوں نے پرکوٹے کے دروازے بند کرتے ہوئے اُن پر توپیں چڑھا کر مقابلے کی تیاری شروع کردی۔ صرف 300 کی تعداد والی فوج نے پوری کمپنی کی انگریز فوج کا رات بھر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس ضمن میں مؤرخ ہنومان سنگھل نے لکھا ہے کہ:

''کپتان شاروس نے غصہ میں پوری رات توپوں کی مدد سے پرکوٹہ توڑنے کی ناکام کوشش کی۔ رات میں

ہی بخشی غلام محی الدین خاں بچے ہوئے فوجی دستے کے ساتھ فرار ہوگئے۔ حملے میں دو انگریز بری طرح زخمی ہوگئے اور ایک انگریز نائک مارا گیا۔ پندرہ بیس فوجی بھی کام میں آئے۔ صبح انگریزوں نے نیماہیڑہ پر قبضہ کر یونین جیک لہرادیا۔ پردھا پٹیل کو گرفتار کر کے اُسے مجمعِ عام میں توپ سے اڑادیا گیا۔"[9]

اگرچہ بخشی غلام محی الدین خاں کے حوصلے آخر تک بلند رہے اور وہ انگریزی فوج سے مزید جنگ کرنا چاہتے تھے، لیکن بزرگانِ شہر کی فہمائش و دباؤ کے سبب انھوں نے نیماہیڑہ چھوڑا۔ 'تاریخ دورِ ایام' میں ناظم اصغر علی نے ان کے حوصلوں کی بلندی سے متعلق لکھا ہے کہ:

"اگرچہ غلام محی الدین خاں کی جرأت میں تزلزل اور اس کے استقلال میں اب تک بھی کسی قسم کی کوئی لغزش نہیں تھی، لیکن نیماہیڑہ کی فضا پر رات کی قدرتی تاریکی محیط ہوجانے سے جب اس لڑائی کا سلسلہ رک گیا تو نیماہیڑہ کے کاروباری آدمیوں نے التجا کے ساتھ اُس کو یہ سمجھا کر لڑائی سے روکا کہ دشمن کی فوجی قوت کے مقابلے میں نیماہیڑہ کی فوجی جمعیت کم ہے۔ گولی، بارود وغیرہ کا میگزین بھی تھڑ گیا ہے۔"[10]

چنانچہ بخشی غلام محی الدین خاں یہاں سے نکل کر مندسور علاقے کے باغیوں میں جا ملے۔

نواب وزیرالدولہ کے عہدِ حکومت میں ایک طرف تو آزادیِ ہند سے متعلق ملک میں جنگی جھڑپوں کا ماحول تھا۔ دوسری طرف قتل وغارت گری کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلیں اُجڑ چکی تھیں۔ بالخصوص دہلی کے حالات ناگفتہ بہ ہورہے تھے۔ ایسے عالم میں نواب وزیرالدولہ نے کئی آفت زدہ علما شعرا و ادبا کی بخوبی سرپرستی کی۔ چونکہ نواب صاحب کی تربیت قلعہ معلیٰ دہلی میں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے غالب و مومن سے اُن کے گہرے تعلقات تھے۔

سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے مومن سے اُن کا تعلق پیر بھائی کا تھا۔ مومن ایک خوددار شاعر تھے لیکن انھوں نے اپنے مخصوص تعلق کے سبب نواب وزیرالدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اسی طرح غالب نے اُن کی شان میں دو قصیدے، ایک قطعہ 'حسنِ طلب' تحریر کیے تھے۔ زمانۂ غدر میں دیگر ریاستوں و دبستانوں سے ٹونک آئے شعرا، علما و ادیبوں میں ظہیر دہلوی، انور دہلوی، اسد لکھنوی، مولانا حیدر علی رامپوری، مولوی بہادر علی دہلوی، (مصنف امیر السیر فی سید خیر البشر) مولوی عبدالغفار بنگالی، سراج الرحمن خاں، مولوی محمد علی سواتی، مولوی امام الدین کشمیری وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

ان میں ہر شخصیت بذاتِ خود ایک دبستان سے کم نہ تھی۔ ظہیر دہلوی و اسد لکھنوی اردو کے دو مرکزی دبستانوں کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان دونوں کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ اس وقت ٹونک میں موجود تھا۔ ظہیر دہلوی کی حیات کا ایک بڑا عرصہ ریاست ٹونک میں گزرا۔ انھوں نے دیگر نوابین کا عہد بھی دیکھا۔ اُن کے تین دیوان ریاست ٹونک میں ہی شائع ہوئے تھے۔ جگن ناتھ پرشاد فیض نے تذکرہ گلزارِ سخن میں لکھا ہے کہ:

"آپ کے (ظہیر دہلوی کے) تین دیوان ریاست ٹونک میں شائع ہوچکے ہیں چوتھا بھی قریب اختتام ہے۔"[11]

پہلی جنگِ آزادی 1857 سے متعلق ظہیر دہلوی کی اہم تاریخی تصنیف 'داستانِ غدر' کی تکمیل بھی ٹونک میں ہونا بتائی جاتی ہے۔ یہ ایک خودنوشت سوانح کے علاوہ غدر کی مستند تاریخ بھی کہلاتی ہے۔ یہ کتاب (داستانِ غدر) 1910ء میں شائع ہوئی۔ دہلی کی تباہی سے متعلق ظہیر دہلوی کے بعض اشعار آج بھی زبان زد ہیں۔ مثلاً

ہم نشیں قصہ دہلی نہ سنانا ہرگز
زخمِ نو داغِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
بھولے ہوئے افسانۂ دل یاد کریں گے
اُجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں گے
کہیں آرام سے دو دِن فلک رہنے نہیں دیتا
ہمیشہ اک نہ اِک سر پر مصیبت آہی جاتی ہے

مرزا غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر نے نواب وزیرالدولہ کی مدح میں تحریر کیے گئے قصائد میں اُن کی قدردانیِ علم و ہنر، سخاوت اور ادب نوازی کی تعریف کی ہے۔ ان میں پہلا قصیدہ جو فارسی شاعر عرفی کی زمین میں ہے، اس کے مطلع میں نواب صاحب کی مدح اس طرح کی گئی ہے۔

اے ذات تو جامع صفت عدل وکرم
دے بر شرف ذات تو اجماع اُمم را

دوسرا قصیدہ غالب نے عیدالاضحیٰ 1267ھ کی تہنیت میں تحریر کیا تھا۔ جس کا مطلع اس طرح ہے۔

عیدالاضحیٰ بہ سرِ آغاز مستان آمد
وقت آراستن حجرہ ایواں آمد

ان دونوں قصائد کے عوض نواب صاحب نے مرزا غالب کو خاطر خواہ صلے سے بھی نوازا تھا۔ گہرے مراسم کی وجہ سے غالب نے اپنی تقریباً تمام تصانیف شائع ہونے پر نواب وزیرالدولہ کو بطورِ خاص ارسال کی تھیں۔ 'مہر نیم روز' (1854) کے علاوہ غدر کے حالات اور خود کی سرگذشت سے متعلق تصنیف 'دستنبو' جب 1858 میں شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ غالب نے حسبِ روایت نواب صاحب کو ارسال کیا تو اس کی لوح پر یہ قطعہ بھی تحریر کیا۔

نذرِ نواب وزیرالدولہ آں محیط کرم ودانش وداد
ہمہ بدیں حیلہ مگر یاد آید غالب خستہ کہ رفتہ است زیاد[12]

دستنبو کا ایک اردو ترجمہ مخمور سعیدی نے اپنی تصنیف '1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی' مطبوعہ 2007 میں بھی کیا ہے۔

الغرض نواب وزیرالدولہ پہلی جنگِ آزادی 1857 میں انگریزوں سے معاہدے کی سختی کے سبب خواہ اُن کے ظاہری وفادار کہلاتے ہوں مگر درحقیقت وہ درپردہ غازیانِ ملت ومجاہدینِ آزادی کو اپنے دامنِ فیض سے آسودگی ومالی اعانت فراہم کراتے رہے۔ ان کے حقیقی رشتے دار، احباب وفوج سے منسلک افراد وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے کر شہادتیں حاصل کیں۔ نواب وزیرالدولہ نے غدر سے متاثر آشفتہ حال اور آفت رسیدہ عوام، ماہرِ فن شعرا علما وادبا سبھی کے لیے اپنے در وا کر انھیں حسبِ صلاحیت مناصب ومراتب عطا کیے تھے۔ باصلاحیت شخصیات کو گراں قدر صلہ اور انعام واکرام سے بھی نوازا۔ پہلی جنگِ آزادی اور اس سے پیدا شدہ حالات ونتائج کے مدِنظر ایک نسبتاً چھوٹی ریاست کے نواب وزیرالدولہ کے ذریعے مذکورہ پسِ پردہ کیے گئے اصلاحی واعانتی اقدامات کے ساتھ اُن کی سخاوت، علم دوستی وادب نوازی کو تاریخِ اولین جنگ آزادی میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات:

1 An Advance History of India by Majumdar Page - 707
2 تاریخ ریاست ٹونک: ہنومان سنگھل، ص149
3 ٹونک میں اردو کا فروغ: سید ساجد علی ٹونکی، ص24
4 بحوالہ سیرت سید احمد شہیدؒ: مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص113
5 بحوالہ جنگِ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر: مرتبہ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، ص267
6 بحوالہ اردوئے معلیٰ، ص234
7 بحوالہ عودِ ہندی، 1858، ص57
8 بحوالہ نخلستان، جے پور جولائی تا ستمبر 1981، ص68
9 تاریخ ریاست ٹونک: ہنومان سنگھل (اخذ شدہ) صفحہ 151-152
10 تاریخ دورِ ایام: ناظم اصغر علی 1924، ص37
11 تذکرہ گلزارِ سخن: جگن ناتھ پرشاد فیض 1908ء، ص278
12 بحوالہ 1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی (دستنبو اور خطوطِ غالب کے حوالے سے): مخمور سعیدی 2007، ص22

■

Dr. Rashid Miyan
(H.O.D.), Department of Urdu
Govt. College
Tonk-304001 (Rajasthan)
Mob: 7240302056

تحریکِ آزادی میں مسلم رہنماؤں کا کردار

عبدالسلام

تحریک آزادی ہند میں دیگر طبقات کے ساتھ مسلمانوں نے بھی بے انتہا قربانی دی، جس کی وجہ سے وطن عزیز آزاد ہوا اور آج ہم آزادی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج ہم اپنے بہت سے لوگوں کو بھول گئے جنھوں نے اپنے خون سے ہندوستان کو سینچا تھا۔ اسکول کے نصاب میں بھی صرف چند نام ملتے ہیں جنھیں لوگ جانتے ہیں۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین، فخرالدین علی احمد، خان عبدالغفار خاں اور اشفاق اللہ خاں وغیرہ۔ اس مضمون میں ان مسلم مجاہدین کا تذکرہ کرنا ہے جنھیں عام طور پر یاد نہیں کیا جاتا۔

اوّلین جنگ آزادی 1857 کی تاریخ لاکھوں ہندو، مسلمان فرزندان وطن کی عظیم جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کا زندہ اور متحرک منظر نامہ ہے۔ مادر وطن کی ان لاتعداد بیٹیوں میں دو خواتین نہایت نمایاں اور ممتاز ہیں، جن کے کارناموں پر نہ صرف ہندوستانی تاریخ بلکہ دنیا کی ہر عورت ناز کر سکتی ہے۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی شجاعت اور عدیم المثال جذبہ شہادت اور جنگ آزادی میں اودھ کی راج ماتا بیگم حضرت محل کی تاریخ ساز قیادت وہ چمک دار مثالیں ہیں جو نقش دوام کی طرح دنیا کے جریدے پر چھائے ہوئے ہیں۔

بیگم حضرت محل کی بہادری اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ عام جلسے میں اور جنگی محاذ پر تلوار ہاتھ میں لے کر پرجوش عوام کو خطاب کرتیں۔ اس دوران وہ فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔ ایک موقع پر فوجی سرداروں کی میٹنگ میں انھوں نے کہا تھا:

”دہلی کی عظیم طاقت وسلطنت نے بڑے امید افزا وعدے کیے تھے اور دہلی سے جو مراسلات بھیجے گئے تھے وہ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑا دیتے تھے۔ لیکن کتنی جلدی بادشاہ کو معزول کر دیا گیا۔ سکھوں اور جاٹوں کو انگریزوں نے خرید لیا ہے اور مواصلات کا سلسلہ کاٹ دیا ہے۔ نانا فرنویس کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور لکھنؤ کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ لکھنؤ میں پوری فوج موجود ہے لیکن عزم اور ولولے سے خالی ہے۔ اگر فوج میں جانبازی کا عزم اور حوصلہ موجود ہے تو وہ عالم باغ پر حملہ کیوں نہیں کرتی۔ کیا فوج اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ برطانوی فوج کو مزید کمک پہنچ جائے اور وہ لکھنؤ کا محاصرہ کر لے، مجھے جواب دو، تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں۔“

(خفیہ رپورٹ، نیشنل آرکائیوز دہلی 26 فروری 1858، 23 نومبر)

بیگم نے دلّی میں مغل شاہزادوں کے قاتل میجر ہڈسن، جنرل نیل اور جنرل ہنری لارنس جیسے دشمنوں کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ جنگ جاری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی طرف سے بیگم کو جنگ روک دینے اور صلح پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ انگریز واجد علی شاہ کا ملک واپس کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن بیگم حضرت محل نے دغاباز انگریزوں سے کسی طرح کی گفتگو کرنا بھی پسند نہ کیا۔ بونڈی کے مقام پر انھوں نے اپنی فوجی طاقت کو مجتمع کیا اور ایک بار پھر برطانوی فوج کا سامنا کیا۔ اس کا بھی نتیجہ وہی نکلا جو ہندوستان کی تقدیر میں لکھا تھا۔ انگریز فوج نے انھیں گھیر کر گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن احمد اللہ شاہ کے مجاہد دستے نے اس کا راستہ روک لیا اور بیگم حضرت محل اپنے بیٹے نواب برجیش قدر کے ساتھ نیپال ہجرت کر گئیں۔ وہاں راجہ نے انھیں سیاسی پناہ دی اور گزارے کے لیے تھوڑا وظیفہ بھی دیا۔ بعد میں برطانوی حکومت نے انھیں مناسب پنشن دینے اور کلکتہ یا لکھنؤ میں رہنے کی پیشکش کی تھی جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔ بیگم نے اس وقت کہا تھا۔ ”مجاہدین آزادی کی شکست ضرور ہوئی ہے لیکن یہ جنگ

جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک غیر ملکی حملہ آوروں کے تسلط سے ملک آزاد نہیں ہو جاتا۔''

بیگم حضرت محل شان استغنا اور صبر و استقلال کے ساتھ 20 سال دیارِ غیر میں گزار کر 7 اپریل 1879 کو انتقال کر گئیں۔ ان کا مزار ہندوستانی مسجد چوک کاٹھمنڈو میں واقع ہے۔ ان کی تعمیر کردہ مسجد آج بھی ان کی شجاعت اور جذبۂ حریت کی یاد دلاتی ہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی بھی ہندوستان جنت نشاں کی جنگ آزادی کے بہادروں میں سے ہیں جن کے تذکرے کے بغیر 1857 کی جنگ آزادی مکمل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے سرفروشی، عالی حوصلگی اور ایثار و قربانی کی لازوال مثالیں قائم کی ہیں۔

1857 کے غدر میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اس کے مطابق ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ اپنے اس فتوے کو انھوں نے جلسوں میں جگہ جگہ دہرایا اور انگریزوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب انگریزوں کو اس فتویٰ کا علم ہوا تو لکھنؤ ہائی کورٹ نے ان کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا اور انھوں نے اپنے کو 30 جنوری 1859 کو کورٹ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے وکیل کے بجائے خود اپنا دفع کیا اور انگریزوں کے ظلم و ستم کی ساری داستان بیان کر دی۔ مقدمے سے وہ بری ہونے والے تھے اور ججوں نے انھیں رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فیصلے کے دن ہائی کورٹ کے جج نے ان سے ایک آخری سوال کیا:

''کیا یہ سچ ہے کہ انگریزوں کے خلاف آپ نے جہاد کا فتویٰ دیا ہے؟ اس کے جواب میں انھوں نے بھری عدالت میں اقرار کیا کہ میں نے فتویٰ دیا ہے اور آج بھی اپنے فتویٰ پر قائم ہوں کہ ہم ہندوستانیوں کو آپ کے خلاف تب تک جہاد کرنا ہے جب تک آپ ہمیں خود مختاری نہ دے دیں۔''

(ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کا لہو، ص 70)

ان کے اس بیان سے عدالت کا سارا ماحول بدل گیا اور انھیں عمر قید کی سزا سنا کر 8 اکتوبر 1853 کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالحق بہت بھاگ دوڑ کے بعد ملکہ وکٹوریا سے ان کا معافی نامہ لے کر 13 فروری 1861 کو اس وقت کالا پانی (انڈمان نکوبار) پہنچے، جب ان کی لاش جیل میں رکھی ہوئی تھی اور ہندوستانی قیدی انھیں گھیرے کھڑے تھے۔ علامہ نے آخری وقت میں یہ وصیت کی تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے دفع ہوں تو میری قبر پر خبر کر دی جائے۔ 15 اگست 1947 کو مولانا نجم الحسن رضوی نے علامہ کے مزار پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی اور ہندوستان سے انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر ان کی وصیت پوری کی۔

بیسویں صدی میں بلاشبہ مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد نے کامیابی حاصل کی، اس کے برعکس بزور طاقت آزادی کی جدّوجہد کرنے والے پرجوش انقلابی ناکام تصور کیے جا سکتے ہیں لیکن آزاد ہندوستان کی حکومتی، انتظامی اور سرکاری تاریخ میں ان انقلابیوں کو دوسرے رہنماؤں کی طرح اہمیت نہ دیے جانے کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بھگت سنگھ، رام پرشاد بسمل، چندر شیکھر آزاد اور اشفاق اللہ خاں جیسے عظیم شہیدانِ وطن اس ملک کے ہر باشعور شہری کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جنھوں نے ہندوستان کی عزت و حرمت کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

اشفاق اللہ خاں کو بطورِ خاص یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی شخصیت بلا لحاظ مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں کے لیے دوسرے مجاہدینِ آزادی کی طرح قابلِ احترام ہے۔ مادرِ ہند کے اس مایہ ناز فرزند نے بہادر روہیلہ پٹھانوں کے تاریخی شہر شاہجہاں پور کے اس معزز خاندان میں 22 اکتوبر 1900 میں آنکھ کھولی جو صدیوں سے اپنی شجاعت، غیرت اور شرافت کے لیے معروف ہے۔ ان کے والد کا نام شفیق اللہ خاں تھا اور ماں مظہر النساء تھیں۔ ننھیال کے سارے لوگ گریجویٹ اور سرکاری ملازمت میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ سب جوڈیشیل مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ 1857 کے غدر میں انگریزی ملازمت میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے غدر کا ساتھ نہ دیا اور عوام نے ان کی عالی شان کوٹھی جلا دی۔ اس طرح وہ علاقہ جلی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ بہر حال اشفاق اللہ خاں نے ملک کے لیے اپنی جان کی قربانی دے کر وہ داغ ہمیشہ کے لیے دھو دیا۔

انگریزوں نے اشفاق اللہ خاں کو بہت ورغلایا اور کہا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوگا تو ہندوؤں کی حکومت ہوگی مسلمانوں کی نہیں۔ پھر تم ان کا ساتھ کیوں دے رہے ہو؟ اس پر اشفاق اللہ خاں نے کہا یہ تو آپ کی پالیسی ہے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔'' آپ لوگوں نے ہندوستان میں ایک تاجر کی حیثیت سے قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد آپ نے ایک راجہ کو دوسرے راجہ سے لڑایا۔ کبھی خود کسی نہ کسی فریق کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور شطرنج کی گوٹی کی طرح ہمیں استعمال کرتے رہے۔ اس طرح یہ مردِ مجاہد انگریزوں کی چالوں میں کبھی نہیں آیا یہاں تک کہ اپنی جانِ عزیز ملک کے لیے قربان کر دی۔

بیسویں صدی میں بلاشبہ مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد نے کامیابی حاصل کی، اس کے برعکس بزور طاقت آزادی کی جدّوجہد کرنے والے پرجوش انقلابی ناکام تصور کیے جا سکتے ہیں لیکن آزاد ہندوستان کی حکومتی، انتظامی اور سرکاری تاریخ میں ان انقلابیوں کو دوسرے رہنماؤں کی طرح اہمیت نہ دیے جانے کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بھگت سنگھ، رام پرشاد بسمل، چندرشیکھر آزاد اور اشفاق اللہ خاں جیسے عظیم شہیدانِ وطن اس ملک کے ہر باشعور شہری کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ابادی بانو بیگم (بی اماں) کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے نہ ہی اسکول کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ عورت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ تھیں۔ شوہر ذوالفقار علی کے انتقال کے بعد انھوں نے بچوں کی اس طرح تعلیم و تربیت کی کہ بچے آفتاب اور ماہتاب کی طرح روشن ہو گئے۔

بی اماں رام پور یوپی میں پیدا ہوئیں اور رام پور میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے عورت ذات ہوتے ہوئے بھی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص کر جو انھوں نے بیرون ملک میں لکچر دیا وہ تو اردو زبان میں ادبی سفرنامے کی طرح ہے۔ انھوں نے اپنی ہر تقریر میں اس بات کو دہرایا کہ ''اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں ملک کی دو آنکھ کی طرح ہیں۔ جس طرح ایک بدن پہ دو آنکھ ہوتی ہے۔''

(ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کا لہو، ص 64)

آج کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہ بچے ان کا نام جانتے ہیں اور نہ ان کے کارنامے۔ یہی وہ عورت تھی جس نے علی برادرس کو پیدا کیا جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنا نام روشن کیا۔ ان پر پروفیسر یاس وید دیوا کرنے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام 'مدر آف رام پور' تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسے کئی بار دکھایا گیا۔ یہ عورت اسکول اور

کالج کی پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن جنگ آزادی کی لڑائی میں خود ہی نہیں اپنے دونوں بیٹوں کو بھی جھونک دیا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر بین الاقوامی شہرت یافتہ صحافی اور مقتدر سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ان کا کلام قومی و ملی جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔تحریک خلافت کے سالارِ اعظم مولانا محمد علی جوہر پر ہندوستان کی تاریخ آزادی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ان کی عہد آفریں شخصیت اہل ہند کو حریت وعزیمت کا سبق دیتی رہے گی۔

مولانا محمد علی جوہر کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔مولانا کچھ مہینوں تک انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے۔ اس کے بعد ایک نئی پارٹی انڈین مسلم لیگ بنا کر اس سے وابستہ ہو گئے۔انھوں نے دو اخبار اردو میں 'ہمدرد' اور انگریزی میں 'کامریڈ' نکالا۔ جو تحریک آزادی کا علمبردار تھا۔ انھوں نے 1919 سے 1924 تک خلافت تحریک چلائی۔اس کے بانی بھی یہی تھے۔خلافت تحریک کے بعد انھوں نے اپنی پوری طاقت تحریک آزادی میں لگا دی۔انھوں نے گاندھی جی کا ساتھ دیا اور اس سلسلے میں کئی بار جیل بھی گئے۔وہ انڈین نیشنل کانگریس کے چھٹے صدر تھے۔لندن میں گول میز کانفرنس میں مکمل آزادی کی مانگ کو لے کر گئے۔جاتے وقت مہاتما گاندھی سے انھوں نے کہا۔ ''آپ دعا کیجیے اس بار ہندوستان کا تخت لے کر آؤں گا،نہیں تو تختہ بن جاؤں گا۔'' (ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کا لہو: زین العابدین خاں، 2015،شوبی آفسیٹ پریس، دہلی، ص 61)

بیرسٹر آصف علی کی ابتدائی تعلیم سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں ہوئی۔ان کی پیدائش دہلی کے ایک مشہور گھرانے میں 11 مئی 1888 کو ہوئی تھی۔انھوں نے تحریک آزادی ہند میں حصہ لیا اور کئی بار جیل گئے۔ بیرسٹر آصف علی کو اس وقت زیادہ شہرت حاصل ہوئی جب یہ شہید بھگت سنگھ اور باٹو کیشور دت کے وکیل بنے اور ان کا مقدمہ بغیر فیس کے کورٹ میں لڑنے لگے۔ 1935 میں سینٹرل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے اس کے بعد کانگریس کمیٹی کے اہم رکن ہو گئے۔ وہ ان تمام قیدیوں اور مجرموں کے وکیل بنے جنھوں نے سبھاش چندر بوس کی فوج (.I.N.A) میں کام کیا تھا۔ان کے سب سے بڑے آفیسر جنرل شاہ نواز خاں تھے۔کیس انگریزوں سے غداری کا اور بوس کے ساتھ کھڑے ہونے کا تھا۔کیس چلتا رہا، یہاں تک کہ ملک آزاد ہو گیا اور تمام مجاہدین آزادی جو سبھاش چندر بوس کی فوج میں تھے۔خود بخود رہا ہو گئے۔

آصف علی پہلے شخص تھے جنھیں ہندوستانی حکومت نے اپنا سفیر بنا کر امریکہ بھیجا۔ 1947 سے 1948 تک سفیر رہے۔اس کے علاوہ 4 سال تک اڑیسہ کے گورنر کی بھی ذمے داری نبھائی۔آزاد مرکزی حکومت نے انھیں سوئزرلینڈ کی سفارتی ذمے داریوں کے ساتھ آسٹریلیا کا بھی سفیر بنایا۔اس کے ساتھ ہی اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کو بھی صلاح مشورہ دیتے رہے۔ 2 اپریل 1953 کو آسٹریلیا میں ان کا انتقال ہو گیا۔ان کا شمار ملک کے ان سچے گاندھین رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ملک اور عوام کے لیے اپنی پوری زندگی قربان کر دی۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس ہماری تحریک آزادی کے عظیم ہیرو تھے۔جو انسانی جذبہ حریت اور حب الوطنی کی روشن مثال بن کر کروڑوں ہندوستانیوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔جب تک ان کا دیا ہوا نعرہ 'جے ہند' ملک کی فضا میں گونجتا رہے گا ان کی یادیں ہمارے جذبوں کو گرماتی رہیں گی اور اس سرزمین کے گوشے گوشے سے ان کے لفظوں کی بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ ''تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دوں گا'' جب بھی آزاد ہند فوج کے بہادروں، جاں نثاروں کا ذکر آئے گا تو جنرل شاہ نواز، میجر جنرل عزیز کیانی، کرنل احسان قادر، کرنل عنایت حسین، راس بہاری بوس، کرنل بھونسلے، لیفٹیننٹ سہگل اور گروبخش سنگھ ڈھلوں اور ان کے بہت سے بہادر ساتھیوں کو بھی یاد کیا جائے گا جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کے لیے قربانی کی لازوال تاریخ رقم کی۔

جنرل شاہ نواز 24 جنوری 1914 کو موضع متور کے ایک معزز مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے، جس کے زیادہ تر افراد فوج میں تھے۔آزادی سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی یہ علاقہ فوجی خدمات کے لیے مشہور رہا ہے۔ان کے والد بھی ایک فوجی افسر تھے انھوں نے 30 برس تک برطانوی فوج میں ملازمت کی تھی۔ خاندانی روایت کے مطابق انھیں بھی پرنس آف ویلز رائل انڈین ملیٹری کالج دہرادون میں داخل کرایا گیا۔ 1937 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستانی برٹش فوج میں کمیشن ملا اور 14 ویں پنجاب رجمنٹ کی پہلی بٹالین میں تعینات ہوئے۔دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوج جاپانیوں سے سنگاپور میں لڑ رہی تھی۔اس میں شاہ نواز خاں بھی شامل تھے۔ 1924 کو برطانوی فوج ہار گئی اور بڑی تعداد میں ہندوستانی سپاہی جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ نیتا جی اس وقت سنگاپور میں تھے۔انھوں نے جاپان کے زیر حراست ہندوستانی سپاہیوں کو ملک کی آزادی کی راہ پر لانے کا تاریخ ساز فیصلہ کیا۔یہیں پر انھوں نے ہندوستانیوں کو آواز دی: ''تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دوں گا۔''

جنرل شاہنواز خاں نیتا جی کی شخصیت سے پہلے ہی سے بے حد متاثر تھے۔جس دن نیتا جی نے عارضی آزاد حکومت تشکیل دی۔شاہنواز خاں ملک کی آزادی کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے مضبوط ارادے کے ساتھ ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔کوہیما کی آخری لڑائی کے بعد اگرچہ آزاد ہند فوج کو پوری طرح شکست ہو گئی لیکن ان جانباز ہندوستانی مجاہدین آزادی پر چلائے گئے مقدموں نے عوام کے جذبہ آزادی میں غیر معمولی جوش اور غم وغصہ بھر دیا۔جس کے اثرات تحریک آزادی کو تیزی سے آگے بڑھانے میں سازگار ثابت ہوئے اور آزادی کی تحریک میں غیر معمولی ڈرامائی تبدیلی آئی۔

ان مقدمات میں سب سے خاص اور تاریخی مقدمہ لال قلعے میں چلایا گیا۔یہ جنرل شاہنواز خاں، کیپٹن گروبخش سنگھ اور کیپٹن پریم کمار سہگل کا مقدمہ تھا، جس میں ان لوگوں پر حکومت وقت سے بغاوت، جنگ اور برطانوی پولیس اور فوج کے لوگوں کی ہلاکت کا الزام عائد کیا گیا تھا اور تینوں کو تاحیات کالے پانی کی سزا ہو گئی، جس کے خلاف پورے ملک میں غم وغصے کا طوفان برپا ہو گیا۔ برطانوی حکومت بری طرح خوفزدہ ہو گئی اور تینوں کو رہا کرنا پڑا۔شاہنواز خاں قومی یک جہتی کے زبردست حامی تھے انھیں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان سے بے حد محبت تھی۔ان کے ساتھ مل کر انھوں نے 'انسانی برادری' کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کے ارکان نے ہندو پاک کے لاتعداد مسلم، ہندو اور سکھ خواتین کو آزاد کرایا۔

شاہنواز کی شخصیت انسانی خوبیوں کا جیتا جاگتا مجسمہ تھی۔وہ طویل مدت تک حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔مشرق وسطیٰ میں حکومت ہند کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔انھیں پورے حکومتی نظام میں با اثر رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔مرحومہ اندرا گاندھی نے جنرل شاہنواز کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''انھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں حب الوطنی، صداقت اور انسان دوستی کی اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔''

(فخر وطن: مسلم مجاہدین آزادی کے لازوال کارنامے، فاروق ارگلی، 2011، ایس ایف آفسیٹ پرنٹر پٹودی ہاؤس، نئی دہلی، ص 477)

■

Dr. Abdussalam Siddiqui
E-235/2 Third Floor, L/S, Shaheen Bagh
Abul Fazal Enclave Part-2 Okhla,
New Delhi- 110025
Mob.: 9999603981

سجاد رشید

تحریک آزادی اور اردو شاعری

اردو شاعری میں قومیت، حب الوطنی اور سیاسی حقوق کا احساس اسی وقت سے بیدار ہونے لگا جب 1857 کے بعد ہندوستان کے سیاسی اور معاشی زوال کی تصدیق ہوگئی اور ہندوستان پر برطانیہ کا باضابطہ تسلط تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن اس کا گہرا اور سودمند اثر بیسویں صدی کی شاعری (آزادی تک) میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو شاعری پر قومی اور سیاسی تحریکوں کا گہرا اثر پڑنے لگا تھا اور جدوجہد آزادی کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے میں اردو شاعری خاطر خواہ حصہ لے رہی تھی لیکن اردو شاعری کے محاذ پر حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو حسن وعشق کے مروجہ مضامین کے بجائے سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کی غزلوں میں ملک اور قوم کا درد اور آزادی وطن کی خواہش موجود ہے۔

مولانا حالی کی اس روایت کا اثر ان کے بعد آنے والی نسل کے شاعروں خاص طور سے اقبال پر بہت گہرا پڑا ہے۔ جن سے آگے چل کر ترقی پسندوں نے بھی اثر قبول کیا۔ اقبال ہندوستان کی آزادی کے سچے خواہاں تھے۔ معاشی انقلاب اور مزدور و سرمایہ دار کے تعلقات کا مطالعہ اقبال نے بہت باریک بینی سے کیا ہے لیکن اصل انقلاب وہ صرف معاشی انقلاب کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ ایک ایسے انقلاب کے مرید ہیں جو معاشی ہی نہیں وجدانی بھی ہو۔ جس سے انسان کا باطن آزاد ہو کیونکہ اصل آزادی تو اندرون کی آزادی ہے۔ اسی لیے اقبال کے یہاں خودی یا اپنے آپ کو پہچاننے پر بہت زور ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

انھیں ہمیشہ اپنے ملک کی آزادی کا یقین تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ساری دنیا پر اب عوام کی حکومت ہوگی۔ اسی لیے وہ مزدوروں کو پیغام دیتے ہیں کہ اٹھو اور منظم ہو جاؤ کیونکہ مشرق و مغرب میں اب تمھارے ہی دور کا آغاز ہونے والا ہے۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اس دور کے ممتاز شاعروں میں جوش ملیح آبادی بھی قابل ذکر ہیں۔ جوش بنیادی طور پر ایک رومان پسند شاعر تھے لیکن جہاں جذبہ آزادی اور حب الوطنی کا ذکر ان کی شاعری میں آیا ہے وہاں ان کا انقلابی رنگ بھی بہت گہرا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اردو شاعری کو سیاسی انقلاب کا تصور اقبال نے دیا تو جوش نے اسے انقلابی آہنگ عطا کیا۔ جوش کی شاعری میں انقلاب کی لے بہت تیز ہے جس کا رنگ ان کی غزلوں سے زیادہ گہرا ان کی نظموں میں نظر آتا ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں
(نظم شکستہ زنداں کا خواب)

انگریزوں کے خلاف جوش کا تیور ان کی نظم ''نعرہ شباب'' میں دیکھنے کے لائق ہے۔

دیکھ کر میرے جنوں کو نازفرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے
تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں!

پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے برق کے مانند لہراتا ہوا
موت کے سایے میں رہ کر، موت پر چھایا ہوا
کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش کی طرح اختر شیرانی بھی ایک رومان پسند شاعر تھے اور اردو کی رومانی شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ لیکن وہ لیلیٰ آزادی کے عاشقوں میں بھی تھے اور جذبہ حب الوطنی ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے تھی کہ وہ بعض اوقات سلمٰی کے عشق سے زیادہ نگار آزادی کے دلدادہ نظر آتے تھے۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

ان کے علاوہ چکبست، حسرت موہانی، صفی لکھنوی اور سیماب وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں بالواسطہ یا بلا واسطہ وطنی جذبات کا اظہار کیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر اس دور کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے بسمل عظیم آبادی کی اس غزل کا ذکر نہ کیا جائے جو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھی اور جو آج ہندوستان کی آزادی اور انقلاب کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اس غزل کے ایک ایک شعر میں جو انقلابی آہنگ ہے اور جس طرح سے جذبہ آزادی اور انقلاب کو محبوب بنا کر پیش کیا گیا ہے وہ ملاحظہ کریں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اے شہید ملک و ملت میں ترے اوپر نثار
لے تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
آج پھر مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار
آئیں وہ شوق شہادت جن کے جن کے دل میں ہے
مرنے والو آؤ اب گردن کٹاؤ شوق سے
یہ غنیمت وقت ہے خنجر کف قاتل میں ہے
وقت آنے دے دکھا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیوں بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دل بسمل میں ہے

آزادی وطن کا مطالبہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ہونے لگا تھا۔ کیونکہ حکمران طبقے کے جبرو استبداد کے روبرو براہِ راست اظہار خطرے کا باعث تھا البتہ علامتوں کے استعمال کے لیے ماحول ہنوز سازگار تھا۔ اس میں قفس، آشیاں، نشیمن، گلستاں، صیاد اور بلبل جیسی علامات نئی معنویت کے ساتھ بڑی کثرت سے غزل میں استعمال ہوئیں۔

رودادِ چمن اس طرح سنتا ہوں قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

(اصغر گونڈوی)

تعلقات چمن قطع کر رہی ہے صبا
قفس پہ گرتے ہیں تنکے میرے نشیمن کے

(آرزو)

ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نوجوان شعرا کا کلام سب سے پہلے حیات اللہ انصاری کے ہفتہ وار 'ہندوستان' کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ ابتدائی دور کی کچھ نظمیں

"آزادی وطن کا مطالبہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ہونے لگا تھا، کیونکہ حکمران طبقے کے جبرو استبداد کے روبرو براہِ راست اظہار خطرے کا باعث تھا البتہ علامتوں کے استعمال کے لیے ماحول ہنوز سازگار تھا، اس میں قفس، آشیاں، نشیمن، گلستاں، صیاد اور بلبل جیسی علامات نئی معنویت کے ساتھ بڑی کثرت سے غزل میں استعمال ہوئیں ۔"

نوجوانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر شمیم کرہانی کی نظم کے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں جن میں وہ انقلاب کے نشے میں سرشار ہیں اور بڑی قربانی دینے کو اتاؤلے۔

طوفان میں کشتی کھیتے ہیں، کوہسار سے ٹکر لیتے ہیں
ہم جنگ میں سر دیتے ہیں ہم پاؤں ہٹانا کیا جانیں
وہ حسن و جوانی کی راتیں، وہ کیف و ترنم کی باتیں
وہ لعل و گوہر کی برساتیں، ہم لوگ منانا کیا جانیں
بے خوف چلے سنگینوں پر، اور روک لی گولی سینوں پر
لکھا ہے ہماری جبینوں پر، ہم سر کو جھکانا کیا جانیں

(قومی سپاہی کا گیت)

انقلاب و آزادی اور سرفروشی کی تپش سلام مچھلی شہری کے کلام میں دیکھیے۔

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی اس کو غلام آباد میں، میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسن جنت زار سے لیکن
ابھی تاب نشاطِ رقص محفل لا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں پازیب کی جھنکار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کے آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو

(مجبوریاں)

خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق اس دور کے شعرا محبوب کے وجود کے ضرور قائل رہے لیکن عام طور پر محبوب سے یہ معذرت کی جاتی ہے کی جنگ آزادی کے دور میں وہ اس کی محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری کی نظم 'انتظار نہ کر' کے ایک ٹکڑے کو دیکھیں۔

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

مجاز، مخدوم، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور فیض احمد فیض جیسے شعرا کے مختلف کلام ملتے ہیں جن کو عشقیہ شاعری کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب تحریک کا آغاز ہوا تو یہ شعرا شعوری طور پر عشقیہ شاعری کرنے سے گریز کرنے لگے اور اپنے معشوق سے معذرت کر لی۔ کیونکہ یہ بدلتے ہوئے وقت کا تقاضا تھا کہ عشق و عاشقی پر سماجی ذمے داری کو فوقیت دی جائے۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور "چند روز اور مری جان" قابلِ ذکر ہیں۔

ساحر، مجاز، سردار جعفری، مجروح، مخدوم محی الدین وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں آزادی اور انقلاب کی آواز بلند کی اور اعلان جنگ کیا۔ مجاز کی انقلابی شاعری میں جذبہ آزادی والہانہ طور پر سامنے آتا ہے۔ انھیں 'انقلاب کا مطرب' کہا جاتا ہے۔ ان کی انقلابی شاعری کی بہترین مثالیں ان کی نظموں انقلاب، مطرب سے، مزدور، ہمارا جھنڈا، نوجوان خاتون سے خطاب وغیرہ میں ملتی ہیں۔ 'نوجوان خاتون سے خطاب' ایک ولولہ خیز نظم ہے جس میں عورتوں کو موضوع بنا کر انھیں تحریک آزادی کی مہم میں

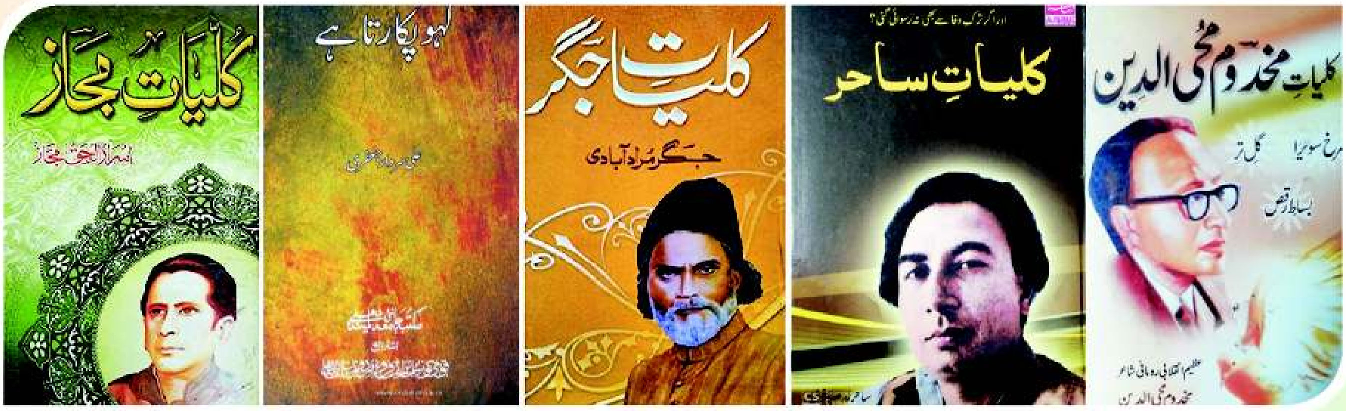

حصہ لینے کے لیے آمادہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس نظم کے آخری چار مصرعے ملاحظہ ہوں۔

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جذبی نے بھی بیرونی سامراج کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے ہم وطنوں کو انقلاب کا پیغام دیا۔

شریک محفل دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہل کفن کچھ اور بھی ہیں
خاموش ہو کیوں نالہ کشان شب ہجراں
یہ تیرہ شبی آج بھی کچھ کم تو نہیں ہے

سردار جعفری نے انقلابی شاعری کو نئی توانائی دی اور اسے ایک نئے رخ سے آشنا کیا۔ اردو کی انقلابی شاعری میں ان کی نظم 'نئی دنیا کو سلام' اور 'ایشیا جاگ اٹھا' سب سے بھرپور اور صحیح نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں میں سوز و گداز کے بجائے جاہ و جلال ہے اور وہ باعمل اور متحرک انسانیت کی انقلابی جدوجہد کو پیش کرتے ہیں۔

مخدوم نے بھی بعض کامیاب انقلابی نظمیں کہی ہیں اور انھوں نے بھی انقلاب کے تصور کو ایک خوبصورت محبوب بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں تو انقلاب کی لے زیادہ تیز نہیں ہے لیکن جیسے جیسے مخدوم کا رشتہ محنت کشوں اور مزدوروں سے ہوتا گیا ان کی شاعری میں انقلاب کی دھار تیز ہوتی گئی جو عوام کے جذبات کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اوپر جن شعرا کا ذکر ہوا ان میں سے فیض اور کسی حد تک جذبی کو چھوڑ کر زیادہ تر شعرا کی پہچان نظم گو شاعر کی حیثیت سے ہے۔ دراصل حالی اور اقبال نے اردو شاعری کا جو رُخ غزل سے نظم کی طرف موڑا تھا اس روایت کو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اور بھی فروغ حاصل ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے نظم کو زیادہ متاثر کیا غزل کو کم۔ لیکن غزل بھی دھیرے دھیرے پنپتی رہی۔ یہاں پر ان دو شعرا کا ذکر خاص طور سے کرنا ضروری ہے جنھوں نے اس دور میں بھی جب ہر طرف نظم کا بول بالا تھا، خالص غزلیں کہی ہیں اور اس طرح غزل کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ شعرا ہیں جگر مرادآبادی اور مجروح سلطان پوری۔

جگر نے اس پرآشوب دور میں غزل کو نئی تب و تاب دی، وہ مکمل طور سے ایک غنائی شاعر ہیں۔ ملک کی بیداری اور حکومت کے ظلم و جبر کا احساس ان کے اشعار میں بے پایاں سرشاری کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔

> **ساحر، مجاز، سردار جعفری، مجروح، مخدوم محی الدین وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں آزادی اور انقلاب کی آواز بلند کی اور اعلان جنگ کیا۔ مجاز کی انقلابی شاعری میں جذبہ آزادی والہانہ طور پر سامنے آتا ہے۔ انھیں 'انقلاب کا مطرب' کہا جاتا ہے۔ ان کی انقلابی شاعری کی بہترین مثالیں ان کی نظموں انقلاب، مطرب سے، مزدور، ہمارا جھنڈا، نوجوان خاتون سے خطاب وغیرہ میں ملتی ہیں۔**

یہ خون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں
آسودہ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

مجروح سلطان پوری نے بھی صرف غزلیں کہی ہیں۔ ان کا مجموعہ بھی 'غزل' کے نام سے ہی شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں انقلاب اور آزادی کے تصور کو نہایت حسین پیرایے میں پیش کیا ہے۔

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلانِ بہاراں ہونا تھا
مجروح اٹھی ہے موج صبا آثار لیے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اس دور میں سرخ سویرا یا سرخ رنگ اشتراکی نظام حیات کا مترادف بن گیا تھا۔ اسیری کے دوران کہی گئی فیض کی تمام غزلوں میں قید و بند کے خلاف احتجاج اور اشتراکیت کو معشوق کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مجروح بھی دوسرے شعرا کی طرح شمع سرخ کے پروانے ہیں۔

وہی مجروح سمجھتے تھے جسے آوارۂ ظلمت
وہی ہے ایک شمع سرخ کا پروانہ برسوں سے
شراب لال، شفق لال، جام و مینا لال
میری حیات کا ماحول ارغوانی ہے

ترقی پسند شعرا میں سے اکثر مقصدیت کے جوش میں اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ انھوں نے ادب کو پروپیگنڈا کی سطح تک پہنچا دیا اور ترقی پسند شاعری کا بڑا حصہ وقتی اور ہنگامی ہو کر رہ گیا۔ یہاں پر صرف انھیں شعرا کے اشعار پیش کیے گئے ہیں جنھوں نے ادب کی ادبیت کو برقرار رکھا اور علامتوں اور استعاروں کے استعمال سے انقلاب اور آزادی کے تصور کو حسین پیرائے میں پیش کیا ہے۔

اس دور میں جذبہ آزادی کی ترجمانی صرف ترقی پسند شعرا تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اردو کے بعض دوسرے شعرا جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے، وہ بھی وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے حب الوطنی کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ ان شعرا میں خاص طور سے جگت موہن لال رواں، برق دہلوی، اثر لکھنوی، تلوک چند محروم، افسر میرٹھی اور حفیظ جالندھری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Sajjad Rasheed
Lecturer Degree College
Hajan-193501 (J & K)

سوامی ویویکانند کے تعلیمی افکار

آفاق ندیم خان

سوامی وویکانند کی پیدائش 12، جنوری 1863 کو کلکتہ میں ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کا مستقبل نوجوانوں پر منحصر ہے۔ صحت منداور تعلیم یافتہ نوجوانوں سے نہ صرف ملک کی ترقی ہوگی بلکہ یہ ترقی صحیح سمت میں ہوگی۔ ملک کے نوجوانوں کو صحیح رہنمائی فراہم کرنے کے لیے سوامی ویوکانند کے یوم پیدائش کے موقع پر ہر سال 12 جنوری کو قومی یوم نوجوان منایا جاتا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو کردار سازی پر ابھارا اور کہا کہ عظیم بننے کے لیے شک، لالچ اور حسد چھوڑنا ہوگا۔ انھوں نے نوجوانوں کی کرادر سازی کے پانچ سوتر (خود اعتمادی، ایثاروقربانی، ضبط نفس، خودانحصاری اور خودآگہی) بتائے۔ رویندرناتھ ٹیگور کہتے ہیں کہ ''اگر آپ بھارت کو جاننا چاہتے ہیں تو سوامی ویویکانند کو پڑھیے۔ ان میں آپ سب کچھ مثبت ہی پائیں گے، منفی کچھ بھی نہیں۔'' سوامی ویویکانند نے اپنے استاد رام کرشن پرم ہنس کی تعلیمات کی تشہیر کے لیے 'رام کرشن مشن' قائم کیا اور جدید عالمی تناظر میں مختلف قدیم ہندو صحیفوں کی تشریحسیں کیں۔ یوگا کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ویدانت کی تشہیر کے ساتھ تعلیم کی تشہیر میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سوامی ویویکانند ملک کے لوگوں کی تعلیمی پسماندگی اور غربت سے بہت فکرمند تھے اس لیے تعلیم کی اہمیت پرزور دیتے تھے۔

سوامی ویویکانند تعلیم کے ذریعے انسانوں کو دنیاوی اور اخروی دونوں جہانوں کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک ہم ماڈی طور پر خوش نہ ہوں تب تک علم، عمل، عبادت اور یوگا یہ سب تخیلاتی اشیا ہیں۔ دنیاوی نقطہ نظر سے انھوں نے نعرہ دیا کہ 'ہمیں ایسی تعلیم چاہیے جس کے ذریعے کردار کی تشکیل ہو، دماغ مضبوط ہو، ذہانت کی نشوونما ہو اور ہر فرد اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔' اس طرح کی تعلیم کو 'انسان کی تعمیر کی تعلیم' کہتے ہیں۔ سوامی ویویکانند انسانی زندگی کا حتمی مقصد فرد کی کاملیت کے احساس کو مانتے تھے۔ اخروی نقطہ نظر سے انھوں نے اعلان کیا کہ ''تعلیم انسان کی کاملیت کا ظہور ہے جو اس کے اندر پہلے سے ہی موجود ہے۔ ان کے مطابق جو تعلیم یہ دونوں کام کرتی ہے وہی حقیقی تعلیم ہے۔''

سوامی ویویکانند انسان کے ماڈی اور روحانی دونوں پہلوؤں کو حقیقی مانتے تھے۔ اس لیے تعلیم کے ذریعے وہ انسانی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کی نشوونما پر زور دیتے تھے۔ جو تعلیم یہ دونوں کام کرے اسے سوامی ویویکانند 'انسان کی تعمیر کی تعلیم' کہتے تھے۔

جسمانی نشوونما: سوامی ویویکانند ماڈی زندگی کے تحفظ اور اس کی ضروریات کی تکمیل اور خودشناسی دونوں کے لیے صحت مند جسم کی ضرورت کو سمجھتے تھے۔ ماڈی نقطہ نظر سے انھوں نے کہا کہ اس وقت ہمیں ایسے طاقتور لوگوں کی ضرورت ہے جن کے اعضا لوہے کی طرح مضبوط ہوں اور اعصاب فولاد کی طرح سخت ہوں۔ خود شناسی کے لیے انھوں نے گیان یوگ، کرم یوگ، بھکتی یوگ اور راج یوگ کو ضروری بتایا اور ان میں سے کسی بھی قسم کے یوگ کے لیے صحت مند جسم کی ضرورت کو واضح کیا۔ ان کے مطابق تعلیم کے ذریعے سب سے پہلے انسان کی جسمانی نشوونما ہی کی جانی چاہیے۔

ذہانت اور دانشمندی کی نشوونما: سوامی ویویکانند ملک کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ اس کی ذہنی پسماندگی کو مانتے تھے۔ انھوں نے زور دیا کہ ہمیں اپنے بچوں کی ذہنی نشوونما کرنی چاہیے، انھیں جدید علوم سے متعارف کرانا چاہیے۔ جہاں سے جو بھی اچھا علم اور مہارت ملے اسے حاصل کرنا چاہیے اور بچوں کو دنیا کے سامنے خود اعتمادی کے ساتھ کھڑے ہونے کی طاقت فراہم کرنی چاہیے۔

سماجی خدمات کے جذبے کی نشوونما: سوامی ویویکانند نے واضح الفاظ میں کہا کہ پڑھنے لکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا ہی بھلا کیا جائے۔ انسان کو پڑھنے لکھنے کے بعد نوع انسانی کی فلاح وبہبود کرنا چاہیے۔ انھوں نے ملک کے عوام کی غربت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پڑھے لکھے اور خوشحال لوگ غریب اور لاچار لوگوں کی خدمت کریں، انھیں اونچا اٹھانے کی کوشش کریں، سماجی خدمات کریں۔ سماجی خدمات سے ان کی مراد ہمدردی یا عطیہ نہیں تھی بلکہ سماجی خدمات سے ان کی مراد غریب اور لاچار لوگوں کی ترقی میں معاونت تھی، ترقی تو وہ خود کریں گے۔ سوامی ویویکانند تعلیم کے ذریعے ایسے سماجی مصلحین کا گروہ تیار کرنا چاہتے تھے جو روحانی نقطہ نظر سے سماجی خدمات کو اپنا فرض سمجھیں۔ وہ انسان کو ایشور کا مندر مانتے تھے اور اس کی خدمت کو ایشور کی خدمت مانتے تھے۔

اخلاقی اور کرداری نشوونما: ان کا خیال تھا کہ جسم سے صحت مند، ذہن سے بالغ اور معاشی طور پر خوشحال ہونے کے ساتھ انسان کو باکردار بھی ہونا چاہیے۔ کردار ہی انسان کو سچا اور فرض شناس بناتا ہے، اس لیے انھوں نے تعلیم کے ذریعے انسان کی اخلاقی اور کرداری نشوونما پر زور دیا۔ اخلاقیات سے ان کی مراد سماجی اخلاقیات اور مذہبی اخلاقیات دونوں تھیں اور کرداری نشوونما سے مراد ایسی خودی کی نشوونما تھی جو انسان کو سچائی کے راستے پر چلنے میں معاون ہو اور اسے غلط راستے پر چلنے سے روک سکے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایسے بااخلاق اور باکردار انسانوں سے ہی سماج یا ملک ترقی کر سکتا ہے۔

صنعتی نشو و نما: سوامی ویویکانند نے ملک کے غریب عوام کے جسم سے جھانکتی ہوئی ہڈیوں کو روٹی، کپڑا اور مکان کی طلب کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مغربی ممالک کی خوشحال زندگی کو بھی دیکھا تھا، اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان ممالک نے یہ ماڈی ترقی، سائنس اور ٹکنیک کی ارتقا اور اس کے استعمال سے حاصل کی ہے۔ انھوں نے یہ اعلان کیا کہ صرف روحانی اصولوں سے زندگی نہیں چل سکتی، ہمیں عمل کے ہر شعبے میں آگے آنا چاہیے۔ اس کے لیے تعلیم کے ذریعے انسانوں کو پیداواری مہارت، صنعت اور دیگر حرفت سے متعارف کرانے پر زور دیا تھا۔

قومی یکجہتی اور عالمی اخوت کے جذبات کی نشوونما: سوامی ویویکانند کے زمانے میں ملک انگریزوں کا غلام تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ غلامی احساس کمتری پیدا کرتی ہے اور احساس

کمتری ہی تمام تکالیف کی وجہ ہے۔ اس لیے جب وہ امریکہ سے ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے ملک کی زمین پر پیر رکھتے ہی نوجوانوں سے کہا کہ تمہارا سب سے پہلا کام ملک کو آزاد کرانا ہونا چاہیے اور اس کے لیے جو بھی قربان کرنا پڑے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انھوں نے اس وقت ایسے تعلیمی نظام کے قیام پر زور دیا جو ملک کے لوگوں میں قومی شعور پیدا کرے، انھیں متحد کرے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے آمادہ کرے۔ یہ بات ذہن نشیں کرنے کی ہے کہ سوامی ویویکانند تنگ قومی نظریے کے قطعی طور پر حامی نہیں تھے، بلکہ وہ تمام انسانوں میں پرماتما کا درشن کرتے تھے اور عالمی اخوت میں یقین کرتے تھے۔

مذہبی تعلیم اور روحانی نشوونما: سوامی ویویکانند تعلیم کے ذریعے انسانوں کے ماڈی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر مساوی زور دیتے تھے۔ ان کا واضح خیال تھا کہ انسان کی ماڈی ترقی روحانیت کے پس منظر میں ہونی چاہیے اور اس کی روحانی نشوونما ماڈی ترقی کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب انسان مذہب پر عمل کرے۔ مذہب کو سوامی ویویکانند اس کے وسیع مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب وہ ہے جو انسانوں کو محبت سکھاتا ہے، نفرت سے محفوظ رکھتا ہے، نوع انسانیت کی خدمت کے لیے گامزن کرتا ہے، انسانوں کے استحصال سے حفاظت کرتا ہے اور ماڈی و روحانی دونوں قسم کی نشوونما میں معاون ہوتا ہے۔ ان کا مذہبی فلسفہ دنیا میں یکجہتی کا احساس کراتا ہے اور سب سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔

تعلیم کا نصاب: چونکہ نصاب تعلیمی مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہوتا ہے، اس لیے سوامی ویویکانند نے اپنے طے کردہ تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے ایک وسیع نصاب پیش کیا۔ انھوں نے جسمانی نشوونما کے لیے کھیل کود، ورزش اور یوگ پر زور دیا۔ ذہنی نشوونما کے لیے زبان، فن، موسیقی، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، ریاضی، اور سائنس کو شامل کرنے پر زور دیا۔ زبان کے تعلق سے سوامی ویویکانند کا نظریہ بہت وسیع تھا۔ ان کے خیال میں اپنی عام زندگی کے لیے مادری زبان، مذہب کو سمجھنے کے لیے سنسکرت زبان، ملک کو سمجھنے کے لیے علاقائی زبانیں اور غیر ملکی علوم و تکنیک کو سمجھنے کے لیے انگریزی زبان کا علم بہت ضروری ہے۔ تاریخ کے ضمن میں سوامی ویویکانند ہندوستان اور یورپ دونوں کی تاریخ پڑھانے کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے سے بچوں میں حب الوطنی کے جذبات کی نشوونما ہوگی اور یورپ کی تاریخ پڑھنے سے وہ ماڈی ترقی حاصل کرنے کے لیے متحرک ہوں گے۔ بچوں میں سماجی خدمات کے جذبات کی نشوونما کے لیے تعلیم کی سبھی سطحوں پر سماجی خدمات کو لازمی طور پر نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اخلاقی اور کرداری نشوونما کے لیے مذہب اور اخلاقیات کی تعلیم پر زور دیا۔

طریقہ تدریس: سوامی ویویکانند نے ماڈی علم کے حصول کے لیے تقلیدی، بیانیہ، بحث ومباحثہ، تجرباتی طریقہ تدریس کی اور روحانی علم کے حصول کے لیے خود

سوامی ویویکانند اس زمانے کے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے مشرق کی روحانی عظمت اور مغرب کی ماڈی ترقی دونوں کے امتزاج کی جانب لوگوں کو راغب کیا۔ انھوں نے لوگوں کو اس بات کی جانب متحرک کیا کہ روحانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ماڈی ترقی بھی ضروری ہے اور ان دونوں کے لیے تعلیم اساس فراہم کرتی ہے۔

احتسابی، غور وفکر، دھیان اور یوگ کے طریقوں کی حمایت کی ہے۔ انھوں نے ماڈی اور روحانی علم حاصل کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ یوگ بتایا۔ سوامی ویویکانند یوگ طریقہ تدریس کو ماڈی اور روحانی کسی بھی قسم کا علم حاصل کرنے یا علم کی دریافت کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ مانتے تھے۔ ان کے مطابق ماڈی علم حاصل کرنے کے لیے الپ یوگ (جزوقتی دھیان) ہی کافی ہوتا ہے لیکن روحانی علم کے حصول کے لیے کامل یوگ (طویل مدتی دھیان) کی ضرورت ہوتی ہے۔

انضباط: انسانی زندگی کے خاص طور پر فطری، سماجی اور روحانی تین پہلو ہوتے ہیں۔ سوامی ویویکانند ان تینوں پہلوؤں کو اہمیت دیتے تھے، لیکن سب سے زیادہ اہمیت روحانی پہلو کو دیتے تھے۔ سوامی ویویکانند کے مطابق انضباط کا مطلب ہے اپنے طرز عمل میں روح کے ذریعے متحرک ہونا۔ ان کے مطابق جب انسان اپنی فطری خودی سے متحرک ہو کر عمل کرتا ہے تو ہم اسے منضبط نہیں کہہ سکتے۔ جب وہ اپنی فطری خودی پر کنٹرول رکھ کر سماجی خودی سے متحرک ہوتا ہے تو اسے منضبط کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق ؛درحقیقت منضبط وہ ہے جو روح سے متحرک ہو کر عمل کرتا ہے۔ سوامی ویویکانند معلم اور طلبا دونوں کو ضبط نفس کا حکم دیتے تھے۔ بچوں میں ضبط نفس کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے سوامی ویویکانند کا خیال تھا کہ جب معلم طلبا کے سامنے ضبط نفس کا اعلیٰ معیار پیش کریں گے تو بچے بھی ان کی تقلید کریں گے اور پھر رفتہ رفتہ ویسا ہی سوچنے اور کرنے کی انھیں اندر سے تحریک حاصل ہوگی اور وہ ضبط نفس کی جانب گامزن ہوں گے۔

معلم: سوامی ویویکانند قدیم گروگرِہ نظام کے حامی تھے۔ ان کے خیال میں معلمین کو ماڈی اور روحانی دونوں قسم کا علم ہونا چاہیے، جس سے وہ بچوں کو دنیاوی اور اخروی دونوں زندگی کے لیے تیار کر سکیں۔ سوامی ویویکانند معلمین سے یہ بھی امید کرتے تھے کہ وہ نفسیات کی مدد سے بچوں کے انفرادی تفاوت کو سمجھ کر ان کے مطابق تعلیم کا نظم کریں۔ اس طرح سوامی ویویکانند معلمین کی قدیم اور جدید دونوں ساخت کے حامی تھے۔

متعلم: سوامی ویویکانند کے مطابق ماڈی اور روحانی، کسی بھی طرح کا علم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طلبا 'برہما چاریہ' کی تعمیل کریں۔ ان کا یقین تھا کہ جب تک متعلمین نفس پر قابو نہیں پاتے، ان میں سیکھنے کے لیے شدید خواہش پیدا نہیں ہوگی اور وہ استاد سے عقیدت رکھ کر سچائی کو جاننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی حالت میں وہ روحانی اور ماڈی دونوں علم حاصل نہیں کر سکتے۔ سوامی ویویکانند کے مطابق استاد اور شاگرد کا تعلق صرف دنیاوی ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ روحانی تعلق بھی ہونا چاہیے۔

اسکول: سوامی ویویکانند گروگرِہ نظام کے حامی تھے لیکن جدید تناظر میں ان کا خیال تھا کہ گروگرِہ عوامی شور و غل سے دور فطری ماحول میں قائم کیا جائے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اسکول کا ماحول پاکیزہ ہو اور وہاں جسمانی ورزش، کھیل کود، پڑھنے پڑھانے اور ان سب کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات اور عبادت کا کام بھی انجام دیا جائے۔

الغرض سوامی ویویکانند اس زمانے کے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے مشرق کی روحانی عظمت اور مغرب کی ماڈی ترقی دونوں کے امتزاج کی جانب لوگوں کو راغب کیا۔ انھوں نے لوگوں کو اس بات کی جانب متحرک کیا کہ روحانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ماڈی ترقی بھی ضروری ہے اور ان دونوں کے لیے تعلیم اساس فراہم کرتی ہے۔ انھوں نے یہ اعلان کیا کہ بھارت کے ہر شہری کو تعلیم یافتہ بنایا جائے اور تعلیم کے ذریعے اسے زندگی کے ہر شعبے میں مہارت کے ساتھ عمل کرنے کا اہل بنایا جائے، انھیں خود مختار، خود کفیل، بہادر، باوقار بنایا جائے اور ان سب سے پہلے اسے ایک سچا انسان بنایا جائے جو انسانی خدمت کے ذریعے خود شناسی کے حصول میں کامیاب ہو۔

■

Dr. Afaque Nadeem Khan
(Assistant Professor)
Maulana Azad National Urdu University,
College of Teache Education, Bhopal-462001 (MP)
Mob.: 9981995549
Email.: afaquenadeem@yahoo.com

محمد اکبر القادری

قومی تعلیمی پالیسی 2020

ایک جائزہ

تعلیمی پالیسیاں مقامی، ریاستی اور وفاقی سطح پر بنائی جاتی ہیں۔ یہ پالیسیاں وہ اصول ہوتے ہیں جن کا مقصد تعلیمی اداروں کے طلبا کو موثر، منصفانہ اور محفوظ طریقے سے تدریس میں تعاون کرنا ہے۔ یہ اصول اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ طلبا کو کیسے پڑھایا جائے، انھیں کیا پڑھایا جائے، تعلیمی اداروں کے طلبا اور ان کے عملے کا انتظام کیسے کیا جائے۔ تعلیمی پالیسیاں طلبا کی ہمہ جہت ترقی کی ضامن ہوتی ہیں، اساتذہ اور مینجمنٹ کے لیے ایک گائڈ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اساتذہ کے کردار پر روشنی ڈالنے سے قبل ہم قومی تعلیمی پالیسی 1986 پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی 1986

ہندوستان کی یہ قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں بنائی گئی اور 1992 میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔

اس کا مقصد 14 سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو تعلیم فراہم کرنا اور ہر سطح پر تعلیمی معیار کو بہتر بنانا تھا۔

NEP 1986 کے کچھ بڑے مقاصد یہ تھے

ابتدائی تعلیم کی عالمگیریت: اس پالیسی کا مقصد 14 سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنا تھا۔

تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا: اس پالیسی نے نصاب میں ترمیم کرکے، اساتذہ کی تربیت کو بہتر بنانے اور تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرکے ہر سطح پر تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر زور دیا۔

تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانا: پالیسی نے پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کی اہمیت کو تسلیم کیا، اس کا مقصد طلبا کو وہ ہنر فراہم کرنے کے لیے مرکزی دھارے کی تعلیم کے ساتھ مربوط کرنا تھا جن کی روزگار کی منڈی میں مانگ ہے۔

تعلیم بالغاں: اس پالیسی نے بالغوں کی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا، خاص طور پر خواتین اور پسماندہ گروہوں کے لیے۔

قومی نظام تعلیم: پالیسی کا ایک مقصد ایک قومی نظام تعلیم بنانا تھا جو علاقائی اور ثقافتی تنوع کی اجازت دیتے ہوئے پورے ملک میں تعلیم کے لیے ایک مشترکہ فریم ورک فراہم کرے۔

سائنس کی تعلیم کا فروغ: پالیسی نے ملک کی ترقی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کا مقصد ہر سطح پر سائنس کی تعلیم کو فروغ دینا تھا۔

اساتذہ کی تعلیم و تربیت کو تقویت فراہم کرنا: اس کا ایک مقصد اساتذہ کے تربیتی پروگراموں کو بہتر بنانے اور اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کو فروغ دے کر اساتذہ کی تعلیم کو بہتر بنانا بھی تھا۔

اس تعلیمی پالیسی نے ہندوستانی تعلیمی نظام پر ایک گہری چھاپ چھوڑی اور اس کے بعد کئی اصلاحات کی بنیاد رکھی۔ تاہم، پالیسی کے نفاذ میں سامنے آنے والی کچھ خامیوں اور چیلنجوں کو دور کرنے کے لیے 1992 میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی (NEP)1992 (نظر ثانی شدہ)

یہ قومی تعلیمی پالیسی نظر ثانی کے بعد 1992 میں متعارف کرائی گئی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں قدیم تعلیمی نظام کو تبدیل کرنا تھا۔ پالیسی نے کئی شعبوں پر توجہ مرکوز کی جس میں تعلیم تک رسائی میں اضافہ، تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا اور تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کو فروغ دینا شامل تھے۔

اس پالیسی کا ایک بڑا مقصد 6 سے 14 سال کی عمر کے تمام بچوں کو تعلیم تک رسائی فراہم کرنا تھا۔ اس پالیسی میں نئے اسکول کھولنے، موجودہ اسکولوں کو اپ گریڈ کرنے اور اس عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کی تجویز تھی۔

اس پالیسی کا ایک اور اہم پہلو تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے پر زور دینا تھا۔ اس پالیسی نے ایک نیا نصاب متعارف کروا کر اس کے مقاصد کے حصول کی تجویز پیش کی تھی جو تنقیدی افکار اور مسائل کے حل کرنے کی مہارتوں کی نشوونما پر توجہ مرتکز کرے۔ اس نے اساتذہ کو تدریس کے جدید طریقوں کی تربیت دینے اور انھیں بہتر

امداد اور وسائل فراہم کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔

اس پالیسی نے تعلیم میں ٹیکنالوجی کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا اور اسکولوں میں کمپیوٹر اور دیگر ڈیجیٹل ٹولز کے استعمال کو فروغ دینے کی تجویز پیش کی۔ اس نے اساتذہ اور طلبا کو معلومات اور امداد فراہم کرنے کے لیے ایک نیشنل انفارمیشن سسٹم فار ایجوکیشن قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کی۔

مجموعی طور 1992 کی تعلیمی پالیسی نے ہندوستان میں تعلیمی نظام کو تبدیل کرنے کی ایک پرجوش کوشش کی تھی۔ اگرچہ کسی حد تک اس کے کچھ مقاصد حاصل کر لیے گئے ہیں، مگر ابھی بھی ملک کے تمام بچوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے کے سلسلے میں بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ حالیہ برسوں میں، حکومت ہند نے نئی تعلیمی پالیسی متعارف کروائی ہے، جس کا مقصد ہندوستان میں تعلیمی نظام کو مزید بہتر اور جدید بنانا ہے۔

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی 2020

34 سال کے وقفے کے بعد 2020 میں نئی تعلیمی پالیسی لائی گئی۔ اس قومی تعلیمی پالیسی کا مقصد ہندوستان کے تعلیمی نظام میں تبدیلی و اصلاحات لانا اور ملک کے تعلیمی شعبے کی ترقی کے لیے ایک وژن فراہم کرنا ہے۔

این ای پی 2020 کی کچھ جھلکیاں مندرجہ ذیل ہیں:

اسکول ایجوکیشن: پالیسی اسکولی تعلیم کے 5+3+3+4 ماڈل کی تجویز پیش کرتی ہے، اسے اس طرح نافذ کیا جائے گا:

بنیادی مرحلہ: اسے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پری اسکول یا آنگن واڑی کے 3 سال، اس کے بعد پرائمری اسکول میں کلاس 1 اور 2۔ یہ 8-3 سال کی عمر کے بچوں کا احاطہ کرے گا۔ تعلیم سرگرمی پر مبنی ہوگی۔

تیاری کا مرحلہ: کلاس 3 سے 5، جو 10-8 سال کی عمروں پر محیط ہوگی۔ اس میں آہستہ آہستہ بولنے، پڑھنے، لکھنے، جسمانی تعلیم، زبانیں، آرٹ، سائنس اور ریاضی جیسے مضامین متعارف کرائے جائیں گے۔

مڈل اسٹیج: کلاس 6 سے 8، جس میں 11 اور 13 سال کی عمر کے بچوں کا احاطہ کیا جائے گا۔ یہ طلبا کو ریاضی، سائنس، سماجی علوم، آرٹس اور انسانیات کے مضامین میں مزید تجریدی تصورات سے متعارف کرائے گا۔

ثانوی مرحلہ: کلاس 9 سے 12، جس میں 18-14 سال کی عمر ہوتی ہے۔ اسے دوبارہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: کلاس 9 اور 10 پہلے مرحلے کا احاطہ کرتی ہیں جبکہ کلاس 11 اور 12 دوسرے مرحلے کا احاطہ کرتی ہیں۔

نصاب اور تدریس: این ای پی 2020 ایک نئے اور لچکدار نصاب کے فریم ورک کی تجویز پیش کرتی ہے جس میں کثیر المضامین اور جامع تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ پالیسی ٹیکنالوجی کے استعمال، تجربات پر مبنی اکتساب اور پیشہ ورانہ تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم: پالیسی کا مقصد 2035 تک اعلیٰ تعلیم میں مجموعی اندراج کا تناسب 50% تک بڑھانا ہے۔ اس قومی تعلیمی پالیسی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک واحد ریگولیٹری ادارہ قائم کرنے اور پیشہ ورانہ تعلیم کو مرکزی دھارے کی تعلیم میں ضم کرنے کی تجویز ہے۔

تعلیم اساتذہ: یہ پالیسی اساتذہ کی اعلیٰ معیاری تعلیم اور اساتذہ

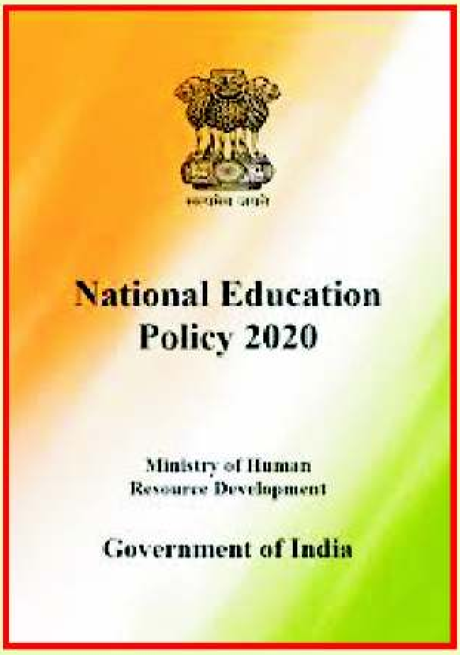

کی مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

مساوات اور شمولیت: اس قومی تعلیمی پالیسی کا مقصد پسماندہ گروہوں کو تعلیم فراہم کرکے، صنفی حساسیت کو فروغ دینا اور رکاوٹوں سے پاک اور جامع تعلیمی ماحول پیدا کرکے تعلیم میں مساوات اور شمولیت کو فروغ دینا ہے۔

تحقیق اور اختراع: یہ پالیسی تعلیم میں تحقیق اور اختراع کی اہمیت پر زور دیتی ہے اور اس کا مقصد تحقیق پر مبنی تعلیمی نظام تشکیل دینا ہے۔

گورننس اور فنڈنگ: این ای پی 2020 تعلیم کے شعبے کی بہتر کارکردگی کے لیے ایک نیشنل ایجوکیشن کمیشن اور ایک اسٹیٹ اسکول اسٹینڈرڈ اتھارٹی قائم کرنے کی تجویز کرتی ہے۔ اس پالیسی میں تعلیم کے لیے فنڈز میں اضافے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے، جس کا مقصد تعلیم میں عوامی سرمایہ کاری کو جی ڈی پی کے 6% تک بڑھانا ہے۔

الغرض، این ای پی 2020 کا مقصد ہندوستان کے تعلیمی نظام کو تبدیل کرنا اور اسے مزید مفید، جامع اور عالمی سطح پر مسابقتی بنانا ہے۔

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی 1986 اور 2020 کے درمیان فرق

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی 1986، 1947 میں آزادی کے بعد ہندوستان میں تعلیم پر پہلی بڑی پالیسی تھی۔ اس کا مقصد ملک میں پرائمری سے اعلیٰ تعلیم تک ایک فریم ورک فراہم کرنا تھا۔ 2020 میں حکومت ہند نے 1986 کی پالیسی کو تبدیل کرنے کے لیے ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا۔ دونوں پالیسیوں کے درمیان بنیادی اختلافات درج ذیل ہیں:

ابتدائی بچپن کی تعلیم پر مرتکز: نئی تعلیمی پالیسی 2020 زندگی بھر سیکھنے کی مضبوط بنیاد کو فروغ دینے کے مقصد کے ساتھ ابتدائی بچپن کی تعلیم اور دیکھ بھال پر زور دیتی ہے۔ پالیسی میں اسکول کے نصاب کے لیے 5+3+3+4 کا نیا ڈھانچہ تجویز کیا گیا ہے، جہاں پہلے پانچ سال بنیادی تعلیم کے لیے وقف کیے جائیں گے، اس کے بعد تین سال ابتدائی مرحلہ، تین سال مڈل اسٹیج اور چار سال سیکنڈری کے لیے ہوں گے۔

ٹیکنالوجی کا استعمال: نئی تعلیمی پالیسی 2020 سیکھنے کے نتائج کو بڑھانے اور تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کے لیے آن لائن اور ڈیجیٹل وسائل سمیت تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کو آسان بنانے کے لیے ایک قومی تعلیمی ٹیکنالوجی پلیٹ فارم بنانے کی بھی تجویز پیش کرتی ہے۔

کثیر المضامین نقطہ نظر: نئی تعلیمی پالیسی تعلیم کے لیے کثیر المضامین نقطہ نظر کی وکالت کرتی ہے، جس سے طلبا کو مختلف سلسلوں سے مضامین کا انتخاب کرنے اور انھیں ایک لچکدار نصاب میں یکجا کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ یہ کریڈٹ پر مبنی نظام کی تشکیل کی تجویز بھی پیش کرتی ہے جہاں طلبا تمام مضامین کے کورسز کے لیے کریڈٹ حاصل کر سکتے ہیں۔

پیشہ ورانہ تعلیم: نئی تعلیمی پالیسی پیشہ ورانہ تعلیم اور ہنر کی ترقی کی ضرورت پر زور دیتی ہے، جس کا مقصد طلبا کو افرادی قوت میں داخل ہونے اور ملکی معیشت میں حصہ ڈالنے کے لیے ضروری ہنر اور علم فراہم کرنا ہے۔

تحقیق پر توجہ: نئی تعلیمی پالیسی علم کی تخلیق اور کاروباری

صلاحیت کو فروغ دینے کے مقصد کے ساتھ تعلیم میں تحقیق اور اختراع کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ یہ تمام شعبوں میں تحقیق کی حمایت کے لیے نیشنل ریسرچ فاؤنڈیشن کے قیام کی تجویز پیش کرتی ہے۔

الغرض، نئی تعلیمی پالیسی، 1986 کی پالیسی سے زیادہ جامع اور بصیرت مندانہ ہے، جس میں تعلیم کی تجدید اور 21ویں صدی کے چیلنجوں کے لیے طلبا کو تیار کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو نافذ کرنے کی حکمت عملی

اس پالیسی کو نافذ کرنے کے لیے ایک کثیر الجہتی حکمت عملی کی ضرورت ہوگی جس میں مختلف اسٹیک ہولڈرز اور مختلف سطحوں پر کام کرنیوالے شامل ہوں گے۔ یہاں کچھ اہم حکمت عملیاں مندرجہ ذیل ہیں:

آگاہی اور اسٹیک ہولڈرز کی شمولیت: این ای پی 2020 کو نافذ کرنے کا ایک اہم پہلو اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ تمام اسٹیک ہولڈرز پالیسی کے وژن، اہداف اور مقاصد سے واقف ہوں۔ اس میں طلبا، والدین، اساتذہ، تعلیمی منتظمین اور پالیسی ساز سبھی شامل ہیں۔ حکومت پالیسی کے بارے میں معلومات پھیلانے کے لیے آگاہی مہم، ورکشاپس اور تربیتی پروگرام منعقد کرسکتی ہے۔

ضروری قابلیتوں کا حصول: این ای پی 2020 تعلیمی نظام میں بڑی تبدیلی کی داعی ہے، جس کے لیے اساتذہ اور تعلیمی منتظمین کو نئی مہارتیں اور قابلیتیں حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ حکومت صلاحیت سازی اور تربیتی پروگراموں میں سرمایہ کاری کرسکتی ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ تعلیمی افرادی قوت، پالیسی کو مؤثر طریقے سے نافذ کرنے کے لیے مستعد ہے۔

نصاب اور تدریس: این ای پی 2020 ایک نئے نصاب اور تدریسی طریقہ کار کی تجویز کرتی ہے جو جامع، کثیر الشعبہ اور تجرباتی تعلیم پر مرکوز ہو۔ اس کو نافذ کرنے کے لیے، حکومت نئی نصابی کتابیں، اساتذہ کے لیے رہنما اور تشخیصی ٹولز تیار کرسکتی ہے جو پالیسی کے نقطہ نظر کے مطابق ہوں۔

انفراسٹرکچر اور ٹیکنالوجی: این ای پی 2020 کو لاگو کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچے میں بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی، بشمول اسکولوں اور کالجوں میں مناسب فزیکل اور ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کی فراہمی کے۔ حکومتیں تعلیم تک رسائی، معیار اور ماحول کو بہتر بنانے کے لیے ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھاسکتی ہیں۔

نگرانی اور تشخیص: این ای پی 2020 کے نفاذ کی نگرانی اور جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ یہ اپنے مقاصد کو حاصل کر رہی ہے یا نہیں؟ حکومت ایک مضبوط نگرانی اور تشخیص کا فریم ورک ترتیب دے سکتی ہے جس میں طلبا کے سیکھنے کے نتائج، اساتذہ کی کارکردگی اور اسکول/کالج کے بنیادی ڈھانچے کا باقاعدہ جائزہ شامل ہے۔

مجموعی طور پر، این ای پی 2020 کو نافذ کرنے کے لیے حکومت، تعلیمی اداروں، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور نجی شعبے کے کارکنوں سمیت تمام اسٹیک ہولڈرز کی جانب سے مربوط اور باہمی تعاون کی ضرورت ہوگی۔

ہندوستان کی نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں استاد کے کردار میں تبدیلیاں

اساتذہ نہایت قابل احترام ہیں کیونکہ زندگیوں کو

این ای پی 2020 کے نفاذ کی نگرانی اور جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ یہ اپنے مقاصد کو حاصل کر رہی ہے یانہیں؟ حکومت ا یک مضبوط نگرانی اور تشخیص کا فریم ورک ترتیب دے سکتی ہے جس میں طلبا کے سیکھنے کے نتائج، اساتذہ کی کارکردگی اور اسکول/کالج کے بنیادی ڈھانچے کا باقاعدہ جائزہ شامل ہے۔

بدلتے ہیں، طلبا کی خفیہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں، خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرتے ہیں اور انسانی صلاحیت کے حدود کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک استاد کا کام معاشرے کی ارتقا کے لیے بچوں کو تعلیم دینا اور ان کی عمدہ پرورش کرنا ہے۔

قدیم دور میں اساتذہ کو ایک مخصوص نصاب دے دیا جاتا تھا جس پر عمل کیا جاتا اور اس بارے میں ہدایات دی جاتیں کہ نصاب کیسے پڑھایا جائے۔

آج اساتذہ کا کردار تدریس سے بالاتر ہو چکا ہے۔

ان کے کردار میں اب طلبا کو مشورہ دینا، طلبا کی رہنمائی کرنا اور انھیں اپنی زندگی میں تعلیم کا استعمال اور اس کے اطلاق کرنے کے طریقے سکھانا شامل ہیں۔

اساتذہ اب طلبا کو ایک مختلف سطح پر متاثر کرنے کے طریقے تلاش کر رہے ہیں اور یہاں تک کہ انھیں زیادہ بننے اور زیادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 تعلیمی نظام میں ایک اہم تبدیلی کا تصور پیش کرتی ہے، اور اس تبدیلی میں استاد کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اساتذہ کے کردار میں کچھ متوقع تبدیلیاں درج ذیل ہیں:

ہمہ گیر ترقی: اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ طلبا کی مجموعی ترقی پر توجہ مرکوز کریں، جس میں ان کی علمی، جذباتی، جسمانی اور سماجی بہبود شامل ہے۔ اس کے لیے انھیں موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے روایتی کردار سے آگے بڑھنے اور تدریس کے لیے زیادہ جامع انداز اپنانے کی ضرورت ہوگی۔

سہولت اور رہنمائی: اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صرف لیکچر دینے کے بجائے سہولت کار اور سرپرست کے طور پر کام کریں۔ انھیں ایک ایسا ماحول بنانا چاہیے جو طلبا میں تخلیقی صلاحیتوں، تجسس اور تنقیدی فکر کو فروغ دے اور انھیں حصول تعلیم کی ترغیب دے۔

کثیر المضامین نقطہ نظر: اس تعلیمی پالیسی میں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ تدریس کے لیے ایک کثیر المضامین نقطہ نظر اپنائیں جو مختلف شعبوں کو مربوط کرتا ہے اور تصورات کی گہری سمجھ کو فروغ دیتا ہے۔

ڈیجیٹل خواندگی: تعلیم میں ٹکنالوجی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے ساتھ اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ڈیجیٹل طور پر خواندہ ہوں گے اور اپنی تعلیم واکتسابی قوت کو بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال میں ماہر ہوں گے۔

سلسلہ وار پیشہ ورانہ ترقی: این ای پی 2020 تعلیمی نظام کی بدلتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ اس میں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے علم اور مہارت کو بڑھانے کے لیے تربیتی پروگراموں، ورکشاپس، اور اکتساب کے دیگر مواقع میں حصہ لیں۔

مقامی سیاق وسباق: اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کمیونٹیز کے مقامی ماحول اور ثقافت سے واقف ہوں جن کی وہ خدمت کرتے ہیں۔ اس سے انھیں ماحول کے مطابق سیکھنے کی حکمت عملی تیار کرنے میں مدد ملے گی اور سیکھنے کا ایک زیادہ جامع اور مساوی ماحول پیدا ہوگا۔

■

Dr. Mohammad Akbarul Qadri
Assistant Professor
Al-Hassan Teachers Training College
P.O: Chakbahauddin, Dalsinghsarai
Samastipur- 848114
Mob.:8885485920

علامہ سحر عشق آبادی کا ادبی سحر

اسلم جمشید پوری

میرٹھ جن ادبا اور شعرا کے حوالے سے پوری دنیا میں ایک دبستاں کی حیثیت سے جانا جاتا ہے ان میں ایک معتبر نام سحر عشق آبادی کا ہے۔ سحر عشق آبادی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر لسان و عروض بھی تھے۔ آپ عزیز لکھنوی جن کو لسان العصر کے خطاب سے نوازا جا چکا ہے، کے شاگردوں میں سے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس کسی نے بھی عزیز لکھنوی کے شاگردوں کا ذکر اپنی کتابوں اور مضامین میں کیا ہے انھوں نے سحر عشق آبادی کو عزیز کے شاگردوں میں شمار نہیں کیا ہے۔ لیکن خود سے سحر عشق آبادی عزیز لکھنوی کا شاگرد ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ عزیز لکھنوی کے وہ شاگرد جن کا خاصا نام ہے انھوں نے بھی کبھی سحر عشق آبادی کو عزیز لکھنوی کے شاگردوں میں شمار نہیں کیا ہے جب کہ وہ سحر عشق آبادی کو عزیز لکھنوی کے پاس آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سحر عشق آبادی فن شاعری اور زبان کے اپنے عہد کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور انھوں نے عزیز کے شاگردوں کی شاعری کی اچھی خاصی بخیہ ادھیڑی تھی۔ علامہ سحر عشق آبادی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے تعلق سے وریندر پرکاش سکسینہ لکھتے ہیں:

”سحر عشق آبادی یگانہ چنگیزی کی طرح اکھڑ بندہ تھا اس لیے ادبی دنیا کے لوگ آپ سے نفرت کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ اردو فن پر اتھارٹی تھے۔ ان سے بڑا اردو فن کا جاننے والا اس دور میں کوئی پیدا نہیں ہوا اس کا اعتراف سبھی اردو حلقوں نے کیا ہے۔“

(سحر عشق آبادی، وریندر پرشاد سکسینہ)

سحر عشق آبادی کی پیدائش 14 ستمبر 1903 کو عشق آباد (شہر میرٹھ) میں ہوئی تھی۔ آپ کا پورا نام بھگوان چند سحر عشق آبادی تھا۔ آپ میرٹھ کے مشہور بھٹناگر کائستھ خاندان سے تھے۔ آپ نے لکھنؤ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں عزیز لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ عمر کے آخری پچیس سال آپ نے دہلی میں گزارے۔ یہاں آپ 'شان ہند' نامی اخبار سے وابستہ تھے اور ظفر ادیب کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ آپ کا انتقال 31/ مارچ 1978 کو دہلی میں ہوا۔

آپ عروض و زبان کے اپنے عہد کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ آپ کے سامنے کسی کا طوطی نہ بولتا تھا۔ یوں بھی آپ لسان الہند عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا ذکر آپ کے یہاں اکثر ملتا تھا۔ غلط الفاظ اور محاوروں کے استعمال سے آپ کو بہت چڑ تھی اسی وجہ سے آپ نے ایسے لوگوں کی جن کے یہاں الفاظ یا محاوروں کا غلط استعمال ملتا تھا بہت سخت گرفت کی۔ آپ لکھنؤ کی زبان کے نہ صرف مداح تھے بلکہ کلمہ بھی پڑھتے تھے۔ اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں:

”میں نے عمر کا بیشتر حصہ علم اور تجدید عروض کی بھینٹ کر دیا۔ عروض کے باب میں کسی زندہ انسان کا زیر بار احسان نہیں۔ اس وقت تک جتنی کتابیں عروض پر لکھی گئی ہیں وہ سب نامکمل و غیر تسلی بخش ہیں اگر خلیل ابن احمد بصری اور محقق طوسی میری مدد نہ فرماتے تو میں اس فن کی گرد بھی نہ پا سکتا۔“

اتنے بڑے عالم اور شاعری کے فن کے ماہر سحر عشق آبادی کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس میں جہاں ان کے ہم عصروں کی ادبی چشمک نظر آتی ہے وہیں خود علامہ سحر عشق آبادی کا وہ غرور اور تعلی بھی شامل ہے جس کے سبب آپ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

آپ ثروت میرٹھی سے فن شعر پر مشورے کرتے تھے۔ آپ نے زبان اور عروض کی باریکیاں ثروت میرٹھی سے سیکھیں، لیکن افسوس آپ نے کبھی اس کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ راقم کو نگار عظیم (ثروت میرٹھی کی بیٹی) نے بتایا کہ سحر عشق آبادی کے کئی خطوط ہیں، جن میں انھوں نے ثروت میرٹھی سے بہت کچھ سیکھنے کا ذکر کیا ہے۔

آپ کی زندگی میں آپ کا ایک مجموعہ 'گل بانگ' کے نام سے شائع ہوا جس کو ان کے عزیز شاگرد نند لال پروانہ نے 1965 میں کافی اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ 'گل بانگ' میں علامہ سحر عشق آبادی کی معروف نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ نظم اور غزل کے ماہر شاعر ہونے کے بعد بھی سحر عشق آبادی کو اپنے عہد میں نہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے اور نہ نظم باف کی حیثیت سے شمار کیا گیا۔ عزیز لکھنوی کے شاگردوں میں غزل گو شعرا میں اثر لکھنوی، جگر بریلوی، تسکین قریشی اور امن لکھنوی کا نام لیا جاتا ہے جب کہ آپ کی غزلیں آپ کے ہم عصروں سے کسی طور کم نہیں ہیں۔

'گل بانگ' آپ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو کسی طور اپنے معاصرین کے مجموعوں سے کم تر نہیں ہے۔ غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی آپ کا فیض بولتا ہے۔ مفتون شکوہ آبادی آپ کے مجموعے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

”میں نے گل بانگ کا لفظ لفظ غور سے پڑھا۔ جس سلاست روانی سے تمام فنی قیود کو پیش نظر رکھ کر صاحب گل بانگ نے نادر جوہر پیش کیے دنیائے ادب میں نہ کہیں دیکھے نہ سنے۔“

(سحر عشق آبادی، وریندر پرشاد سکسینہ، ص 11)

علامہ عشق آبادی کی نظموں اور غزلوں میں ایک طرح کی روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور محاوروں کا بہترین استعمال آپ کے ماہر فن ہونے پر دال ہے۔

علامہ سحر عشق آبادی نے شاعری کے فن اور عروض کے تعلق سے کئی کتابیں تحریر کی تھیں جن میں سے کوئی بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکیں۔ آپ کی مشہور کتابوں میں 'عیوب فصاحت' کا شمار ہوتا ہے۔ یہ کتاب شعرا اور ادبا کے لیے بہت ضروری ہے۔ بڑے بڑے استاد شعرا کے یہاں ان کے کلام میں فصاحت کے بے شمار عیوب ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ داغ کے یہاں بھی بہت سے عیوب نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب فصاحت کے عیوب پر کھل کر بحث کرتی ہے۔ ”سحر العروض“ یہ کتاب بھی اب تک شائع نہیں ہو پائی۔ لیکن اس کتاب میں عروض کے فن پر مدلل بحثیں اور مضامین موجود ہیں۔ اس کتاب کے بعض مضامین ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ خود علامہ سحر عشق آبادی اپنی اس کتاب کے تعلق سے فرماتے ہیں:

”تیسری تالیف سحر العروض ہے۔ اس فن پر مشہور و

معروف مؤلفین کی کتابیں پڑھ کر دل بہت کڑھا۔ انہوں نے اس عمل کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں اور الجھا کر رکھ دی اور مجھے سحر العروض لکھنے پر مجبور کیا۔ ان کی سعی لا حاصل۔ اکثر رسالوں کے ذریعے نذر ناظرین کر چکا ہوں۔ آپ اس کے مطالعے سے مستفیض ہو کر فرمائیں گے کہ واقعی ہر تائید یا تردید معقول دلیلوں سے کہی گئی ہے۔"

(سحر عشق آبادی، ویریندر پرشاد سکسینہ، ص 14)

سحر عشق آبادی کے ہم عصروں میں میرٹھ کے روش صدیقی، حفیظ میرٹھی، انجم جمالی، حقی حزیں وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ تسکین قریشی اور جگر بریلوی سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ جگر بریلوی نے عمر کے آخری حصے میں میرٹھ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اس کے باوجود علامہ سحر عشق آبادی کو میرٹھ کا ادبی ماحول پسند نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ عشق آباد لگایا لیکن اپنے ماہر فن ہونے کا جو زعم ان کے اندر تھا اس نے آپ کو میرٹھ ہی کیا پوری ادبی دنیا میں الگ تھلگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اسماعیل ڈگری کالج میں ایک بڑا ادبی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت غلام الثقلین نے کی تھی اور جس میں خواجہ احمد فاروقی، مالک رام اور جگر بریلوی نے اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات پر مقالات پیش کیے تھے۔ ایسے بڑے جلسے میں بھی علامہ سحر عشق آبادی کو شامل نہیں کیا گیا۔ دوسرے میرٹھ میں ایک بڑی کائستھ کانفرنس بھی آپ کے زمانے میں ہوئی جس کی صدارت گوپی ناتھ امن نے کی تھی جس میں اس زمانے کے سرکردہ کائستھ شعرا اور ادبا نے شرکت کی تھی، آپ کو اس کانفرنس میں بھی مدعو نہیں کیا گیا۔ ان سب کے باوجود آپ کو میرٹھ سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ مولانا محمد حسین شوکت میرٹھی، اسماعیل میرٹھی، قلق میرٹھی اور بیاں میرٹھی کے معتقد تھے جب کہ روش صدیقی اور جگر بریلوی سے آپ کا دوستانہ تعلق تھا۔ میرٹھ عشق کا ایک ثبوت نظم 'عشق آباد' ہے جو آپ کے مجموعۂ کلام 'گل بانگ' میں شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق آباد

کہتے ہیں دل سے اہلِ عشق آباد
حسن پائندہ باد عشق آباد
لوگ کہتے ہیں اب جسے میرٹھ
ہاں وہی تھا وہی ہے عشق آباد
عشق خیز ارض ہے بحسن کمال
حسن بار آسمانِ عشق آباد
خاکِ عشاق جم کے مرکز پر
بن گئی سر زمینِ عشق آباد
تتلیاں سی تھرکتی ہیں پریاں
بے خزاں ہے بہارِ عشق آباد

سحر عشق آبادی کو غزلوں کے ساتھ نظموں پر بھی کافی دسترس تھی۔ آپ نے متعدد نظموں کے ذریعے نظم نگار شعرا میں الگ مقام پیدا کیا۔ ان کی مشہور نظموں میں عشق آباد، میں غزل کہتا ہوں، ماں مریم، کے علاوہ کرشن پر لکھی گئی آپ کی متعدد نظمیں آپ کی شناخت ہیں۔ آپ کی نظموں میں الگ طرح کی روانی ملتی ہے۔ آپ کی نظموں میں شاعری کا فن بدرجۂ اتم ملتا ہے اور ایک الگ فہم کا والہانہ پن جو آپ کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

آپ نے بے شمار رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ آپ کی رباعیوں کا ایک انتخاب گل بانگ' میں 'خیام سے پہلے' کے عنوان سے شامل ہے۔ ان رباعیات میں جہاں ان کا اپنا مذہب اور اس کے متعلقات نظر آتے ہیں وہیں اللہ رب العزت اور اس کے تعلق سے مضامین بھی آپ کی رباعیات کا موضوع بنتے ہیں۔ رباعیات کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ سحر عشق آبادی کی رباعیات اپنے معاصرین سے کسی طور کم نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی رباعیات کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا جب کہ ان کے معاصرین کے رباعیات کے مجموعے شائع ہو گئے تھے۔ چند رباعیاں۔

قولِ عزیز

نقاد ہو منصف تو ہے میرا محبوب
ہو دشمنِ فن کوئی حاسد مغضوب
بے منت استاد ہو اصلاح بقد
ہے قولِ عزیز لکھنوی یہ کیا خوب

برہم کا سپنا

برھمانڈ ہے کیا برہم کا سپنا زاہد
اس بات پر ایمان نہ لانے کی تھی ضد
کل دیکھا وہ بے نیاز کل سویا ہوا
یہ سچ ہے ترے سر کی قسم اے ملحد

سحر عشق آبادی اپنی غزلوں کے لیے مشہور ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عزیز لکھنوی کے معروف غزل گو شعرا میں سحر عشق آبادی کا نام شامل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ادبی چشمک اور علامہ سحر عشق آبادی کے مزاج کا کٹر پن اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے نیز معاصرین کی غزلوں میں عیوب تلاش کرنے کے عمل کے سبب ہے۔ ناانصافی بھی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ سچ اور حق بات کہنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا اور وہ ماہر شاعری اور عروض وفن کے سبب اپنے معاصرین کی غزلوں اور نظموں میں فصاحت اور بلاغت کے عیوب تلاشتے تھے۔ یہ باتیں انہیں ایک اچھا ناقد ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ ان کی اور اہل میرٹھ کی بدنصیبی ہے کہ ایسے ماہر فن غزل گو شاعر کو مناسب مقام نہیں ملا۔ آپ کی غزلوں میں روایت کا احترام تو ملتا ہی ہے کہیں کہیں روایت سے انحراف بھی آپ کی پہچان ہے۔ خاص لفظیات کا استعمال اور ایک الگ قسم کا رومان آپ کی غزلوں کی شناخت ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

آہ کرتا ہوں تو آتی ہے پلٹ کر یہ صدا
عاشقوں کے واسطے بابِ اثر کھلتا نہیں
رفتہ رفتہ ہی نقاب اٹھے گی روئے حسن سے
وہ تو وہ ہے ایک دم کوئی بشر کھلتا نہیں
خرمنِ جاں کے واسطے شعلۂ طور بن گیا
جیسا عطا ہوا مجھے ایسا نہ کوئی پائے دل
سحر وہ حسنِ بے نیاز آئے نہ بے نقاب کیوں
پردہ دوئی کا اٹھ چکا، تھا یہی مدعائے دل
فرشتے بھی پہنچ سکتے نہیں وہ ہے مکاں اپنا
ٹھکانا ڈھونڈے دورِ زمیں و آسماں اپنا
خدا جبار ہے ہر بندہ بھی مجبور و تابع ہے
دو عالم میں نظر آیا نہ کوئی مہرباں اپنا

علامہ سحر عشق آبادی کے شاگردوں کا جہاں تک سوال ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے درجنوں شاگرد ایسے ہیں جنھوں نے آپ سے شاعری کے فن پر اصلاح لی اور اپنے فن میں کمال حاصل کیا۔ حد تو یہ ہے کہ ابر گنوری اور رمز گنوری بھی آپ سے مشورے کیا کرتے تھے۔ سنتوش کمار کوکب، گوکل چند نارنگ وغیرہ نے بھی آپ سے شعر و شاعری میں اصلاح لی ہے۔ لیکن آپ کے شاگرد عزیز نند لال پروانہ اور رام پرکاش زار علامی نے آپ کا کافی نام کیا۔ یہ دو علامہ کے ایسے شاگرد ہیں جو فن شاعری سے بھی واقف تھے اور اپنے زمانے کے اہم شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ خاص کر زار علامی کی بات کی جائے تو وہ عروض کے فن میں یکتا تھے اور ان کا شمار اپنے عہد کے اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔

علامہ سحر عشق آبادی کو ادبی دنیا تو ادبی دنیا، میرٹھ نے بھی فراموش کر دیا ہے۔ جب کہ عشق آباد تخلص رکھنے والے اپنے عہد کے اکیلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں تو کمال حاصل کیا ہی عروض اور زبان کے بھی ماہر کہلائے۔ اپنے زمانے میں علامہ سحر عشق آبادی بے نظیر تھے۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی نے ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت وریندر پرشاد سکسینہ کا مونوگراف سحر عشق آبادی شائع کر کے جہاں علامہ کو بہتر خراج پیش کیا ہے وہیں ایک عالم اور شاعر کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
Dept of Urdu
Chaudhary Charan Singh University, Ramgarhi,
Meerut 250001 (UP)

شین مظفر پوری کی افسانوی کائنات

علاء الدین خان

شین مظفر پوری (ولی الرحمٰن شیدا، پیدائش: جنوری 1920، باتھ اصلی، سیتا مڑھی، وفات: 1996) کا ادبی سفر کم وبیش پانچ دہائیوں کو محیط ہے، اس عرصے میں وہ مسلسل لکھتے رہے۔ عظیم آباد (پٹنہ)، دلی اور لاہور کی مجلسوں میں پیش پیش رہے اور خوب داد و تحسین حاصل کی لیکن گردش ایام اور ناقدین ادب کی بے رخی نے ان کی شہرت اور ادبی کارناموں پر تعصب و جانب داری کی ردا ڈال دی۔ جنھوں نے ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے افسانوی فکر وفن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا تعلق شمالی بہار سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ثانوی تعلیم حاصل کی اور میٹرک کلکتہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ شین مظفر پوری کی بنیادی تعلیم اور ذہنی تشکیل اردو، فارسی کی مستحکم طرز پر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔

شین مظفر پوری کا تعلق کسی اعلیٰ اور معاشی طور پر مضبوط گھرانے سے نہیں تھا، جس کی وجہ سے تاعمر غم روزگار سے نبرد آزما رہے اور اس کا اثر ان کی تحریر پر بھی پڑا۔ اردو ادب میں ان کی پہچان ایک افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے ہے لیکن فکشن نگار اور صحافی کی حیثیت سے زیادہ مقبول ومعروف ہوئے۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا 'بے روزگاری' کے عنوان سے پہلا افسانہ لکھ کر کیا جو کلکتہ کے ہفتہ وار اخبار 'ہند' میں 1938 میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان سیاسی وسماجی سطح پر کروٹیں لے رہا تھا۔ انگریزوں کا زور کم ہو رہا تھا اور آزادی کے نعرے ملک کے کونے کونے سے بلند ہونے لگے تھے۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف عالمی سطح پر تحریک شروع ہوچکی تھی۔ مظلوم و بے کس مزدور اور کسانوں کے حق میں آواز بلند کی جانے لگی تھی، جس نے ہمارے ادب کو بھی متاثر کیا۔ داستانوی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا کے مسائل کو ادب میں پیش کیا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوچکی تھی جس نے ادب وحسن کے پیمانے اور معیار کو بدلنے پر غور وخوض کی دعوت دی۔ اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر اردو افسانے نے قبول کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو افسانہ ادب عالیہ کے مقابل کھڑا ہوگیا۔

شین مظفر پوری نے جب افسانہ نگاری شروع کی اس وقت ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی اور صوبہ بہار میں یہ صنف ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے دوسرے دور میں داخل ہوچکی تھی اور یہ دور بہار میں افسانہ نگاری کے اعتبار سے انتہائی اہم تھا۔ کیونکہ اس دور کے اہم لکھنے والوں میں محسن عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر جیسے بڑے افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ سا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ایسے دور میں جب بہار میں افسانہ نگاری اپنے عروج پر تھی شین مظفر پوری نے بھی آہستہ آہستہ اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کردیا اور یکے بعد دیگرے ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے، جن میں پہلا مجموعہ آوارہ گرد کے خطوط، 1946 میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن 'بند کمرہ' کے نام سے شائع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ 'دکھتی رگیں' اور 'کڑوے گھونٹ' بھی 1946 میں ہی شائع ہوا۔

دیگر مجموعے 'لڑکی جوان ہوگئی' 1956، 'دوسری بدنامی' 1965، 'حلالہ' 1976 اور 'طلاق طلاق طلاق' 1987 میں چھپ کر منظر عام پر آئے۔ ابتدائی تین مجموعے کی اشاعت ایک ساتھ 1946 میں ہونے کی وجہ سے کئی سوالیہ نشان کھڑے کیے جاسکتے ہیں۔ آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ تخلیق کار کو ایک ہی سال میں تین تین مجموعے کی اشاعت پر مجبور ہونا پڑا۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ شین مظفر پوری کی ہجرت اور ان کی زود نویسی دونوں شکم کی آگ بجھانے کے لیے تھی۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو شین مظفر پوری کا فن بھی دوسرے بڑے افسانہ نگاروں کے ہم پلہ ہوتا۔ اپنے ادبی سفر کی روداد کا ذکر کرتے ہوئے انشائیے کے مجموعے 'آدھی مسکراہٹ' کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ:

''سنہ 1937 عیسوی میں (عمر 17 سال) بے سان وگمان ادب کا چسکا لگا تو ذہنی اور علمی دونوں اعتبار سے میں ناپختہ بلکہ مفلس تھا۔ علمی اعتبار سے تو آج بھی مفلس ہوں اور مفلس ہی مروں گا۔ ہاں تو ادبی دنیا میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو افسانے میں سب سے زیادہ کشش پائی اور ہوتے ہوتے 1940 سے باقاعدہ افسانہ نویسی شروع کردی۔ مروجہ رجحانات کے مطابق میں سمجھا کہ افسانے بس حسن وعشق، غریبی، ناداری اور ظالم ومظلوم وغیرہ ہی کے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض وہبی صلاحیتوں کے طفیل اسی ڈگر پر تیزی سے چل پڑا..... چل پڑا تو چل پڑا۔ مگر کسی خودرو پودے کی مانند۔ قدم بہ قدم کسی بیساکھی کے بغیر چلتے چلتے 1947 میں وہ منزل بھی آئی جہاں یکایک محسوس ہوا کہ ع مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں' ذہن وفکر کا انداز، فن کا مزاج اور تحریر کا رنگ روپ اپنے آپ بدلنے لگا۔ تب تک صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرچکا تھا۔ آج محسوس ہوتا ہے کہ صحافت نے بھی میرے فکر وفن کو ضرور

متاثر کیا ہوگا۔ تحریر میں تیکھا پن آنے لگا۔ اخبارات و رسائل میں طنز و مزاح لکھنے کے بھی مواقع ملے۔ 1947 کے تقسیم وطن کے بعد ایک دوسری ہی دنیا سے پالا پڑا۔ زندگی اور سماج کا ماحول ہی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ قلم کو نشتر اور زبان کو دھاردار بنانے میں مابعد 1947 کے سیاسی اور سماجی عوامل، محرکات کی بھی کارفرمائی رہی ہے۔ ذہن و فکر نے نئی نئی کروٹیں لیں۔ تاریخ کے بدلے ہوئے دھارے اور کئی سیاسی اور سماجی آب و ہوا میں درجنوں افسانے اور کئی ناول لکھے۔"

(آدھی مسکراہٹ، ص5، لیتھو پریس پٹنہ، 1980)

مذکورہ بالا اقتباس سے افسانہ نگار کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور ادبی سفر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ شین کے زندگی نامہ کے مطالعے سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا ادبی سفر تن تنہا طے کیا اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے۔ وہ کسی شخصیت یا تحریک سے بھی کلی طور پر متاثر نظر نہیں آتے۔

ان کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی ملتی ہے۔ چہار دیواری کی زندگی، گھریلو زندگی کی ناہمواریاں، سماجی مساوات، تعصب، اخلاقی تنزلی، معاشی بدحالی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، فرقہ وارانہ فسادات اور جنسی مسائل پر عمدہ افسانے لکھے، جن کے مطالعے سے ان کے فکری رویے اور وسیع و عمیق مشاہدے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات شمالی بہار کے دیہات ہیں لیکن علاقائیت کے اثرات کے باوجود اس میں آفاقی رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں کے کردار کا تعلق مفلوک الحال اور نچلے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں سے ہے، جن کی نفسیاتی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی الجھنوں کو انھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر اپنی کتاب 'بہار میں اردو افسانہ: ابتداء تا حال' میں ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ انھوں نے شمالی بہار کو بہت قریب سے دیکھا ہے، غریب اور نچلے طبقے سے برابر سابقہ پڑتا رہا ہے، مسلم گھرانوں کے معاشرتی ماحول سے کافی لگاؤ رہا ہے اس لیے ان کے یہاں زیادہ تر ان ہی کردار اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے یہاں غیر مسلم کرداروں پر افسانے، ڈرامے اور ناول وغیرہ نہ کے برابر ہیں۔"

(بہار میں اردو افسانہ نگاری (ابتدا تا حال)، قیام نیر، ص154، دی آزاد پریس، پٹنہ، طبع دوم 1996)

اپنے افسانوں کے موضوعات کے حوالے سے قیام نیر کے ایک سوال کے جواب میں شین نے خود ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

"میں کسی خاص موضوع یا مسئلہ پر افسانے نہیں لکھتا۔ میرے افسانے رنگارنگ ہیں۔ عام طور پر سماجی مسائل، انسانی نفسیات، حادثات، سیاسی غلط کاریاں وغیرہ میرے عام موضوعات ہیں۔۔۔۔ خداترسی اور خداپرستی اور روحانی احساسات میرے فکر و فن میں under current محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔" (ایضاً)

"شین مظفر پوری نے جب افسانہ نگاری شروع کی اس وقت ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی اور صوبہ بہار میں یہ صنف ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے دوسرے دور میں داخل ہوچکی تھی اور یہ دور بہار میں افسانہ نگاری کے اعتبار سے انتہائی اہم تھا۔ کیونکہ اس دور کے اہم لکھنے والوں میں محسن عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شکیلہ اختر جیسے بڑے افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ سا نظر آتا ہے۔"

افسانہ 'آوارہ گرد کے خطوط' شین کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔ یہ افسانہ خط کے فارم میں ہے اور سولہ خطوط پر مشتمل 70 صفحے کا طویل افسانہ ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں۔ ایک آوارہ گرد اور دوسرا نسیمہ۔ یہ ان کے ابتدائی دور کا افسانہ ہے جس پر رومان پرستی غالب ہے اور یہ افسانہ نگار کے فکر و فن کا امتزاج ہے۔ سبھی خطوط میں زندگی کی نفسیاتی گتھیوں کو پیش کیا ہے۔ ان خطوں کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ آوارہ گرد عورت کے تئیں متعصب اور متنفر ہے۔ وہ جو چاہتا ہے حاصل کر نہیں پاتا ہے۔ باوجود اس کے وہ عورت ذات پر طنز کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے۔ 'آوارہ گرد کے خطوط' کے آخر میں یہ عیاں ہوتا ہے کہ آوارہ گرد کو نسیمہ سے صرف اتنی شکایت ہے کہ اس نے آوارہ گرد کی دوران علالت عیادت نہیں کی۔ یہی بے اعتنائی ان خطوط کے معرض وجود میں آنے کا سبب بنا اور آخری خط میں اعتراف کرتا ہے کہ "آج ایک قاہر و جابر شہنشاہ ایک گداگر کے قدموں پر پیشانی رگڑ رہا ہے۔"

(بند کمرے میں، افسانہ آوارہ گرد کے خطوط، پیش لفظ: بلقیس فاطمہ، ص15، رنگین کتاب گھر، دہلی، سنہ ندارد)

بلقیس فاطمہ آوارہ گرد کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

"روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں جنسی رجحانات کی کروٹوں کا نفسیاتی تجزیہ اس کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ متوسط طبقے کا ماحول اس نے اپنی افسانہ نگاری کے لیے تقریباً مخصوص کرلیا ہے کیونکہ یہ درمیانی طبقہ سب سے زیادہ اصلاح اور توجہ کا محتاج ہے۔ اس میں اول و آخر طبقوں کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ انسانیت کی تعمیر اور تخریب کا دارومدار اسی طبقے پر ہے۔ اس طبقے کی اخلاقی کمزوری، معاشی کشمکش، مفلس جوانی کی مریضانہ تشنگی اور اس کا ردعمل اس کے افسانوں کے نمایاں موضوع ہیں۔ اور تحلیل نفسی ان سب کا محور۔ پلاٹ اور موضوع کی شیر و شکر جیسی آمیزش کے اعتبار سے اس کے افسانے اردو کے ننانوے فیصد اچھے افسانہ نگاروں کے لیے قابل رشک ہیں۔" (ایضاً ص8)

شین کا تعلق ممتاز مفتی، حسن عسکری اور علی باقر کی جماعت سے تھا۔ انھوں نے جنس کے بیان میں کبھی بھی عصمت چغتائی اور منٹو کی پیروی نہیں کی بلکہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے ذہنی رویے کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ 'نہ جینے دو گے نہ مرنے دو گے' اور 'انمول' میں جنس کا بیان ضمنی ہے اصل مسئلہ میاں بیوی کے درمیان رشتے اور برتاؤ سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔

اس افسانے میں شاہد اور رخسانہ کے باہمی محبت، برتاؤ اور تلخی سے ابھرنے والی کیفیت کو انتہائی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ رخسانہ حسین ہے اور وہ چاہتی ہے کہ شاہد پر اس کی اجارہ داری ہو اور وہ اس کے حکم سے اپنی زندگی گزارے مگر ازدواجی زندگی کا تقاضا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ نتیجتاً روز بہ روز تلخی بڑھتی جاتی ہے اور شاہد رخسانہ کو طلاق دینے کا ذکر پڑوسن سے کردیتا ہے۔ اس کے بعد گھر میں ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ معاملہ کسی طرح رفع دفع ہوتا ہے لیکن رخسانہ کو شاہد کے رویے سے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی بے اعتنائی برداشت نہیں ہوتی۔ اگرچہ رخسانہ نے شاہد کو رجھانے کے لیے سارے حربے استعمال کیے مگر وہ ناکام رہی۔ افسانے میں افسانہ نگار نے جس طرح سے رخسانہ کے کردار کو پیش کیا ہے وہ ایک مضبوط کردار کی شکل میں ابھرا ہے۔ نیز افسانے میں واقعات کا تسلسل اور زبان و بیان کی برجستگی قابلِ تحسین ہے۔

افسانہ 'انمول' میں بارش نہ ہونے اور قحط کی وجہ سے

عوام کی فاقہ کشی، مجبوری و بے بسی کو پیش کیا گیا ہے اور جینے کی تگ ودو میں عوام کس طرح مجبور و بے بس ہو کر صرف اپنی ذات تک محدود ہو جاتی ہے، اس کی نہایت دردناک تصویر پیش کی گئی ہے۔اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حالات کے ہاتھوں انسان کس قدر لاچار ہو جاتا ہے کہ اناج کی قلت کی وجہ سے انوکھی کا باپ جب پورا علاقہ قحط اور فاقہ کشی سے نبرد آزما ہے، اسی دوران اپنی بیٹی کی شادی بڑی سادگی سے کر دیتا ہے تاکہ ایک فرد کے بوجھ سے نجات مل سکے۔انوکھی جوان، حسین اور باکرہ ہے۔اسے اپنی عصمت اور پاک دامنی پر ناز ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد بھی خود کو شوہر کے سپرد نہیں کرتی ہے بلکہ دست درازی کرنے پر شور مچانے کی دھمکی دیتی ہے۔انوکھی کے بھولے پن اور معصومیت کی وجہ سے اس کے سسرال والے میکے پہنچا دیتے ہیں۔ شادی سے قبل سکندر انوکھی سے محبت کرتا تھا لیکن انوکھی نہیں۔انوکھی کو تو اپنی پاک دامنی کی فکر تھی کیونکہ محلے کی لڑکیوں کے کردار سے واقف تھی اسی لیے اپنی دنیا اپنی پاکدامنی تک محدود کر رکھا تھا۔قحط اور فاقہ کشی کی وجہ سے حالات بدتر ہونے لگے جس کا اثر انوکھی پر بھی پڑا اور انوکھی اپنی پاکدامنی کی پرواہ کیے بغیر سکندر سے اپنے پاکدامنی کا سودا کرنا چاہتی ہے تاکہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کو موت کے منھ میں جانے سے بچا سکے:

شین مظفر پوری نے افسانوں میں اپنے عہد اور سماج کی بھرپور نمائندگی کی ہے اور عصری مسائل پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ وہ جن مسائل سے دوچار تھے اسے بطور خاص اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

”یکایک مایوسی اور ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیارے میں روشنی کی ایک مدھم سی کرن جھلملائی۔انوکھی کے دل سے ایک آواز نکلی جس کی گونج اس کے دماغ کے گنبد میں بھر گئی۔ایک نام.....سکندر، گاؤں کے خوش حال مودی کا لڑکا، انوکھی کا وہ مایوس عاشق جس سے ایک بار رات کے اندھیرے میں وہ ملی تھی اور جس کی تمنا کا خون کر کے اس نے فخر محسوس کیا تھا۔اس کی یاد آتے ہی انوکھی کی آنکھوں میں زندگی کی رمق پیدا ہو گئی۔بڑی دیر کی کشمکش کے بعد انوکھی نے جی کڑا کر کے ایک فیصلہ کر لیا۔ایک ایسا فیصلہ جسے کرتے ہوئے وہ کانپ گئی۔مگر ماں باپ اور بھائی بہن کی جان بچانے کو وہ سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔“

شین مظفر پوری کے تیسرے افسانوی مجموعے ’کڑوے گھونٹ‘ کے افسانے میں دستک، خسارہ، جراثیم اور بے زبان خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ان افسانوں میں جنس کا ذکر زیریں سطح پر ہے لیکن اصل میں ان کہانیوں میں سماجی و معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز کو بیان کیا گیا ہے۔وہاب اشرفی شین مظفر پوری اور جنس کے حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”مجھے حیرت ہوتی ہے کہ البرٹو موراویا کی ’دی وومن آف روم‘ کو فخر سے پڑھنے والے لوگ ’ش‘ کو فحش نگار کہتے ہیں۔ش جنس پر لکھتے ہیں تو حصول لذت کے لیے نہیں، وہ ماحول اور سماج کی تمام تر گندگیوں کو ایک فنکار کی طرح دیکھتے ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ یہ جراحی ناپسندیدہ ہو سکتی ہے لیکن غیر ضروری نہیں۔“

(بہار میں اردو افسانہ نگاری، مرتب: وہاب اشرفی، افسانہ ’اصول‘، ص 234، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، 1989)

’آوارہ گرد کے خطوط‘ اور ’بند کمرے میں‘ ان کے دو افسانے ’بند کمرہ‘ اور ’حق تلفی‘۔ان افسانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر دیانت داری کے ساتھ اردو افسانوں کا انتخاب تیار کیا جائے تو یہ دونوں منتخب افسانوں کی فہرست میں ہوں گے۔علاوہ ازیں ’دوسری بدنامی‘ اور ’سرد جنگ‘ بھی ان کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

شین مظفر پوری نے افسانوں میں اپنے عہد اور سماج کی بھرپور نمائندگی کی ہے اور عصری مسائل پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ وہ جن مسائل سے دوچار تھے اسے بطور خاص اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

افسانہ ’دستک‘ میں تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اس افسانے میں مصنف کے مشاہدات، تجربات اور نظریات کی عکاسی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ دراصل سوانحی افسانہ ہے جس میں شین نے معاشی نابرابری کی وجہ سے سماج میں کس طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کی عکاسی کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک طرف دولت پر قابض ساہوکار اور زمیندار ہیں جو غریبوں کا خون چوستے رہتے ہیں، دوسری طرف ایک ایسے فرد کا حال بیان کیا ہے جس کے کاندھے پر بہن کی شادی کی ذمے داری، بیوی بچوں کا بوجھ اور دوسرے مسائل اسے ہر وقت پریشان کیے رہتے ہیں۔یہ فرد کوئی اور نہیں بلکہ خود افسانہ نگار ہے۔اس طرح افسانہ ’دستک‘ میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک غریب اور متوسط طبقے کا انسان تمام عمر ترس ترس کر جینے پر مجبور ہے۔یہاں تک کہ اس کی بیوی دم توڑ دیتی ہے اور وہ اسے کاندھا بھی نہیں دے پاتا ہے۔کیونکہ غم روزگار نے اسے در بہ در بھٹکنے پر مجبور کر دیا افسانے کا اختتام المیہ ہے جس کے مطالعے سے قاری پر بھی حزن و ملال کی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تمام مال و دولت صرف چند لوگوں کے قبضے میں ہیں جبکہ ایک بڑی آبادی بھوک و افلاس میں پوری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔اور یہ مسئلہ ہر دور میں سر ابھارتا رہا ہے۔ان کے افسانوں کی عصری معنویت کا جائزہ لیتے ہوئے شہاب ظفر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

”بہترین ادب وہی ہوتا ہے جو کسی معین مکانیت اور محدود زمانیت کا قیدی نہ ہو۔شین مظفر پوری کے افسانے اس لحاظ سے بڑے افسانے کہے جا سکتے ہیں کہ وہ عہد جس سے شین متصادم تھے اس کی ستم کوشیاں اب بھی جاری ہیں اور ان میں پیش کردہ مسائل سے آج بھی ہمارا معاشرہ دوچار ہے۔شین مظفر پوری کی کہانیاں اس عہد کے ساتھ ساتھ ہمارے آج کے مسائل کی بھرپور نمائندگی کر رہی ہیں۔“

(شین مظفر پوری کے افسانوں کی عصری معنویت، شہاب ظفر، مشاہیر دبستان بہار، مرتب: امتیاز احمد کریمی، ص 76-275، اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ)

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے معاشرے، اس کے مسائل اور مسائل کی چکی میں پستے ہوئے انسان کی بہترین تصویر کشی کی ہے اور بحیثیت فرد انسان کو موضوع بحث بنانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی مسائل پر بھی زور دیا ہے۔اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان خواہ جس روپ میں بھی ہو یا جو بھی کردار ادا کر رہا ہو، کارزار حیات میں اس کا ہر عمل ایک نئے ردعمل کو جنم دیتا ہے اور نئی نئی کہانیوں کو جنم دیتا رہتا ہے۔اس طرح زندگی کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

■

Dr. Allauddin Khan
Department of Urdu
Rajendra College,
Jai Prakash University
Chhapra-841301 (Bihar)
Mob.:9650663775

قیصر شمیم بحیثیت مترجم شاعر

بدر محمدی

شاعری احساس کی ترجمانی کا عمل ہے۔ یہ احساس نازک خیالی سے بھی پیدا ہوتا ہے اور مطالعۂ کائنات سے بھی۔ حالی نے مطالعۂ کائنات کو شاعری کی دوسری شرط میں شمار کیا ہے کہ نسخۂ کائنات اور نسخۂ فطرت انسانی کا مطالعہ غور سے کیے جانے سے شاعری کے لیے خام مواد ملتا ہے اور شاعری وقیع ہوتی ہے۔ مطالعۂ کائنات کے لیے سیر دنیا ضروری ہے جیسا کہ سعدی شیرازی نے کیا تھا۔ سیر دنیا اور لوگوں سے ملنے ملانے کی خاطر سفر شرط ہے۔ البتہ گھر بیٹھے بھی افراد سے ملاقات کا شرف حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس ملاقات سے تجربات کا دھنی بنا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے ویسی شخصیت کا ہونا لازمی ہے۔ گھر بیٹھے سیر کائنات کا دوسرا ذریعہ ہے، مطالعۂ کتب۔ چنانچہ کتابوں کی ورق گردانی سے، انسانی زندگی میں پیش آنے والی مختلف حالتوں کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا، مشاہدے میں آنے والے امور کو ترتیب دینا، عام آنکھوں سے مخفی خواص اور کیفیات کا مشاہدہ کرنا، فکر میں

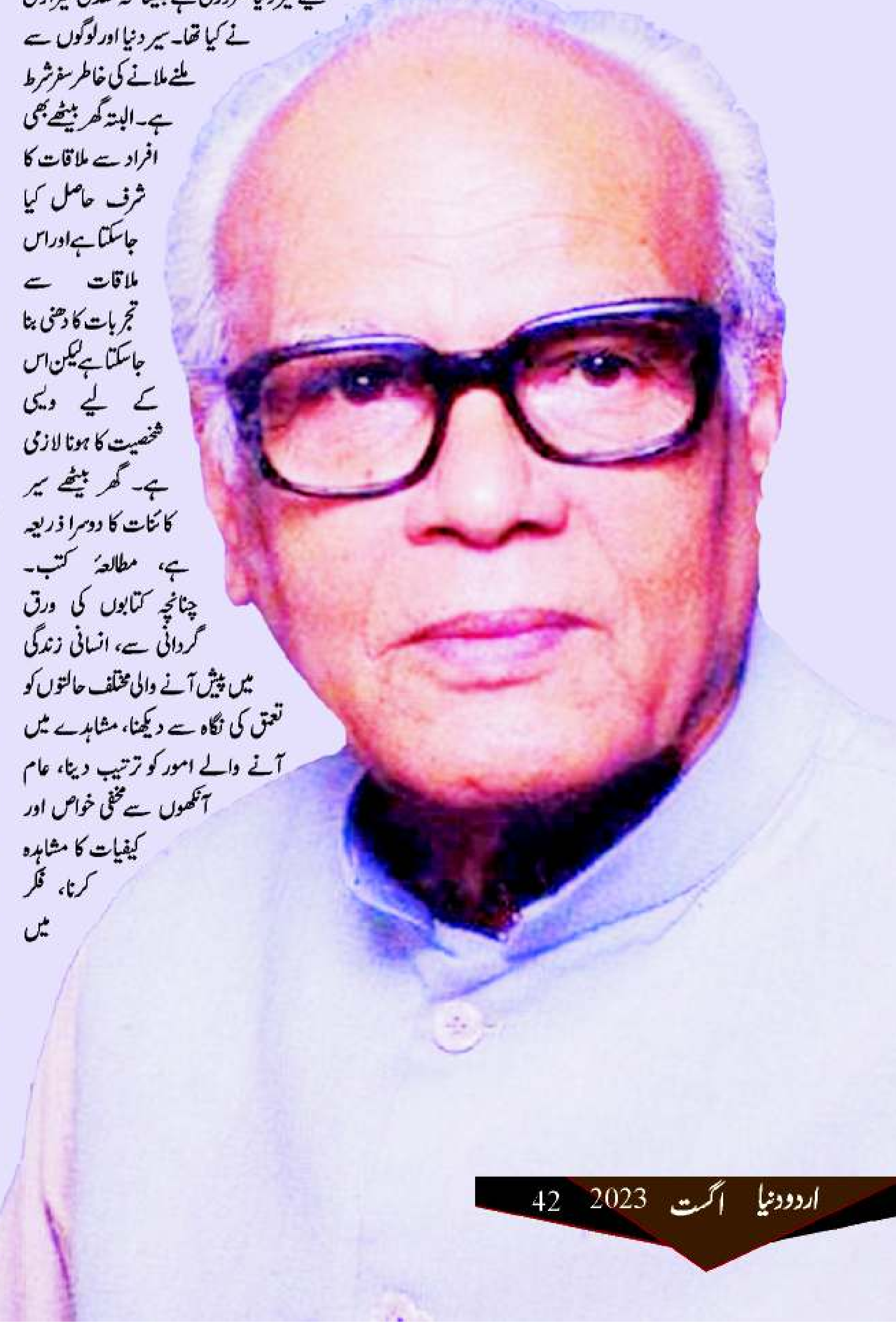

مشق و مزاولت سے مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں اخذ کرنے کی قوت پیدا کرنا اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھنا ممکن ہوتا ہے اور یہی چیز حالی کے یہاں مطالعۂ کائنات کی حصولیابیاں ہیں۔ الغرض مطالعۂ کتب سے بھی قوت متخیلہ کو اپنی اصلی غذا ملتی ہے، جس سے شاعری نشو و نما پاتی ہے۔ شاعر اس طرح سے بھی کائنات یا فطرت انسانی کے مطالعے میں مستغرق رہتا ہے۔ کہنہ مشق، قادرالکلام اور استاد شاعر جناب قیصر شمیم کے یہاں یہ سب چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔

قیصر شمیم نے خود کو زبان و ادب اور علم و فن کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہ باکمال شاعر و ادیب اور باذوق قاری بھی ہیں۔ ان کی وابستگی درس و تدریس سے رہی ہے۔ معلم ہونے کے باعث مطالعے کے تئیں وہ ثروت مند رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کے روایتی اور غیر روایتی رجحانات کے ساتھ ساتھ فارسی، بنگلہ، ہندی اور انگریزی کے رجحانات کا بھی مطالعہ سعادت مندی سے کیا ہے۔ اپنے مطالعے کی عادت کے سبب انھیں ہر چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ حاصل ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں جمع کرنے کی ان میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ قیصر شمیم نے بنگلہ آبادی کے درمیان رہ کر اردو ادب کی آبیاری کی ہے۔ ایسے میں بنگلہ ادب کا اثر قبول کرنا فطری ہے۔ چنانچہ اپنے مطالعے کی بنیاد پر بنگلہ کا اہم ادبی سرمایہ خاصی مقدار میں انھوں نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ پرائمری اور سکنڈری بورڈ کی متعدد کتابوں اور بعض مشہور ڈراموں کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی اور ہندی سے بھی کہانیوں اور نظموں کے ترجمہ میں دلچسپی لی ہے۔ قیصر شمیم نے اردو کے دوسرے شعرا اور دیگر زبانوں کے بے شمار شعرا کی شاعری کے حوالے سے ڈھیر ساری باتیں کہی ہیں۔ مطالعے کی زیادتی کے باعث اپنی پسند کی چیزوں کو اردو میں جمع کرنے پر وہ کاربند رہے ہیں۔ چنانچہ چیخوف کی بہت سی روسی کہانیوں کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا ہے، یعنی ترجمہ نگاری ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس فطری شاعر نے دوسری زبانوں کی کئی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میرے پیش نظر قیصر شمیم کی ایسی درجن بھر نظمیں ہیں جو شعری مجموعہ 'زمیں چیختی ہے' میں شامل ہیں۔

یہ درجن بھر نظمیں نصف درجن شاعروں کی ہیں۔ ان بارہ نظموں میں گیارہ نظمیں بنگلہ ادب کی ہیں اور ان میں پانچ نظمیں رابندر ناتھ ٹیگور کی ہیں۔ ٹیگور کی بہت سی چیزوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوا ہے۔ انھوں نے

اپنی چیزوں کا خود بھی ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ 'گیتا نجلی' کا انگریزی ترجمہ نسبتاً زیادہ مقبول و معروف ہوا تھا۔ یہ ترجمہ اتنا اعلیٰ تھا کہ اس پر انھیں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ قیصر شمیم نے ٹیگور کے سرمایۂ سخن سے پانچ موتیوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان میں ہر ایک کی حیثیت درِ آبدار کی ہے۔ آغاز 'اکلا چلورے' سے ہوا ہے۔ ٹیگور کی یہ شہرۂ آفاق نظم عالمی ادب کی نمائندگی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 'اکلا چلورے' اپنے عہد میں ایک نعرہ بن گیا تھا۔ قیصر شمیم نے اردو شاعری کو اس نعرے کی توضیح سے واقف کرایا ہے اور اس سلسلے میں شیریں بیانی سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'اکلا چلورے' سے زیادہ غنائیت 'تنہا چل بھی تنہا چل' میں ہے۔ مجروح کے یہاں تنہا چلنا ہے اور کارواں بن جاتا ہے جبکہ ٹیگور کے یہاں اکیلا چلنا ہے اور اکیلے ہی چلتے رہنا ہے، اس نظم میں راہ کے کانٹوں کو خون بھرے تلووں سے تنہا کچلنے کا درس دیا گیا ہے۔ اپنے دل کو ہر لحہ جلنے والی مشعل بنا لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ غرض کہ بہر صورت سفر جاری رکھنا ہے۔ چلتے رہنا ہے اور تنہا چلتے رہنا ہے۔ کہتے ہیں اکیلا، حق پر قائم رہنے والا، چلتا ہے۔ اس طرح یہ نظم حق پر قائم رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

قیصر شمیم نے رابندر ناتھ ٹیگور کی تین ایسی نظموں کا ترجمہ شامل کیا ہے جو ڈرامائی مکالمے پر مشتمل ہیں۔ یہ نظمیں ہیں 'ترکی بہ ترکی'، 'غرض کا رشتہ' اور 'رشتہ داری'۔ یہ تینوں نظمیں مختصر ہیں۔ البتہ اوّلین دو نظموں میں مکالمہ طرفین کا ہے جبکہ تیسری نظم میں ایک سمتی مکالمہ ہے۔ 'ترکی بہ ترکی' میں ایک ناکارہ بھڑ اور شہد کی مکھی کے مابین گفتگو ہے۔ ناکارہ بھڑ شہد کے چھتے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسے احمق گردانتی ہے۔ اس کے ناز کو بے جا ٹھہراتی ہے۔ جواب میں شہد کی مکھی عجز و انکسار سے کام لیتی ہے اور حجت سے اجتناب کرتی ہے، البتہ یہ چیلنج کرتی ہے کہ یہ حقیر کام بھی تم سے ممکن نہیں۔ ٹیگور کی یہ نظم اور علامہ اقبال کی نظم 'ایک پہاڑ اور گلہری' ایک ہی قبیل کی ہیں۔ دونوں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کسی بھی مخلوق کی ادنیٰ کاریگری بھی کم نہیں کہ یہ دوسرے سے ممکن نہیں۔ لہٰذا کسی کی کارکردگی کو حقیر سمجھ کر اس کا مذاق اڑانا اچھا شعار نہیں۔ نظم 'غرض کا رشتہ' بھی مکالماتی پیرائے میں ہے لیکن اس میں مکالمہ دو ذی حیات کے بیچ نہیں بلکہ زر کی تھیلی اور بھیک کی جھولی کے مابین ہے، زر کی تھیلی سے بھیک کی جھولی نے شکایت کی کہ ہم دونوں ایک خاندان کے ہیں مگر تم مغرور ہو اس قدر مغرور کہ رشتے داری سے بھی دور ہو۔ رشتے ناتے بھلا کر بیٹھی ہو۔ یہ سن کر زر کی تھیلی گویا

ہوئی کہ میرے پاس جو زر ہے وہ تمھارے پاس ہوتا تو تم بھی وہ سب کرتی جس کی مجھ سے شکایت ہے۔

ٹیگور کی نظم 'رشتہ داری' میں کروسین سے جلنے والے ایک بڑے لیمپ کا تخاطب مٹی کے دیے سے ہے، یہاں متکلم گویا ہے اور حاضر خاموش۔ دیے کا بھائی کہہ کر پکارنا لیمپ کو پسند نہیں اور یہ ناپسندیدگی اس قدر ہوئی کہ گلا تک دبانے کی بات کہہ دی۔ بڑے لیمپ کو اپنی اوقات اس دم سمجھ میں آئی جب آسمان سے چاند نمودار ہوا اور دونوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ اس گھڑی بڑا لیمپ چھوٹے دیے کو خود بھائی کہہ کر بلانے لگا۔ اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ طاقت ہونے پر کوئی بھی اتراتا ہے اور وقت مصیبت صلح چاہتا ہے۔ درج بالا نظموں میں بھڑ، شہد کا چھتہ، زر کی تھیلی، بھیک کی جھولی، لیمپ اور دیا سب استعارے ہیں۔ یہ نظمیں علامتی ہیں۔ ان میں شاعر کا بیان استعاراتی ہے۔ اس زمرے کی ایک اور نظم ہے مسافر (یاتری)۔ اس نظم میں مسافر کے حوالے سے باتیں کہی گئی ہیں۔ اس میں دنیا کو ناؤ اور آدمی کو مسافر بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ سب کو اس ناؤ سے پار اترنا ہے۔ ناؤ پر سوار مسافروں کا سفر مختلف وقتوں میں مختلف گھاٹوں پر تمام ہونا ہے۔ یعنی مسافر کا یہ سفر تھوڑی ہی دیر کا ہے۔ سفر ختم ہونے پر کوئی نہیں رکے گا۔ اس نظم میں فلسفۂ حیات کا شاعرانہ بیان ملتا ہے۔

بنگلہ ادب میں ٹیگور کے بعد قاضی نذر الاسلام کا نام آتا ہے۔ دونوں معاصرین ہیں۔ دونوں کی حیثیت اردو کے انیس و دبیر کی طرح ہے۔ نذر الاسلام کو بنگال کا عہد آفریں شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ توانائی، جوش اور نشاط روح کی کیفیتیں یکجا ہو کر ان کے کلام میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ قیصر شمیم نے ترجمے کے لیے قاضی نذر الاسلام کی جس واحد نظم کا انتخاب کیا ہے، وہ ہے ''قلی۔ مزدور''۔ اس نظم کے انتخاب کی وجہ یہ بھی ہے کہ قیصر شمیم کا آبائی وطن انکس، جوٹ مل کا علاقہ تھا۔ جہاں کے مزدوروں کے زرد ماحول کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے کرب کو محسوس کیا تھا۔ مزدوروں کے معاشرے کا پروردہ شاعر شیب پور میں منتقل ہوا تو یہاں بھی اسے صنعتی مزدوروں کے پسماندہ علاقے سے دو چار ہونا پڑا۔ غریب، مزدور کی دکھ بھری زندگی کی مکمل تصویر، مسلسل قیصر شمیم کے سامنے رہی ہے۔ چنانچہ اپنے تلخ تجربے اور مشاہدے کو قاضی نذر الاسلام کے خیالات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے منظوم ترجمہ میں نئی حسیت اور سچائی کے عناصر بھر دیے ہیں۔ اس نظم میں مزدوروں کے کارنامے بتائے گئے ہیں کہ ہتھوڑی اور کلہاڑی چلا چلا کر مزدوروں

نے پہاڑوں کا جگر چاک کیا ہے۔ مزدور ہی انسان اور دیوتا ہے۔ انھیں کے درد بھرے سینے پر چل کر نیا سورج آتا ہے۔ ان کے قدموں کی دھول پیشانی پر لگانے کی ضرورت ہے لیکن ان کا حال زار ناگفتہ بہ ہے۔ اس لیے یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا مزدور لوگ اس طرح ساری دنیا میں مار کھاتے رہیں گے۔ اسی تناظر میں کارل مارکس نے 'دنیا کے مزدورو ایک ہو' کا نعرہ دیا تھا۔ چنانچہ اس نظم میں کارل مارکس کے نعرے کو اس طرح پیش کیا گیا ہے ''تمام زمانوں، تمام ملکوں کے تمام انسان آئیں اور ایک مرکز پہ کھڑے ہو کر سنیں ایک ملن کی بانسری''۔

شاعری کا تعلق انقلاب سے بعد میں ہے پہلے رومان سے ہے۔ ہر زبان کی شاعری میں رومان کا موضوع لازماً ہوتا ہے۔ اس کے بغیر شاعر یا شاعری نامکمل اور بے مزہ ہے۔ چنانچہ قیصر شمیم نے بھی ترجمے کے سلسلے میں ایک عدد رومانی نظم کا انتخاب کیا ہے اور یہ نظم ہے نیریندر ناتھ چکرورتی کی ''تم سے کہا تھا''۔ معاملات عشق میں اکثر محبوب کا وعدہ عاشق سے ہوتا ہے اور وہ بھی پرفریب وعدہ مگر اس نظم میں عاشق ہی محبوب سے آنے کا وعدہ کر رہا ہے۔ خوبصورت اور مشکل راستوں سے خوبصورت لمحے میں آنے کا وعدہ۔ کسی صورت آنے کا وعدہ۔ حالانکہ بدن کا جوش ختم ہو چکا ہے۔ خون کی روانی تھم سی گئی ہے۔ خیال دھندلا گیا ہے مگر کیا گیا وعدہ اسے یاد ہے۔ عاشق کا جانا، جانا نہیں ہوتا۔ اس کا آنا معنی خیز ہوتا ہے۔ اس نظم میں محبت کی جلوہ سامانیاں ہیں، سینے کی دبی چنگاریاں ہیں، دل کی اچھلتی کودتی حسرتیں ہیں۔

تمناؤں میں الجھنا انسان کی فطرت ہے۔ خواہشیں ہر دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ آدمی ان خواہشوں کا محاسبہ کرتا ہے۔ اپنی اور دوسروں کی خواہشوں کا بھی۔ نیریندر ناتھ چکرورتی کی بنگلہ نظم 'اہل کانتی' اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ جس کا ترجمہ قیصر شمیم نے کیا ہے۔ الگ الگ انسان کی خواہش الگ الگ نوعیت کی ہے اور اس کی تکمیل بھی الگ الگ ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ عام طور پر معلم، معالج اور وکیل بننے کی آرزو کی جاتی ہے مگر دھوپ بننے کا خواب چیزے دیگر ہے۔ اس شرمیلی دھوپ کا خواب جو بارش، عفوو کرم کے موقع پر کوؤں کی صداؤں سے گونجتی شام کو سیاہ و سفید جامنوں کے پتوں پر چپکی رہتی ہے۔ منظر کشی سے پُر اس نظم میں پیش کی گئیں تصویریں مختلف زمانوں کی ہیں۔ اسکول کے دور کی، اس کے بعد کی، دوسروں کی کامیابی کے عہد کی اور اہل کانتی کے چھاپا خانے میں کام کرنے کے دنوں کی کہ کس طرح دھوپ کی طرح چمکنے کا خواب دیکھنے

والا تاریک چھاپا خانے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی نہیں کسی دوسرے کی روداد پیش کی ہے اور اسے اپنی روداد بنانے کی کوشش کی ہے۔ خواہش کے حسرت بننے کا نوحہ پیش کیا ہے۔ اہل کانتی کی دھوپ بننے کی خواہش وہ خواہش ہے جس پر شاعر کا دم نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

قیصر شمیم نے بنگلہ کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس کا ثبوت ونل کمار کی ہندی نظم 'ایک جلتے ہوئے شہر کی سیر' کا ترجمہ ہے۔ ہندی سے انھیں اس قدر قربت رہی ہے کہ ان کا ایک ہندی شعری مجموعہ 'تری دھارا' کے نام سے 1996 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ قیصر شمیم کو ہندی اور ہندی والوں سے راہ و رسم رہی ہے۔ بہت سے ہندی والے ان کے دوست اور شاگرد بھی ہیں۔ شاید اسی کے باعث ہندی نظم 'ایک جلتے ہوئے شہر کی سیر' کے ذریعے انھوں نے نذر آتش شہر کی سیر کرائی ہے۔ اس نظم میں سماج میں پائی جانے والی کثافتوں کے خلاف احتجاج ہے۔ یہ اس شہر کی غم بھری داستان ہے جو تباہیوں کی نذر ہو گیا ہے۔ اردو اور ہندی ادب میں اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں مگر اس نظم میں بربادیوں کا منظر جس انداز سے پیش کیا گیا ہے وہ جداگانہ ہے۔ شاعر ایک جلتے ہوئے اور شیشے کی طرح پگھلتے ہوئے شہر میں ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ یہاں مرنے والا مرنے سے پہلے اور مرتے ہوئے پانی مانگ رہا ہے۔ اس شہر میں تتلیوں کے پر نوچ گئے ہیں۔ پارکوں کی گھاس کچلی گئی ہے۔ دیواریں ڈھائی گئی ہیں۔ آگ لگائی گئی ہے۔ چیختے ہوئے درختوں اور روتی ہوئی ندیوں کے اس شہر میں سب کا اعتماد لوٹا گیا ہے۔ معصوم بچوں کی آنکھوں میں ٹوٹے خواب اور آنسو ہیں۔ قتل گاہوں میں لاشوں کا انبار ہے۔ اس جلتے ہوئے شہر میں لپکتے ہوئے شعلے، راکھ کا ڈھیر ہے۔ بے زباں گلیوں اور زخمی سڑکوں کی خاموشیاں ہیں۔ منڈلاتے ہوئے گدھ اور اونچائی پر بیٹھے چیل ہیں۔ ہر طرف عدم سلامتی کا احساس ہے۔ سینے کے اندر زخم اور زخموں پر چھڑکا ہوا نمک ہے۔ المختصر شاعر وہ منظر دیکھ رہا ہے جو دیکھا نہیں جاتا۔ وہ قہر سامانی ہے کہ ''زمیں چیختی ہے''۔

ان ترجمہ شدہ نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ترجمے کی زبان میں وہی متن ہے جو اصل زبان میں ہے۔ اس فن پارے میں واقعیت، تجربے کی عمومیت، خلوص اور صداقت ہے۔ ان نظموں کے انسلاکات اور موضوعات سے ان کی فطری جہات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح نظریات، خیالات، جمالیات اور اخلاقی قدروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اصل کیفیت کے ساتھ افکار و نظریات کو شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ شعر کی روح کو قائم رکھتے ہوئے فکر کی گہرائی و گیرائی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ ترسیل میں آسانی پیدا کی گئی ہے۔ قاری کو حقائق سے روشناس کرایا گیا ہے۔ مترجم نے خود بھی حظ اٹھایا ہے اور ہمیں بھی محظوظ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ قیصر شمیم نے ادب کو پڑھا ہے سمجھا ہے اور اپنی قوت و صلاحیت کا جادو جگاتے ہوئے اردو ادب میں اہم اضافہ کیا ہے۔ ادب کی، ادبی اقدار کی، ادب کے نئے رجحانات کی اور ادب کی افادیت کی تشہیر کی ہے۔ ان سے اردو ادب کی جہتیں وسیع اور کشادہ ہوئی ہیں۔ کسی شاعر کی نظم کا ترجمہ اصل فنکار کو آئیڈیل بناتا ہے۔ قیصر شمیم کا آئیڈیل ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام ہی نہیں بنگلہ کے اور بھی شاعر ہیں۔ شاعری نقالی ہے اور ترجمہ کی شاعری نقالی کی نقالی، ہنرمندانہ نقالی۔ شاعری کسی خیال کو شعری جامہ پہنانے کا نام ہے۔ قیصر شمیم نے ان ترجمہ شدہ نظموں میں دوسرے کے خیال کو خوب سے خوب تر انداز میں پیش کیا ہے۔ جس طرح علامہ اقبال نے راجہ بھرتری ہری کا خیال مستعار لے کر یہ شعر کہا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

قیصر شمیم نے نرم و نازک کلام پیش کر کے پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا ہے۔ چونکہ مترجم خود ایک تخلیقی فنکار ہے، لہٰذا کمال ہنرمندی سے اس نے یہ ترجمہ شعری اصول کے ساتھ کیا ہے۔ قیصر شمیم نے ترجمہ یوں کیا ہے جیسے یہ ان کی اپنی زبان کی شاعری ہو۔ لہٰذا ان نظموں کے تخلیقی ترجمہ میں زبان و بیان، لب و لہجہ اور اسلوب و آہنگ کو دیکھا جائے۔ قیصر شمیم نے ان نظموں کے عنوان کا بھی ترجمے کیا ہے اور نفس مضمون کا بھی۔ یہ سارا ترجمہ انھوں نے مفاہیم کی قربت و صحت کے ساتھ کیا ہے۔ ترجمے کی خوبی کے سبب ہر لفظ آئینہ صورت ہو گیا ہے۔ اس شفاف ترجمے میں متبادل اور مناسب اصطلاح سے زندہ تاثر قائم کیا گیا ہے۔ ترجمہ براہ راست ہے اور اس میں بے محاورہ زبان کا استعمال ہوا ہے۔ قیصر شمیم نے حسب ضرورت اردو ہندی، انگریزی اور بنگلہ الفاظ سے استفادہ کیا ہے۔ ہندی چھندوں اور روپوں کا استعمال قیصر شمیم کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔ لفظوں کے اندرون میں پوشیدہ حرارت سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ انتخاب لفظ پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ لفظوں کو سیاق و سباق کے حوالے سے برتنا وہ خوب جانتے ہیں۔ قیصر شمیم اردو اور ہندی کے نرم و نازک الفاظ قرینے سے ترتیب دینے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ الفاظ کے سادہ اور دل کش برتاؤ سے وہ آشنا ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں وہ مناسب و متوازن احتیاط کے قائل ہیں۔ اشارے کنائے کی باریکیوں سے آشنا ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے برتاؤ میں فنی چابکدستی سے کام لیتے ہیں۔ متذکرہ نظموں میں کھردرے لہجے کا بانکپن اور فطری شعور ملتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم کے کینوس پر الفاظ و تراکیب اور شعور و افکار کا رنگ بھرنے میں قیصر شمیم کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ نظم کے لیے زبان و اسلوب کی حد تک جس سنجیدہ ڈکشن کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہاں کارفرما ہے۔

استاد شاعر ہونا فخر کی بات ہے مگر قیصر شمیم ایسے استاد شاعر ہیں کہ شاگرد کو ان کے شاگرد ہونے پر فخر ہے۔ بنگال اور بیرون بنگال کے سو سے زائد شعرا کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وہ خود بھی شمس مظفر پوری، پروفیسر عباس علی خاں بیخود اور پرویز شاہدی کے شاگرد رہے ہیں۔ جس شاعر نے تین تین اساتذہ سے تربیت پائی ہو اور جس نے سو سے زائد شاگرد کی تربیت کی ہو۔ ایسے شاعر کا شعری رموز و نکات سے بخوبی واقف ہونا فطری ہے۔ چنانچہ قیصر شمیم نے نوک پلک کو سلیقے سے سنوار کر چیزوں کو پیش کیا ہے۔ فکر انگیز نظموں کے ترجمے میں پختہ کاری دکھائی ہے۔ یہ آورد کی شاعری ہے مگر اس میں آمد کا رنگ و آہنگ ہے۔ زبان اور اصول کے ساتھ تہذیب کا بھی ترجمہ ہوا ہے۔ تہذیبی شعور اور فنی اسلوب نے ان نظموں کو انفرادیت بخشی ہے۔ درجن بھر نظموں کا ترجمہ معنی رکھتا ہے۔ ان میں پابند نظمیں بھی ہیں اور آزاد بھی، طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ موضوع اور اسلوب سے روشناس کراتی ہوئی خود کار اور کارگر ہیئتیں ہیں۔ قیصر شمیم کے شعری اثاثے میں صرف اتنی ہی نظمیں ہوتیں تو بھی ان کا تشخص واضح ہوتا کیونکہ ان میں پہچانی آواز یا پہچان لی جانے والی آواز ہے۔ یہ نظمیں سادہ بھی ہیں، جوش سے بھری ہوئی بھی اور اصلیت پر مبنی بھی۔ ان میں خیال کی بنیاد ایسی چیزوں پر ہے جو درحقیقت وجود رکھتی ہیں۔ غرض کہ حالی نے شعر کی جو خوبیاں بتائی ہیں، وہ ان نظموں میں ہیں۔ ایک ایسے مترجم کی شاہکار نظمیں پڑھ کر قاری کا محظوظ ہونا یقینی ہے، جس میں دوسرے کی تخلیق کو اپنا بنا کر پیش کرنے کی ہنرمندانہ صلاحیت ہے۔

■

Dr.Badr Mohammadi
AT - Chandpur Fatah
P.O. - Bariarpur - 843102
Distt - Vaishali (Bihar)
Cell-9939311612
E-mail:badrmohammadi1963@gmail.com

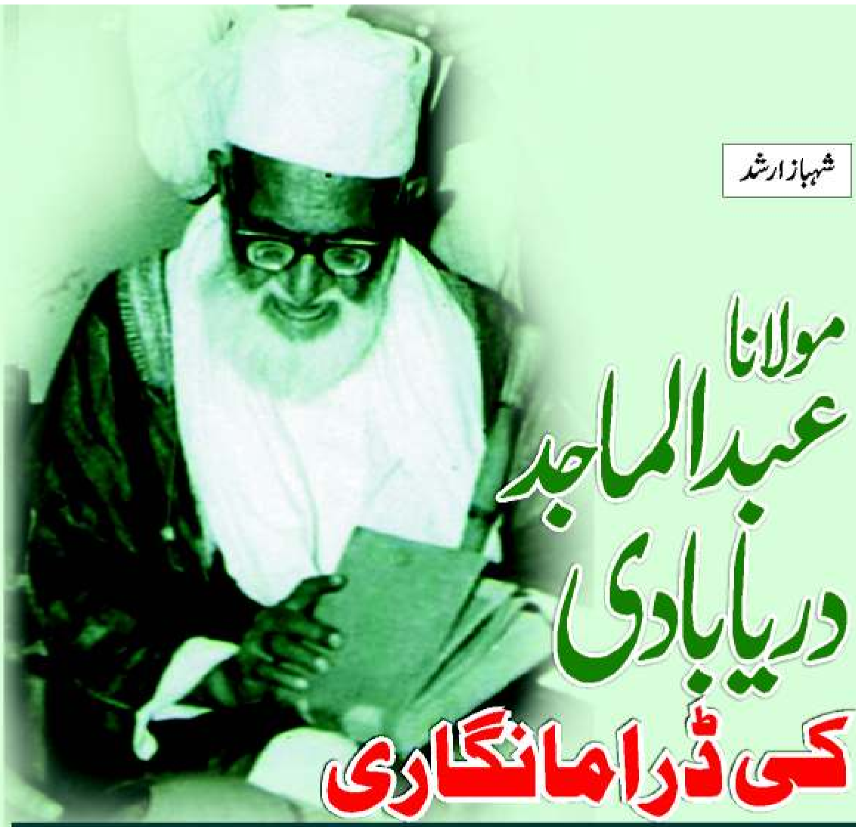

شہباز ارشد

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ڈرامانگاری

مولانادریابادی کو صنف ڈراماسے بھی بچپن ہی سے دل چسپی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے خود ڈرا مہ میں حصے لیا۔یہ ذوق جوانی میں بھی باقی رہا۔ ڈرامے سے دل لگی کی وجہ سے وہ تھیٹربھی پہنچے اوریہ ایک بار نہیں باربار ہوا۔ وہ اکثر ڈرامادیکھنے اسٹیج اورتھیٹر کا طواف کیاکرتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ولادت اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی کے مشہور قصبہ ’دریاباد‘ کے ممتاز اور ذی علم قدوائی خاندان میں 17 مارچ 1892 کو ہوئی۔ دریاباد ان کا آبائی وطن تھا لیکن ان کے خاندان کے اکثر افراد لکھنؤ میں بود و باش کرتے تھے۔ عبدالماجد دریابادی اچھی تعلیم کے لیے لکھنؤ جیسا شہر چھوڑ کر اپنے آبائی قصبے دریاباد میں بس گئے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی انھوں نے دریاباد میں رہنا پسند کیا اور اپنی زندگی کے تقریباً 55 سال دریاباد میں گزارے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بلند پایہ فلسفی، بہترین صحافی، عظیم ادیب، بہترین مصلحِ ادب اور ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے خاص شغف تھا لیکن انھوں نے کبھی بھی بلاضرورت شاعری نہیں کی۔ اس لیے ان کا بہت زیادہ کلام تو نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے بہت خوب ہے۔ شاعری سے بھی انھوں نے قوم و ملت کی ترقی اور اصلاح کی کوششیں کی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی شخصیت اپنے ہم عصروں میں مسلم تھی۔ ان کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خیالات کا اظہار ان جملوں میں کیا ہے:

”آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالت میں حق امتیاز و استثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں۔ انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی اے بھی ہیں مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو ان شاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا۔“

(بحوالہ عبدالماجد دریادی، سلیم قدوائی، ساہتیہ اکادمی، پہلا ایڈیشن 1998، ص 24)

مولانا دریابادی کو صنف ڈراما سے بھی بچپن ہی سے دل چسپی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے خود ڈرامہ میں حصے لیا۔ یہ ذوق جوانی میں بھی باقی رہا۔ ڈرامے سے دل لگی کی وجہ سے وہ تھیٹر بھی پہنچے اور یہ ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ وہ اکثر ڈراما دیکھنے اسٹیج اور تھیٹر کا طواف کیا کرتے تھے۔

جب انھیں لگا کہ ڈراما بجز وقت گزاری کے سوا کچھ نہیں تو اپنے قیمتی وقت کو علم و ہنر کے حصول میں صرف کرنے کا عزم کیا، لیکن ڈرامے سے دل چسپی ہمیشہ دل کے ایک گوشے میں باقی رہی۔

انھوں نے بچپن میں اردو ڈرامے کو ایسی حالت میں دیکھا تھا کہ نہ اس فن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی کسی ادیب کو اس صنف ادب کی اصلاح کی پرواہ تھی۔ ایک مدت کے بعد فن ڈراما کی حیثیت میں کچھ تبدیلیاں ضرور آئی تھیں، کچھ بڑے ادیبوں نے ڈرامے کی زبان و بیان کی اصلاح کے لیے اپنی توجہ بھی اس طرف مبذول کی تھی، لیکن اردو ڈراما ابھی تک شریفوں کا فن نہیں بن سکا تھا۔ اردو ڈرامے کی ایسی صورتِ حال دیکھ کر مولانا دریابادی سن شعور ہی سے دکھی تھے۔ پھر اردو ڈرامے سے بچپن کی دل چسپی نے بھی انھیں مجبور کیا کہ فن ڈراما کی اصلاح ہونی چاہیے اور انھوں نے ایک معاشرتی ادبی اصلاحی ڈراما ’زود پشیماں‘ تصنیف کیا، جس کا اصل مقصد ڈراما کی زبان کی اصلاح تھی۔

ڈراما ’زود پشیماں‘ کو انھوں نے بمبئی کے سفر کے دوران ٹرین میں لکھا تھا، جو پہلے ماہنامہ ’الناظر‘ میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کی پہلی قسط جون 1916 میں شائع ہوئی اور پھر مسلسل کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں یہ ڈراما کتابی صورت میں بھی منظرِ عام پر آیا۔ کتاب میں بھی ڈرامانگار کے نام کی جگہ ’ناظر‘ لکھا گیا۔ خود مولانا دریابادی نے ذوالفقار بخاری کو ایک خط میں لکھا ہے:

”ایک نئی چیز آپ کو بتادوں جو آپ کے علم میں نہ ہوگی۔ اپنی نوعمری کے زمانے میں مَیں نے ایک ڈراما ’زود پشیمان‘ لکھا۔ ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں 1915 میں قسط وار نکلتا رہا، ڈراما نگاری اس وقت متانت علم کے منافی تھی۔ اپنا نام چھپا کر محض تخلص ’ناظر‘ بننا پڑا تھا۔“

(مکتوبات ماجدی (جلد اول)، ادارۂ انشائے ماجدی، کلکتہ، سنہ اشاعت 1982، ص 183)

اقتباس بالا میں مولانا دریابادی نے ’زود پشیماں‘ کی اشاعت کا سال 1915 لکھا ہے جب کہ تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زود پشیماں کی پہلی قسط جون 1916 میں منظرِ عام پر آئی تھی۔

’ناظر‘، مولانا دریابادی تخلص کرتے تھے۔ ڈراما ’زود پشیماں‘ میں نام کی جگہ تخلص استعمال کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں ڈرامے کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مولانا اس کی زبان سے مطمئن نہیں تھے نیز اس میں فنی لوازمات کا فقدان تھا۔ انھی چند وجوہات کی بنا پر جب ڈاکٹر محمد حسن نے مولانا دریابادی کو ’زود پشیماں‘ کو اسٹیج کرنے کی اجازت کے لیے خط لکھا تو 14 مئی 1956 کو اس خط کا جواب، مولانا دریابادی نے اس طرح دیا:

”آپ کا خط پا کر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہو گیا۔ تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب و تحسین کی توقع

مجھ دقیانوسی ملامدیرِ صدق سے ع

عشق ومزدوریِ عشرت گہِ خسروکیاخوب!"

'زودپشیماں' بالکل نوعمری کی تصنیف ہے اور وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ۔شیکسپیئر کا نشہ اس وقت سوار تھا اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں اب اگر کتاب پر نظرِ ثانی کروں تو پچاس فیصدی بدل ڈالوں۔ ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر ہی سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں" (ایضاً ص 182)

مولانا دریابادی نے زودپشیماں کو اسٹیج کرنے کی اجازت دینے میں شش و پنج کی جو وجہ مذکورہ بالا اقتباس میں بیان کی ہے وہ اپنی جگہ یقیناً درست ہے جس کی طرف ڈاکٹر عشرت رحمانی نے بھی اشارہ کیا ہے،لیکن ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں مہذب مسلم معاشرے میں ڈراما اور تھیٹر عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے؛ اور مولانا دریابادی ایک معزز گھرانے کے چشم وچراغ تھے؛ اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جگ ہنسائی ہو۔

'زودپشیماں' جب ماہنامہ الناظر میں قسط وار چھپ رہا تھا تو اس ڈراما کو کسی نے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی، لیکن جب وہی ڈراما کتابی شکل میں منظرعام پر آیا تو عبدالحلیم شرر، سید سلیمان ندوی، سجاد حیدر یلدرم اور مرزا ہادی رسوا جیسے اردو کے نابغہ روزگار کے دیباچے کتاب میں موجود تھے۔سید سلیمان ندوی مرحوم نے تو زودپشیماں کی تعریف میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

"اگر قلت ضخامت وصفحات کوئی عیب نہ ہوتو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی ڈرامہ علم وفن کی حیثیت سے ہماری زبان میں نہیں لکھا گیا۔"

(بحوالہ عبدالماجد دریابادی، سلیم قدوائی، ساہتیہ اکادمی، پہلا ایڈیشن 1998، ص 61)

مولانا دریابادی نے اس ڈراما میں کم سنی کی شادی کے نقائص اور سماج میں اس سے مرتب ہونے والے مضر اثرات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔یہ ایک اصلاحی ڈراما ہے جس میں فنی لوازمات کا فقدان ہے، لیکن مکالموں کی برجستگی اور اندازِ بیان بے حد دل کش ہے۔مکالمے کی پیشکش میں کہیں کہیں طوالت اور خطاب سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔زبان وبیان کی اگر بات کی جائے تو اس کی زبان صاف اور سادہ ہے، جس کا اعتراف تمام ناقدوں نے کیا ہے۔

مولانا دریابادی نے 'زودپشیماں' کو خالص ادبی پیرایے میں تخلیق کیا تھا۔اس ڈرامے سے ان کا مقصد شہرت یا واہ واہی نہیں تھی بلکہ اردو ڈراما میں جو خامیاں اور بے راہ رویاں روایتاً چلی آرہی تھیں ان کے سدِ باب کی یہ ایک چھوٹی سی کوشش تھی۔زودپشیماں کے دیباچے میں الناظر کے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ:

"اب ہمارے ایک لائق دوست مسٹر'ناظر' نے ان اصلاحی تجاویز کی بنا پر جو مروجہ ڈراموں کے متعلق ان کے ذہن میں تھیں، ایک ڈراما لکھا ہے جس میں اپنے خیال کے مطابق انھوں نے ان تمام معائب کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو رائج الوقت ڈراموں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں" (عبدالماجد دریابادی احوال وآثار، ص 484)

'زودپشیماں' کے مطالعے سے ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ڈرامے کی صنف کو ادبی حیثیت دینے کے لیے اس زمانے میں صرف عام قلم کار ہی کوشاں نہیں تھے بلکہ عبدالماجد دریادی جیسے ماہر ادیب اور انشاپرداز شخصیت بھی اسے ادبی صنف بنانے کے لیے مستعد تھے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ'زودپشیماں' فنی اعتبار سے بہت کامیاب ڈراما تو نہیں ہے۔تاہم ادبی زاویے سے ان کی حیثیت مسلم ہے۔ پھر مولانا دریابادی نے اس ڈرامے کو ادبی حیثیت کے پیشِ نظر ہی لکھا تھا۔ ان کا مقصد اسے اسٹیج کرانا بالکل نہیں تھا۔اس لیے انھوں نے اس ڈرامے میں فنی لوازمات سے زیادہ ادبی تقاضے کو برتنے کی کوششیں کی ہیں۔

مولانا دریابادی کا دوسرا ڈراما 'بدسرشت' ہے۔ یہ ایک نامکمل ڈراما ہے۔جس کی ایک قسط ماہنامہ 'الناظر' کے اپریل 1917 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نامکمل ڈرامے کا ذکر مولانا نے کہیں نہیں کیا ہے۔یہاں تک کہ اپنی خودنوشت 'آپ بیتی' میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ڈاکٹر تحسین فراقی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے میں اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

"دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن اور ذوالفقار بخاری صاحبان کے نام خطوط اور 'آپ بیتی' میں ماجد نے محض اپنے ایک ڈرامے 'زودپشیماں' کا ذکر کیا ہے اور کچھ اس طرح گویا انھوں نے دوسرا کوئی ڈراما نہیں لکھا جبکہ انھوں نے 'زودپشیماں' کے علاوہ 'بدسرشت' کے نام سے بھی اس کے بعد ایک ڈراما لکھنا شروع کیا تھا جو بوجوہ مکمل نہ ہوسکا لیکن جس کی ایک قسط ماہنامہ 'الناظر' ہی میں اپریل 1917 کو شائع ہوئی۔" (ایضاً ص 482)

'الناظر' کے ایڈیٹر 'بدسرشت' کے دیباچے میں 'نظرے خوش گزرے' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"ہمارے دوست مسٹر ناظر کا ایک ڈراما 'زودپشیماں' کے نام سے سال گزشتہ شائع ہوچکا ہے اور اگرچہ جیسی خواہش تھی اربابِ ذوق نے اس کے متعلق توجہ کے ساتھ اظہارِ خیال نہیں فرمایا، تاہم توقع کے مطابق اکثر حضرات نے اسے پسند فرمایا۔'بدسرشت' کے نام سے دوسرا ڈراما مسٹر موصوف نے لکھا ہے جو اس پرچے کے ساتھ بصورتِ کتاب شائع کیا جارہا ہے تاکہ آئندہ چل کر علیحدہ چھاپنے کی زحمت نہ رہے۔ڈراما کے مکمل ہوجانے پر سرورق ان اصحاب کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا جو اس کی خواہش فرمائیں گے۔" (ایضاً ص 490)

مولانا دریابادی کے اس دوسرے ڈرامے 'بدسرشت' میں بھی 'زودپشیماں' کی طرح ان کی اپنی تین غزلیں شامل ہیں لیکن بہ مقابلہ'زودپشیماں' کی غزلوں کے، بہت کمزور ہیں۔ بدسرشت ایک معاشرتی واصلاحی ڈراما ہے۔جس کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ محسن حسین نام کے کردار کا ایک سابق بہنوئی محمد اکرم ہے جو معمر ہونے کے باوجود اپنی بڑی بھابی جو چودہ سال پہلے بیوہ ہوچکی ہے؛ اس کے گھر پیغامِ نکاح بھیجتا ہے اور یہ پیغام نکاح محض ہوس زر پرستی کے سبب ہے کیونکہ اس بیوہ کے نام جائیداد کا ایک بڑا حصہ ہے؛ جس پر قابض ہونے کے لیے شادی ایک آسان ہتھیار ہے۔ڈرامے کے ثانوی کردار محمد اکرم کا بیٹا اور بیٹی الفت آرا ہیں۔الفت آرا نئی نسل کی پڑھی لکھی، باوقار اور مذہب لڑکی ہے لیکن اس کا ہونے والا شوہر 'محمد' رشوت دہی اور کم علمی کے باعث بدنام ہے۔

مولانا دریابادی کے اس نامکمل ڈرامے کے مکالمے بہت چست اور کرداروں کی شخصیت کے مطابق ہیں۔ تمام کرداروں میں سب سے دلچسپ کردار محمد اکرم کا ہے جو ایک شاعر بے محل ہیں۔مہمل اور بے محل شعر کہنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔اپنا تخلص 'چیق' کرتا ہے۔ڈرامے کے چوتھے سین میں ڈراما نگار نے مشاعرہ کے عنوان سے شاعری کی جو سبھا منعقد کی ہے وہ اپنی ہیئت، دلچسپی اور طرز سے فرحت اللہ بیگ کے یادگار مشاعرے ہی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔تاہم مولانا دریابادی نے اپنی فنی چابک دستی سے اس سبھا کو بے حد دل کش اور اثر آفریں بنادیا ہے۔

بہرکیف! مولانا دریابادی کے یہ دو ڈرامے ہی ڈرامے کی دنیا میں ان کی یادگار ہیں، اس سے زیادہ اس میدان میں گرچہ ان کی خدمات نہیں ہیں لیکن ان دو ڈراموں کے مطالعے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس فن سے مکمل واقفیت تھی۔

■

Shahbaz Arshad
Asst Prof., Dept of Urdu
Khwaja Banda Nawaz University
Gulbarga - 585104 (Karnataka)
Mob.:6281262057

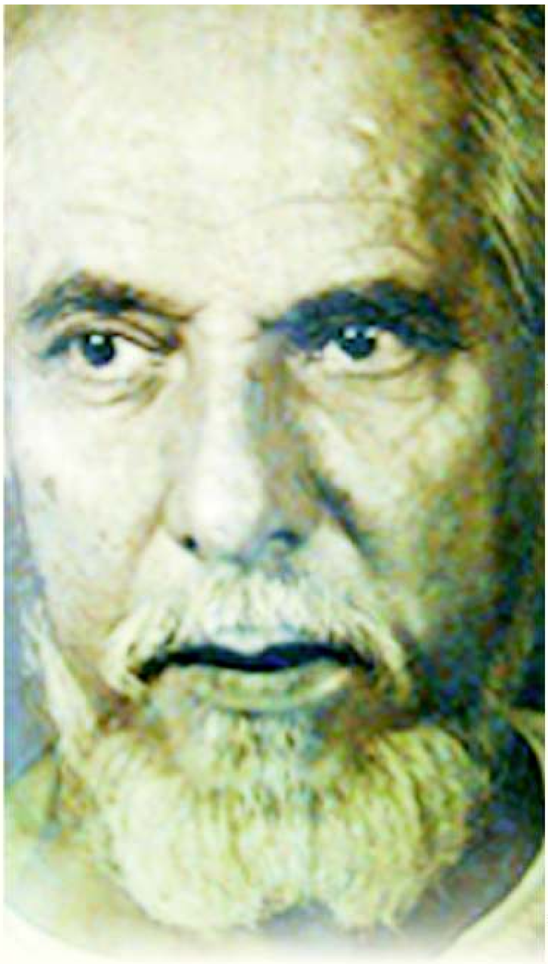

منصور خوشتر

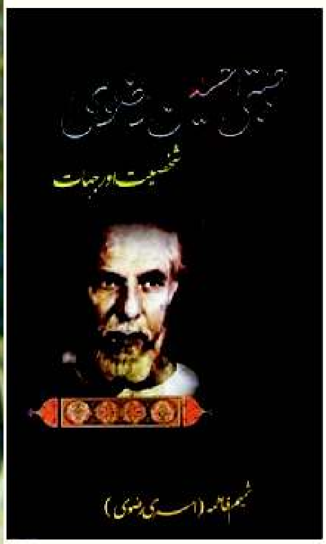

اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ دسترس

اجتبیٰ رضوی مختلف موضوعات پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کا اصل نام سید اجتبیٰ حسن تھا اور تخلص رضوی رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش بہار کے ضلع چھپرہ میں 1908 کو ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ان کے والد سید اظہر حسین بہت مخلص اور نیک صفت انسان تھے۔ اجتبیٰ رضوی صاحب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین وفطین تھے۔ 1925 میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1927 میں آئی اے بی۔ این کالج پٹنہ، 1929 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ 1929 میں ہی ضلع اسکول چھپڑہ میں ملازمت شروع کردی۔ ملازمت کے تین سال بعد رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے اور چھ سال بعد ہی ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے 1937 میں کلکتہ چلے گئے اور وہیں مولانا آزاد کی صحبت میں آگے کی زندگی گذارنے لگے۔ 1960 سے قبل اجتبیٰ رضوی صاحب راجندر کالج چھپرہ میں شعبہ اردو کے صدر تھے اور تاریخ و فلسفے کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اس کے بعد 1960 میں وہ بحیثیت پرنسپل ملت کالج دربھنگہ میں اپنی خدمات دینے لگے۔ انھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت کے ذریعے ملت کالج کی صورت کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ ملت کالج کی عمارت کی تعمیر کا کام بھی اپنی نگرانی میں کرایا اور کالج کو ایک صورت دی۔ 1975 میں وہ متھلا یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر منتخب ہوئے اور وہیں سے 1984 میں سبکدوش ہوئے۔ ادبی دنیا ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی احسان مند ہے کہ انھوں نے 'ذکر اجتبیٰ رضوی' کے نام سے کتاب مرتب کرکے ان کی زندگی کے مخفی گوشوں کو اجاگر کرنے کی بھرپور سعی کی۔ پروفیسر اجتبیٰ رضوی نے شاعری کا آغاز 1924 میں کیا۔ ان کا 1954 میں پہلا مجموعۂ کلام 'شعلۂ ندا' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

قدم بوسی ساقی واجب شرع محبت ہے
محبت ہی خدا ہے اور محبت ہی خداخانہ
محبت سوز موسیٰ بھی ہے سحر سامری بھی ہے
یہی وحدت کا افسوں ہے یہی کثرت کا افسانہ

***

ماضی میں حال کو سموتے جانا
سرمایۂ ممکنات کھوتے جانا
ہستی کے مسافرو! یہ کیسا دستور
ساحل پہ اتر کے ناؤ ڈبوتے جانا

***

تماشا کی وہ ارزانی وہ گنگا وہ صنم خانہ
بنارس کی سحرا شنان کی تقریب روزانہ
حرم والے ذرا کاشی کا منظر دیکھتے جائیں
کبھی دیکھیں گے جنت اور ابھی دیکھیں صنم خانہ

اجتبیٰ رضوی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اپنی تقریر کے ذریعے وہ بے حس دلوں میں جوش و ولولہ بھرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی نظموں کا انداز بھی اوروں سے جداگانہ ہوتا تھا۔

محسن رضا رضوی 'ذکر اجتبیٰ رضوی' کو مرتب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اجتبیٰ رضوی کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ 'شعلۂ ندا' 1954 کے اوائل میں ان کے قریب ترین دوست سید حسین احمد رعنا ایڈوکیٹ صدر گلی، پٹنہ سٹی نے لیبل لیتھو پریس پٹنہ سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں رباعی، نظم، غزل اور قصیدے کے علاوہ تین عدد مثلث اور آخر میں ابتدائی غزل گوئی کے کچھ نمونے شامل ہیں۔ رباعیات کے پانچ سلسلوں 'حکمت وحیرت' (79 رباعیاں) 'ساقی و مینا' (12 رباعیاں)، 'کوزہ وسبو' (6 رباعیاں)، 'نذر بارگاہ' (4 رباعیاں) اور 'سلک شکستہ' (16 رباعیاں) کے تحت کل 117 رباعیاں، منظومات کے تحت 29 پابند نظمیں، غزلیات میں دور اول (1939-1929) کے تحت 17 اور دور ثانی (1946-1954) کے تحت 25 غزلیں شامل مجموعہ ہیں۔

آزاد غزل کے بانی مظہر امام اجتبیٰ رضوی سے بہت قریب رہے۔ اپنے ایک مضمون 'اجتبیٰ صاحب' میں لکھتے ہیں کہ اجتبیٰ رضوی کو یاد کرنا اپنے ماضی کی راکھ کریدنے کے مترادف ہے۔ ماضی کی یادیں انسانی لاشعور کا بیش قیمت سرمایہ سہی مگر گردش ایام کو ہمیشہ پیچھے کی طرف موڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ یوں بھی زوال عمر کے ساتھ یادوں کے خیموں کی طنابیں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں۔ اس لیے اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ اہمیت کے پہلے تاثر کو یادوں کے دائرے میں لانا خاصا دشوار ہو رہا ہے۔

علامہ جمیل مظہری اجتبیٰ رضوی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اجتبیٰ رضوی نے مجھے فلسفے اور تصوف کی چاٹ دلائی اور مجھے دشت تحیر میں تنہا چھوڑ کر خانقاہ خودی یا بے خودی میں گوشہ نشیں ہوگئے۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی، مئی 1970)

رشید منظر اجتبیٰ رضوی کی شاعرانہ خصوصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جہاں تک اجتبیٰ رضوی کی شاعری کا تعلق ہے، آپ کا انداز فکر صوفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ بھی ہے۔ ان کے متعلق نقادوں کا یہ خیال کہ ادق الفاظ کی کثرت نے ان کے کلام کو بھونڈا بنادیا ہے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں فارسی اور عربی کے نامانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نہایت عمدہ صاف اور پرتاثیر نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔'' (ماہنامہ 'صنم' پٹنہ، نومبر، دسمبر 1962)

اجتبیٰ رضوی کی غزلیں ان کی نظموں سے ہیئت اور انداز بیان کے اعتبار سے مختلف نوعیت کی ہیں لیکن تخیل و فکر کے اعتبار سے ان میں بہت حد تک مماثلت ہے۔ انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا ذہنی یکسوئی کے لیے پریشان رہے۔ وہ ایمان بالغیب کو ہی سب کچھ نہیں سمجھتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خدا خود ان کے سامنے جلوہ گر ہوجائے۔ وہ تلاش و جستجو میں منہمک رہتے اور اس طرح کے اشعار کہتے۔

غبار بن کے آرزو رواں دواں ہے کو بہ کو
کہیں سے کچھ صدا تو ہو کہاں ہو تم کہاں ہو تم

اجتبیٰ رضوی کی تشکیک بسا اوقات اتنی شدید ہوجاتی ہے کہ انکار و الحاد تک معاملہ پہنچ جاتا ہے۔ ان کے یہاں اس طرح کے بہت سے اشعار ہیں جن میں بیزاری کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں:

ہر مذہب بے روح جسد ہے جذبے کی قلاشی ہے
راکھ کے تودے پجتے ہیں یہ کعبہ ہے وہ کاشی ہے
شرع کی قیل و قال سنی افسانہ دجلہ و حال سنا
ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے

اجتبیٰ صاحب کے تجربات و مشاہدات نے یہ ثابت کیا کہ عقل کبھی کبھی گمراہی کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ انھوں نے ایک عرصے تک فلسفہ و نظریات کو جن کی بنیاد عقل و فکر پر ہے اپنے لیے رہنما بنایا مگر ہمیشہ اپنے ضمیر کی تشنہ کامیوں سے الجھتے رہے۔ اس ضمن میں ایک شعر ملاحظہ کریں۔

وہ سوزن فکر جس نے اک دن یہ رخت تہذیب سی دیا تھا
اسی کی کاوش سے آج دیکھو یہ پیرہن تار تار بھی ہے

فکر و فلسفے سے مزین ہونے کے علاوہ اجتبیٰ رضوی کی غزلوں کا ایک حصہ غزل کا عام رنگ لیے ہوئے ہے جس میں چلتے پھرتے مضامین شامل ہیں۔ ان شعروں میں بڑی تازہ کاری اور تازہ خیالی ہے۔ ان میں اجتبیٰ صاحب اپنی خوشی اور سرشاری محبت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا ذکر وفا لکھ کر مورخ یہ بھی لکھتا ہے
یہ اک رسم کہن تھی اب کہیں برتی نہیں جاتی

***

نہیں سہی مرے نالوں میں کچھ اثر نہ سہی
نظر کچھ آپ کی بے چین ہے ادھر نہ سہی

***

چمن اسے اتفاق کہہ لے گری تو ہے آشیاں پہ بجلی
نہ دو قدم آشیاں سے پیچھے نہ دو قدم آشیاں سے آگے

اجتبیٰ صاحب اپنی منظومات کی طرح اپنی غزلوں میں بھی ایک مخصوص لب و لہجے کے ذریعے اختصاص اور انفرادیت کے متلاشی ہیں اور انفرادیت کی کھوج نے ان کے یہاں ایسا تیور پیدا کردیا ہے جسے غزل کی نئی آواز کا اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں فکری گہرائیوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں سے اس کی تلافی کی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جو قدیم مزاج کے غماز ہیں۔ چند اشعار۔

سر کو سینے پر کھ کے سن لیجے
آپ سے دل کو کچھ شکایت ہے
دل کی دھڑکن جو ہے مدارِ حیات
اک ذرا تیز ہو تو آفت ہے

***

تم کو بھی بھول جائیں یہ نوبت نہ ہوسکی
واحسرتا کہ ہم کو فراغت نہ ہوسکی

اجتبیٰ رضوی نے بہت سی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں کلاسیکی شاعری کا عمدہ عکس موجود ہے۔ عشق کلاسیکی اردو شاعری کا اہم ترین جز ہے۔ اجتبیٰ رضوی نے بھی اس موضوع کو خوبصورتی کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں واردات عشق میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ دو رباعیاں ملاحظہ کریں۔

وہ دن ہی بدل گئے وہ راتیں بدلیں
وہ حسرت و آرزو کی گھاتیں بدلیں
اب ہم ہیں اور ایک عالم اے دوست
دل کیا بدلا تمام باتیں بدلیں

***

ٹھٹھرے ہوئے دل میں ہے تہیج باقی
یا ریت پہ ہے نقش تموج باقی
کب کا ٹوٹا یہ ساز ارماں لیکن
ہر تار میں اب تک ہے تشنج باقی

اجتبیٰ رضوی ہم عصر سیاسی تحریکوں سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ انھوں نے مولانا آزاد، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو پر نظمیں لکھیں لیکن ان کی نوعیت تہنیتی سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی رباعیوں سے گمان ہوتا ہے کہ عملی طور پر علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود انھوں نے اپنی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کا نچوڑ پیش کیا۔ اس نوعیت کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

یہ دکھ، یہ درد، یہ مصیبت، یہ گناہ
یہ قسمت نسلِ آدم گم شدہ راہ
رہبر جو ملے وہ بن کے انجم چمکے
اور رہ گئی انسان کی تقدیر سیاہ

اجتبیٰ رضوی نے تصوف سے بھی روشنی حاصل کی۔ علم و معرفت ہی کے ذریعے ان پر خالق و مخلوق کے رشتے کا انکشاف ہوا۔ اس حقیقت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہر شمع کو گل تا بہ سحر ہوجانا
ہر قصر کو اک روز کھنڈر ہوجانا
ہر کنگرۂ سر بہ فلک کی تقدیر
ہے سنگ سر راہ گذر ہوجانا

اس طرح اجتبیٰ رضوی کی رباعیاں ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز، نقش و نگار اور رنگ و بو سے مملو ہیں۔ ان میں ذاتی و کائناتی تجربے اور مشاہدے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اجتبیٰ رضوی کی غزلیہ، نظمیہ اور رباعیاتی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کی شاعری جہاں ایک طرف زندگی کے گہرے اور پیچیدہ مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہے، وہیں زندگی کے عمومی مسائل بھی پوری فنکارانہ مہارت کے ساتھ اجتبیٰ رضوی کی شاعری کے موضوعات بنتے ہیں۔ وہ حقیقت کو فن اور فن کو حقیقت بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اجتبیٰ رضوی کی سب سے خاص بات یہی ہے کہ انھوں نے شعری افق پر اپنی ایک الگ شبیہ پیش کی ہے۔ شعرائے ادب کی کہکشاں میں اجتبیٰ رضوی کو ان کی خاص لفظیات اور طرزِ اظہار سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی ان کا انفراد ہے۔ بلاشبہ ان کے اشعار طویل مدتوں تک یاد کیے جائیں گے۔

■

Mansoor Khushter
Darbhanga Times
Purani Munsafi
Darbhanga- 846004 (Bihar)
Mob.:9234772764

سرزمین اجین سے اردو زبان و ادب کی بھینی بھینی خوشبو

غلام حسین

زمانۂ قدیم سے ہی تاریخی شہر اُجین علم وادب اور فکر وفلسفے کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے ادب کے ایسے درخشاں ستارے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے ہیں جن کی تابانی لافانی ہے۔ شاعر اعظم کالی داس اور بھرتر ہری اسی خاک کے خمیر ہیں جو سنسکرت ادب میں ممتاز مقام پر متمکن ہیں۔ کالی داس کی بے مثال اور باکمال تخلیق 'میگھ دوت' میں اجین کا دلکش انداز بیان موجود ہے۔ ہندو اساطیر کے مطابق وشوکرما 'خالق کائنات' نے خوبصورت عمارت والے شہر بسائے۔ بودھ مذہب کی روایت میں اُجین موجود ہے۔ مشہور سیاح البیرونی نے 'کتاب الہند' میں یہاں کے ایک سائنس داں اور علم کیمیا کے ماہر کا ذکر کیا ہے۔ 'آئینہ اکبری' اور 'منتخب التواریخ' میں اُجین کے راجا وکرمادتیہ کا ذکر ملتا ہے اور اس کی قدامت اور عظمت پر مورخین واد بار طب اللسان ہیں۔ اس شہر کا شمار ہندوستان کے آٹھ قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ محمود زکی کی نظم 'اجین کی یہ سرزمیں' اس کی مہتم بالشان روایت اور شان وشوکت کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے 'شپرا' ندی کے دونوں کناروں پر بنے ہوئے مندروں اور مسجدوں کی روح پرور فضا کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔

شپرا کے گھاٹوں پر بجی وہ مندروں میں گھنٹیاں
اور مسجدوں میں گونجتی آواز حق یعنی اذاں

'سانددپنی آشرم' اُجین کی ایک قدیم درس گاہ ہے۔ جہاں ہزاروں سال پہلے 14 علوم اور 64 فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ روایت یہ ہے کہ اس آشرم میں شری کرشن نے تعلیم حاصل کی تھی اور ایک بڑے سنیاسی سوامی جدروپ جو اپنی ریاضت کی وجہ سے ملک کے طول وعرض میں مشہور و معروف تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے ان سے ملاقات کی تھی اور اپنے بیٹے جہانگیر سے بھی ان سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔ سوامی جی کی قیام گاہ آج بھی اُجین میں موجود ہے۔ بھرتر ہری کی شاہکار 'شتک' آج بھی یادگار زمانہ ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے دوسرے شعری مجموعہ کلام 'بال جبریل' کے سرورق پر ان کے شتک کو اردو کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

جہاں تک اس سرزمین سے اردو کا تعلق ہے تو اس کی خوشبو اپنے تشکیلی دور سے ہی موجود ہے۔ قرین قیاس ہے کہ اس علاقے میں اردو شعر وادب کی شروعات پہلی جنگ آزادی 1857 کے بعد ہوئی۔ جب مغربی یوپی اور نواح دہلی کے وہ باشندے جن کی زبان اردو تھی ان پر انگریزوں نے ظلم وستم کیا تو اس خطے کو جائے امن سمجھ کر یہاں بود و باش اختیار کی۔ بعافیت گزران کرکے اردو شعر وادب کی شمع روشن کی۔ انیسویں صدی کی نصف آخر سے ہی یہاں اردو زبان وادب کا خاصا چرچا رہا ہے۔

اُجین کے شعر و ادب میں اول الذکر نام سید کرامت علی بشر کا ہے۔ جنھیں 'فخرِ مالوۂ' کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ وہ 1861 کو اجین میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کی بھی تعلیم حاصل کی اور

ریاست گوالیار میں ملازمت اختیار کی لیکن وہ ترک ملازمت کر کے تجارت کرنے لگے۔ انھیں بچپن سے ہی شعروشاعری سے رغبت تھی۔ وہ شعری و علمی محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ انھوں نے نبی بخش سے اصلاح لی اور کیفی کاکوروی سے بھی استفادہ کیا۔ اپنے ذاتی شوق و کاوش سے انھوں نے اُجین میں شاعری کا خوشگوار ماحول بنایا۔ اس سے ان کے ہونہار شاگردوں کا جم غفیر وجود میں آیا۔ اس دور کے شعروادب کی نشرواشاعت میں 'آفتاب مالوہ' نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کا پہلا شمارہ 1929 میں آگرہ سے شائع ہوا۔ اس میں اُجین کے علاوہ ملک کے دیگر مقامات کے قلم کاروں اور شاعروں کی نمائندگی ہوتی تھی، جس میں بشر صاحب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان

> یہ حقیقت ہے کہ اُجین کی یہ نسبت گوالیار کی شعری روایت مستحکم ہے۔ گوالیار ریاست میں کائستھ اور پنڈت عربی اور فارسی کے عالم، اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ ان میں اکثر شاعر بھی تھے۔ پنڈت سروپ نارائن ایمن، پنڈت چاند نارائن رازداں مونس، پنڈت گوری پرشاد کچلو، رام لال شجاع جیسے نستعلیق شعرا کی اُجین تشریف آوری پر شعر و ادب کی شمع روشن تر ہوتی گئی۔

کی صدارت میں کل ہند مشاعروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ 'انجمن گلزار ادب' کچھوچھہ شریف (ضلع امبیڈکر نگر، یوپی) کی جانب سے انھیں ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ وہ مذہبی اور اصلاحی شاعری کرتے تھے مثلاً۔

یتیموں غریبوں سے بے زاریاں ہیں
یہ اے مسلموں کیسی خود داریاں ہیں
یہ کیسی اُخوت یہ کیسا ہے مذہب
یہ کیسی تمھاری ملن ساریاں ہیں
خدا واسطے کی نہیں ہے محبت
جہاں دیکھو مطلب کی غم خواریاں ہیں

عظیم خان عظیم سے ان کی شاعرانہ چشمک تھی۔ اس دور کے اہم شاعروں میں منشی محمد تاج کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 1852 میں اُجین میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اجین اور اعلیٰ تعلیم گوالیار سے حاصل کر کے منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے زیادہ تر کلام خرد برد ہو گئے جو کچھ باقی رہ گئے تھے اسے ان کے لائق صاحبزادے نے 1984 میں 'کلام تاج' کے نام سے شائع کروایا۔

اجین کی پروقار ادبی شخصیت پربھولال گوڑ اشہر کی ہے۔ وہ اسی شہر میں 1882 کو پیدا ہوئے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم تھے۔ ان کے چار مجموعہ کلام ریاض اشہر، اشعار نادرہ، حالات رنگیں، ترانہ اشہر منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ مجاہد آزادی بھی تھے، گاندھی جی کی سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے 'چرخہ' نظم لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ اس کا ایک شعر اس طرح ہے۔

جو دن رات بھارت میں چرخہ چلے گا
تبھی مفلسی کا پھندا کٹے گا

یہ حقیقت ہے کہ اُجین کی یہ نسبت گوالیار کی شعری روایت مستحکم ہے۔ گوالیار ریاست میں کائستھ اور پنڈت عربی اور فارسی کے عالم، اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ ان میں اکثر شاعر بھی تھے۔ پنڈت سروپ نارائن ایمن، پنڈت چاند نارائن رازداں مونس، پنڈت گوری پرشاد کچلو، رام لال شجاع جیسے نستعلیق شعرا کی اُجین تشریف آوری پر شعر وادب کی شمع روشن تر ہوتی گئی۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی عطا الٰہی صدیقی کی ہیں۔ وہ گوالیار میں پیدا ہوئے وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہ نارائن پرشاد مہر کے شاگرد ہوئے۔ اُجین میں وہ اس وقت وارد ہوئے جب فخرِ مالوہ بشر اجینی کے لائق و فائق شاگردوں گویا قریشی، حسرت قریشی اور کاشف الہاشمی وغیرہ کا اردو شاعری میں چراغ جل رہا تھا۔ وہ اپنی صلاحیت، لیاقت، نظامت اور ادبی سرگرمیوں کی بنا پر جلد ہی اُجین میں ہردلعزیز ہو گئے۔ کچلو صاحب کے تعاون سے اُجین کے کارتک میلے میں قومی مشاعرے کی شروعات ہوئی۔ اس مشاعرے کی شہرت پورے ملک میں ہے اور اس کی روایت آج بھی برقرار ہے۔

عطا الٰہی کی شاعری آزادی اور وطن پرستی سے لبریز ہے۔ انھوں نے وطن کے جاں نثاروں کے کارناموں کو اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ حق پرست ہیں کتنے خوش مذاق عطا
خوشی سے جھومتے گاتے جو سوئے دار چلے
بلا سے کہ جو دامن میں آج خار چلے
چمن میں غنچہ و گل کا تو رخ نکھار چلے

آزادی کے بعد وطن کا نقشہ بدل گیا اور حالات دگرگوں ہو گئے۔ اس کی عکاسی ان کے کلام میں موجود ہے۔

کلی کلی کی زبان پر تھا شور آہ و فغاں
چمن میں خون بہا جشن نو بہار کے ساتھ

زندگی نشیب و فراز اور رَطب و یابس سے آراستہ ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں جب آسمان اپنا رنگ بدلتا ہے تو شاعر کے دل سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

عاشق بھی ترستے تھے دیدار کو جن کے
وہ صف میں نظر آئے دکانوں پہ

عطا صاحب کی شاعری میں عصری آگہی ہے، جس کا معتد بہ حصہ غم کا ہے۔ ان کے دو مجموعہ کلام 'سخن نامہ' اور 'غبار کارواں' زیور طباعت سے آراستہ ہوئے ہیں جن کی بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔

بشر صاحب کے نمایاں شاگردوں میں عبدالغفور قریشی المتخلص گویا جن کی پیدائش 1901 میں اجین میں ہوئی۔ وہ زود گو شاعر اور نامی گرامی وکیل تھے ان کا کلام ادبی رسائل میں شائع ہوتا تھا نیز آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتا تھا۔ ان کے مجموعاتِ کلام 'خم خانہ' اور 'سخن گویا' ہیں۔ ان کا انتقال 1978 میں ہوا۔ پس از مرگ ان کا کلام 1994 میں 'نقش سویرا' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اسی سلسلے کی کڑی شاعر چشتی ہیں جو 1914 کو اجین میں پیدا ہوئے۔ ان کا کلام 'آفتاب مالوہ' کے علاوہ ملک کے دیگر معروف رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ انھیں 'مصور جذبات' اور 'سحر البیان' جیسے القاب سے نوازا گیا۔ ان کا مجموعہ کلام 'متاع ساغر' 1941 میں شائع ہوا۔ ان کا انتقال 1943 کو ہوا اس موقع پر سلطان احمد نے کہا تھا۔

بزم سخن سے ایک سخن داں چلا گیا
شعر و سخن کا ماہر دوراں چلا گیا

عبدالرحیم قریشی تخلص حسرت کی پیدائش 1916 کو اُجین میں ہوئی۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے قانون کی سند بھی حاصل کی تھی۔ انگریزوں کے خلاف 'بھارت چھوڑو آندولن' میں وہ شریک ہوئے تھے۔ باغیانہ نظمیں کہنے کی پاداش میں وہ جیل بھی گئے۔ کالی داس، ترانۂ اردو اور 'میری جنم بھومی' ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ 'ترانۂ اردو' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

دنیا کی ہر زباں کو اپنے گلے لگا کر
آپس میں دوستی کا ہم کو سبق پڑھا کر
اپنا رہی ہے سب کو ہنس ہنس کر مسکرا کر
اردو زباں ہماری اردو زباں ہماری

حسرت قریشی کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ لہجے میں شائستگی اور خیالات میں پختگی ہے۔ ان کے چند حوصلہ افزا اشعار ملاحظہ کیجیے۔

خضر ملتے ہیں نہ منزل نہ مقام آتے ہیں
غم کی راہوں میں فقط حوصلے کام آتے ہیں

اٹھ کھڑے ہوں گے تو ہم راستے بنائیں گے
اور اگر بیٹھے تو منزل کا نشاں ہو جائیں گے

حسرت قریشی کا انتقال 44 سال کی عمر میں 1962 کو اُجین میں ہوا۔ پس از مرگ ان کا شعری مجموعہ 'صف مژگاں' 1984 میں شائع ہوا۔

امیر اجینی 1945 میں اجین میں پیدا ہوئے۔ وہ بشر اور گویا کے حلقہ احباب میں سے تھے۔ وہ 'بزم ادب' کے متحرک رکن تھے۔ ان کا انتقال 1984 میں ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد تاریک راہوں میں ان کا یہ شعر شمع رہ گزر اور حوصلہ افزا ہے۔

بجلیاں گرتی ہیں گرنے دے مگرائے باغباں
کیا چمن کو چھوڑ دوں اک آشیانے کے لیے

اجین کی اردو شاعری کو عظمت اور حرمت بخشنے والے کاشف الہاشمی 1922 مندسور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید ولایت ہاشمی ہے۔ وہ اردو و فارسی کے جید عالم اور شاعری کے محاسن و معائب سے بخوبی واقف تھے۔ گیارہ سال کی عمر میں انھیں شیخ سعدی، عرفی، اقبال اور غالب کے سیکڑوں اشعار ازبر ہو گئے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام 'تپش حیات' کو مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے 1994 میں شائع کیا۔ دوسرا شعری مجموعہ 'حرف تسکین' 2004 کو منظر عام پر آیا۔ اُجین کی اردو شاعری میں انھیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مسلم الثبوت شاعر تھے۔ انھیں اپنی عظمت کا خود احساس تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

ورق پر لکھا ہوا ہوں کہانیوں کی طرح
مجھے سنبھال کر رکھنا نشانیوں کی طرح

ان کا یہ دعویٰ درج ذیل اشعار میں سچ ثابت ہوتا نظر آتا ہے۔

زلفِ شب رنگ کے سائے میں عبادت کی ہے
ہم نے برسوں تیرے چہرے کی تلاوت کی ہے
ہم نے ہر شام جلا کر تیری یادوں کے چراغ
آبروئے شب ہجراں کی حفاظت کی ہے

—

کاشف ہمیں غزل سے محبت تھی اس لیے
برسوں غزل کے ناز اٹھا کر غزل کہی

کاشف الہاشمی کا انتقال 19 اپریل 2004 کو اُجین میں ہوا اور وہ لب شپرا مولانا موج قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

ہندی اردو کے سنگم محمود زکی 1924 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ذاتی طور پر اردو زبان و ادب میں دست گاہ اور سخن وری میں مہارت حاصل کی۔ یوں تو وہ آزادی سے پہلے ہی شاعری میں قدم رکھ چکے تھے مگر وہ آزادی کے بعد ادبی دنیا میں سرگرم عمل ہوئے۔ ان کا مجموعہ 'اعتبار' 1982 میں منظر عام پر آیا جس کی پر مغز تقریظ پروفیسر عتیق اللہ نے لکھی ہے۔ ان کی شاعری میں شباب کی دیوانگی اور سرشاری نہیں ہے بلکہ بیداری اور فرزانگی ہے تبھی تو وہ فرماتے ہیں۔

تری نظر کے اشاروں کی بات کون کرے
زمیں پہ رہ کے ستاروں کی بات کون کرے

—

مجھے نہیں ہے آرزو وصال یار کی زکی
وصال کو تو عشق کا زوال کہتے آئے ہیں

وہ عزم و حوصلہ، یقین محکم اور عمل پیہم کی دعوت دیتے ہیں۔

منزلِ مقصود کی جانب بڑھاؤ تو قدم
چاند تارے صرف گرد کارواں ہو جائیں گے

انھیں اردو زبان و ادب سے از حد لگاؤ تھا۔ اس کی بقا و تحفظ کی کاوش تا عمر کرتے رہے۔ انھیں اپنے وطن عزیز کی روایت اور وراثت سے بڑی انسیت تھی۔ ان کی نظمیں 'نذر کالیداس' اور 'کالیداس کا ترانہ' اس کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے 2008 میں 84 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

محمود احمد سحر افغانی النسل ہیں۔ ان کی پیدائش 1937 کو اُجین میں ہوئی وہ اپنی محنت و لگن سے تعلیم کے مدارج طے کرتے رہے۔ اردو اور انگریزی دونوں مضامین سے ایم اے کیا۔ سنسکرت زبان میں انھیں درک حاصل ہے۔ انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے مترجم اور پختہ مشق ناول نگار بھی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام 'گل پوش' 1960 میں شائع ہوا اور 'دشت شب زندہ' 1982 میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ انھوں نے 'کمار سنبھو' کا منظوم ترجمہ کیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے 2016 میں شائع کیا ہے۔ اس گرانقدر کتاب پر ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا۔ تقریباً 86 سال کی عمر میں وہ رواں اور دواں ہیں اور اپنے اس مصرعے کے مصداق ہیں ع

میں تندرست و توانا تھا شہر یاروں میں

ان کے برادر خورد شبیر احمد آرزو کا شمار زود گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'سر دہلیز' 2014 اور 'آواز کی آگ' 2005 میں شائع ہوئے۔ اُجین کے ادبی ماحول پر وہ چھائے ہوئے تھے۔ اب وہ باحیات نہیں ہیں مگر ان کے یہ حیات آفریں اشعار دلوں کو تڑپاتے اور روح کو گرماتے ہیں۔

خوابوں کی تعبیر بدلنے والی ہے
اب راتوں میں دھوپ نکلنے والی ہے
مجھے یقین ہے روشن ضمیر ہو جاتا
اگر تو شاہ کے بدلے فقیر ہو جاتا

اس تناظر اور تواتر میں ان باکمال ہستیوں کا تذکرہ لازمی ہے جنھوں نے اس جہان رنگ و بو میں اپنی آنکھیں کھولیں اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھیں استاذ شعرا کی تربیت اور سرپرستی میسر ہوئی۔ وہ آگے چل کر دنیائے ادب میں درخشاں ستارے بن گئے۔ کثیر المطالعہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک پروفیسر عتیق اللہ تابش 1941 میں اُجین میں پیدا ہوئے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں یہیں سے حاصل کیں۔ تدریس کے میدان میں قدم رکھا تو اُجین سے اورنگ آباد اور اورنگ آباد سے دہلی کا سفر بڑی کامیابی سے طے کیا۔ اپنی ذہانت و ذکاوت اور تخلیقات کی بنا پر اردو زبان و ادب کے افق پر چھا گئے۔ ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے لیکن انھیں شہرت تنقید میں ملی سچ تو یہ ہے کہ تنقید میں ان کی حیثیت ایک مورخ اور مبصر کی ہے۔ اردو ادب کے اعلیٰ ترین انعامات میں مدھیہ پردیش کا 'اقبال سمان' اور اتر پردیش اردو اکادمی کا 'مولانا ابوالکلام آزاد' شامل ہے۔ عزت مآب کا ادبی سفر جاری ہے۔

مستحکم ادبی روایت کو آگے بڑھانے میں رشید انور اُجینی غیر معروف نہیں ہیں۔ ان کا اصل نام عبدالرشید خان ہے۔ وہ اُجین میں 4 اپریل 1943 کو پیدا ہوئے۔ ان کا مجموعہ کلام 2005 میں منظر عام پر آیا۔ وہ منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ وہ شاعری کو عبادت تصور کرتے ہیں نیز الفاظ کے پرستار ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات زندگی سے اپنے اشعار کو قارئین اور سامعین کے لیے کار آمد بنا دیا ہے۔

بوڑھے شجر کے فیض کا عالم نہ پوچھیے
ہے گردشوں کی دھوپ میں سایہ کیے ہوئے
دشواریِ حیات ہے معراج زندگی
دشواریِ حیات ہے گھبرائیں کس لیے

وہ قوم کو محبت اور یگانگت کا درس دیتے ہیں۔

مل جل کر وہ کام کریں ہم
نفرت سب کے دل سے جائے
بستی ساری گھر ہو اپنا
آنگن سارا جگ ہو جائے

وہ منفی سیاسی حالات سے نالاں ہیں۔

پھول دیں گے نہ ثمر ہم کو نہ سایہ اپنا
یہ سیاست کے شجر صرف تباہی دیں گے

یہ شعلہ تعصب کا بلا خیز بہت ہے
گلشن نہ جلا ڈالے ہوا تیز بہت ہے

دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں مجھ کو
مٹی تو میرے ملک کی زرخیز بہت ہے

آدمی بن کے بھٹکنے میں مزہ آتا ہے
میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ فرشتہ ہو جاؤں

پروفیسر سید صادق 10 اپریل 1943 کو اجین میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن تک کی تعلیم یہیں سے حاصل کی۔ اردو مضمون میں ایم اے اورنگ آباد سے کیا۔ مہاراشٹر میں پہلے ہائی اسکول اور بعد میں کالج میں استاذ کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں سنبھالیں۔ یونین پبلک سروس کمیشن سے وہ Research Ass. Production کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور شعبۂ اردو میں پروفیسر اور صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ گونا گوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ مفکر، مصور، مترجم کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور پنجابی زبانوں پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی دلچسپی تصوف میں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی شروعات مزاحیہ شاعری سے کی اور صادق مولا کے نام سے مشہور ہوئے۔ پیروڈی بھی خوب سے خوب تر انداز میں کی ہے۔ ان کے دستخط، سلسلہ، کشاد اور 'خواب جلنے کا منظر' جیسے مجموعات منظر عام پر آئے۔ افسانوی مجموعہ 'لفظ کی موت' بھی شائع ہوا۔ اردو ادب میں ان کی شناخت ایک نقاد کی ہے۔ 'ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ' ان کی غیر معمولی تنقیدی کتاب ہے۔ انھیں بے شمار اعزازات اور انعامات مل چکے ہیں۔

احمد کمال پروازی 11 مارچ 1944 کو اجین میں پیدا ہوئے۔ 14 برس کی عمر سے ہی انھوں نے شاعری شروع کی اور ضمیر القادری صاحب کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے اردو شاعری میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ان کے کلام مشہور و معروف رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'مختلف' 1988 میں اور دوسرا مجموعہ 'برقرار' 2005 میں شائع ہوا۔ 29 دسمبر 2007 کو وہ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ ڈاکٹر ضیا رانا اور عبدالحمید گوہر نے ان کا مجموعہ کلام 'چاندی کا ورق' ان کے انتقال کے بعد شائع کروایا۔ ان کا منفرد انداز بیان قارئین اور سامعین کا دھیان منعطف کرتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ کیجیے۔

اب کے بھی میرے ہاتھ میں کیا آئے گا لوگو
اس قرض سے وہ قرض اتر جائے گا لوگو

فساد شہر میں بے ضابطہ نہیں ہوتے
یہ اک لگان ہے ہر سال بھرنا پڑتا ہے

عبدالرشید امکان، 7 فروری 1947 کو اجین کے محلّہ توپ خانہ میں پیدا ہوئے۔ مبدائے فیض نے انھیں شعری صلاحیت سے نوازا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1988 میں 'مابین' کے نام سے اور دوسرا شعری مجموعہ 'کسی بوند کے لب پر' 2008 میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری مسلم ہے۔

اکیسویں صدی میں بھی اُجین کا شعری سفر جاری وساری ہے لیکن اردو کی تعلیم و تربیت میں اب پہلی جیسی رغبت نہیں ہے۔اس نا خوشگوار ماحول میں تو کچھ ایسے شاعر ہیں جو اردو رسم الخط سے نا آشنا ہیں۔اس وجہ سے ان کی شاعری غنائیت سے محروم ہے۔وہ اپنے ترنم سے کچھ دور تو چلتے ہیں مگر منزل سے پہلے تھک جاتے ہیں،پھر بھی موجودہ نسل شاعری کے میدان میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 2009 میں 'جوہر قریشی ایوارڈ' سے انھیں نوازا ہے۔ ان کا شعری سفر بڑی تندہی سے جاری تھا وہ کووِڈ 19 کی زد میں آئے اور 2021 میں جاں بحق ہو گئے۔ انھوں نے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو قریب سے دیکھا ہے اور اس کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار اس آگہی کی آگ میں تپ کر کندن بن گئے ہیں۔

ایک سمت پیٹرول ہے ایک سمت آگ ہے
دونوں کے درمیاں ہے اپنا مکاں بھی

مشاعروں کے توسط سے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر احمد رئیس نظامی 26 جنوری 1962 کو اُجین میں پیدا ہوئے۔ 1980 سے ہی وہ ملک اور بیرون ملک کے مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں۔ اُجین کے کارتک میلے کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے روح رواں ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'اب جگنو نکلتا ہے' شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کو بڑے سلیقے سے شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کے شاعرانہ جوہر کو چند اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔

آنسوؤں کی آگ نے سورج بنا ڈالا ہمیں
بجھ نہیں سکتے سمندر اب ترے پانی سے ہم

آج ہم اترے ہوئے دریا سے ڈرتے ہیں رئیس
کھیلتے تھے کل تلک موجوں کی طغیانی سے ہم

پاس رکھ کر کیا کرو گے تم میاں احمد رئیس
اپنی دولت کو سبھی کے کام میں لایا کرو

قرض کے ملبے میں دب کر رہ گیا ہر اک مکیں
کتنا مہنگا پڑ گیا ہے خواب میں گھر دیکھنا

بیسویں صدی کے اواخر تک اُجین میں جن شعراء کرام کی بدولت اردو شعر و ادب کا پودا سرسبز و شاداب ہے ان میں شاکر اجینی، قمر اجینی، عصیم اجینی، راہی عنایتی، اقبال حیدری، اختر گوالیاری، حسنات قریشی، نسیم چمن، اقبال حسین انصاری، قمر الزماں صدیقی، اعزاز شمس، شکیب نیازی، واجد قریشی، نور اُجینی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ بہت سے ماہر فن اور استاد شعرا کے مجموعہ کلام کے مسودات تیار ہیں اور جلد ہی منظر عام پر آنے والے ہیں ان میں بطور خاص عبدالحمید گوہر، ضیا رانا اور زاہد خان زاہد قابل ذکر ہیں۔ اقتضائے ارزش کے تحت کچھ شعرا نے دیوناگری رسم الخط کو استعمال کیا ہے ان میں ثمر کبیر، راز رومانی، دھنی رام بادل اور پروفیسر رفیق احمد ناگوری جیسے کہنہ مشق شعرا شامل ہیں۔

اکیسویں صدی میں بھی اُجین کا شعری سفر جاری وساری ہے لیکن اردو کی تعلیم و تربیت میں اب پہلی جیسی رغبت نہیں ہے۔ اس نا خوشگوار ماحول میں تو کچھ ایسے شاعر ہیں جو اردو رسم الخط سے نا آشنا ہیں۔ اس وجہ سے ان کی شاعری غنائیت سے محروم ہے۔ وہ اپنے ترنم سے کچھ دور تو چلتے ہیں مگر منزل سے پہلے تھک جاتے ہیں پھر بھی موجودہ نسل شاعری کے میدان میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان میں سید امروز حق، افروز سحر، امجد خاں، سرخاب بشر، آصف زیدی، عبدالواحد واحد، شبنم علی، عائشہ احمد زلیخا، انصار احمد انصار وغیرہ کے نام سے اہل شہر واقف ہیں۔ ان میں زیادہ تر شعرا سوشل میڈیا سے منسلک ہیں۔ بے تامل شجر اردو جس زمین پر نشو و نما پا رہا ہے اب اس کی نمی میں کمی آ رہی ہے۔ یہ سچ ہے ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

■

Dr. Ghulam Husain
Head Dept of Urdu
Govt Madhav College
Ujjain- 456010 (MP)
Mob.:9893853183

عشرت ناہید

نیا دور
ایک عہد ساز رسالہ

اودھ جو کہ زبان و ادب کے فروغ کا اہم مرکز رہا ہے اسی خطے میں بسا تہذیب کا شہر لکھنؤ جس نے اپنے ادب و آداب سے پورے عالم میں اپنی پہچان قائم کی ہے۔ شعروادب اور اہل علم کے مرکز اس نگر کی ادبی روایتیں بھی شاہکار رہی ہیں۔ لکھنؤ یعنی علم و ادب کے گہوارے سے یوں تو کئی ادبی رسائل جاری ہوئے لیکن نیا دور کا شمار صف اول کے رسائل میں کیا گیا جبکہ یہ رسالہ ابتدا میں اس نام سے خصوصی طور پر ادبی رسالے کی شکل میں جاری نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ 1947 کے بعد یعنی آزادی کے بعد حکومت اتر پردیش نے اپنی سرکاری اطلاعات اور اپنے منصوبے و مقاصد کو بطور خاص اردو سے واقف عوام تک پہنچانے کے لیے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا جس کا نام 'اطلاعات' رکھا گیا، اس میں محض سرکاری پریس نوٹ شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے مدیر اعلیٰ علی جواد زیدی تھے جنھوں نے بہت آہستگی سے اس میں ادبی تخلیقات کو بھی جگہ دینا شروع کیا جس کی وجہ سے کچھ عرصے میں ہی اس کا رنگ روپ بدلنے لگا۔ تب علی جواد زیدی نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند جی جو کہ نہ صرف اردو زبان جانتے تھے بلکہ شاعر بھی تھے، انھیں ایک تجویز پیش کی کہ اس رسالے کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کا نام تبدیل کر دیا جائے اور 'نیا دور' رکھ دیا جائے۔ انھوں نے تجویز کو بخوشی منظور کر لیا۔

اس سلسلے کی پوری روداد علی جواد زیدی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''رسالے کا نام برابر کھٹکتا رہتا تھا۔ ''اطلاعات''۔ یہ بھی کوئی نام تھا! وہ بھی ایک ایرانی روز نامے سے ماخوذ۔ جہاں اس وقت شہنشاہی نظام مسلط تھا! نام پکارتا رہتا تھا کہ میں سرکاری رسالہ ہوں۔ نیا نام کیا ہو اس پر کافی غور و خوض کیا گیا۔ کئی نام ذہن میں آئے۔ اس میں ادبی شان بھی ہو اور سماجی معنویت بھی۔ انھیں میں ایک نام نیا دور بھی ذہن میں آیا۔ پہلے اس نام کا ایک رسالہ بنگلور سے ممتاز شیریں اور صمد شاہین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا لیکن وہ لوگ کاروبار بند کر کے بیرون ملک چلے گئے۔ اب یہ نام خالی تھا۔ رجسٹرار نیوز پیپرس آف انڈیا سے دریافت کر کے نام تبدیل کرنے کی تجویز میں نے ڈائریکٹر کی وساطت سے ڈاکٹر سمپورنا نند جی کو بھیجی۔ انھوں نے نام پسند تو کیا لیکن ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی دیا کہ کچھ اور نام بھی سوچ لیے جائیں تو اچھا ہو۔ میں نے کچھ اور نام بھی تجویز کر کے بھیجے لیکن اسی عرصے میں وہ وزیر اطلاعات نہ رہے اور عارضی طور پر یہ محکمہ خود وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت نے سنبھال لیا۔ اب فائل ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے نام 'پنچایتی راج' تجویز کر دیا۔ اس کے مقابلے میں تو اطلاعات ہی غنیمت معلوم ہونے لگا۔ بارے سمپورنا نند جی نے پھر وزارت سنبھالی اور میں نے انھیں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ انھوں نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے 'نیا دور' نام کی منظوری دے دی۔ اب صحیح معنوں میں اس رسالے کا نیا دور شروع ہوا۔'' (اشاریہ ماہنامہ نیا دور ص: 143)

یوں 'اطلاعات' نے آگے بڑھتے ہوئے نیا دور میں قدم رکھا اور ایک نئی ادبی منزل کی جانب خود کو گامزن کر لیا اور کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا ہاں لیکن اس نے اپنے بنیادی مقصد کو بھی کبھی فراموش نہ ہونے دیا یعنی سرکاری اطلاعات اس کا ایک خاص حصہ باقاعدہ بنی رہیں۔ اپریل 1955 میں نیا دور کا پہلا شمارہ جاری ہوا۔ اور پھر قارئین نے دیکھا کہ یہ رسالہ ماہ در ماہ اسم با مسمّیٰ بنتا گیا۔ اس نے ادب کی ایک نئی تاریخ مرتب کرنا شروع کی ادب کو ایک معیار بھی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

چونکہ نیا دور کے نام سے کسی نئے رسالے کو جاری نہیں کیا گیا تھا بلکہ اطلاعات کی نوعیت بدلی گئی تھی لیکن یہ محض نام کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ سرکاری اطلاعات کے ساتھ ادبی تخلیقات کے امتزاج نے اسے ایک خوبصورت ادبی مرقع بنا دیا۔ اس مرقع کی تمام تر خوبصورتی اور معنویت اس کے مدیران کی انتھک محنت، لگن اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ بلا شبہ ان مدیران نے خون جگر سے اس کی آبیاری اور نشو و نما کی تھی۔

اسی ابتدائی دور میں خاص نمبرات کی شروعات بھی، آزادی نمبر اور گاندھی جینتی نمبر سے ہوئی۔ علی جواد زیدی صاحب کے بعد جتنے بھی مدیر اس سے وابستہ ہوئے انھوں نے اسی نقش اولین پر قدم رکھتے ہوئے اسے نئی منزلوں کی طرف گامزن رکھا۔

نیا دور کے مدیران گرامی میں علی جواد زیدی، محمد فرحت اللہ انصاری، صباح الدین عمر، خورشید احمد، امیر احمد صدیقی، سید امجد حسین، شاہ نواز قریشی، نجیب انصاری، سید خالد احمد، وضاحت حسین رضوی، سہیل احمد، عاصم رضا، انجم نقوی، غزال ضیغم ہیں، موجودہ ایڈیٹر ریحان عباس ہیں

بحیثیت مدیر سب سے پہلا نام علی جواد زیدی کا ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ادبی تخلیقات کو رسالے کی زینت بنانے میں پیش قدمی کی تھی بلکہ قارئین کے اشتیاق کو بڑھانے کے لیے 'آپ سے ملیے' جیسے دلچسپ کالم کا بھی آغاز کیا۔ اس کالم میں ملک کی اہم شخصیتوں کے

خاکے ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ قارئین میں بہت مقبول ہوا۔ اسی کے ساتھ علی جواد زیدی کے لکھے اداریے بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے تھے ان کے اداریے ادب کی مقصدیت اور افادیت کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں جو کہ قلمکاروں کو ادب کے مقاصد کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے جنوری 1957 میں تعمیری ادب نمبر بھی نکالا جو کہ بہت مقبول ہوا۔

علی جواد زیدی کے دور میں اطلاعات نے نیا دور کا روپ لیا اور پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگا لیکن اسی دوران ایک واقعہ ایسا بھی رونما ہوا جس سے نہ صرف اس کی چمک ماند پڑنے کا ہی اندیشہ پیدا نہ ہوا بلکہ گہن کے ہی پورے پورے آثار پیدا ہو گئے۔ اس واقعہ کو علی جواد زیدی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نیا دور پر ایک مشکل وقت بھی آپڑا تھا، میں مختصر سی رخصت پر لکھنؤ کے باہر گیا اور میری غیر حاضری کے دوران میرا کام میرے رفیق بلبھدر مشرا (ڈپٹی ڈائرکٹر) معمول کے مطابق دیکھنے لگے ان کے پاس معاوضوں کی رقم میں حاشیائی اضافے کی فائل بھیجی گئی کبھی کبھی ایسا بھی ہو جایا کرتا تھا کہ محکمے سے نکلنے والے رسائل میں سے کسی ایک کے یہاں خصوصی شمارے وغیرہ کی اشاعت کے باعث ماہانہ مقررہ رقم سے تجاوز ہو جاتا تھا لیکن ایسی کمی بیشی اشاعت کے مجموعی بجٹ سے پوری کر لی جاتی تھی۔ یہ ایک معمول تھا اور دفتر نے ایسی ہی تجویز رکھی بھی تھی۔ مشرا جی نے اچانک یہ سوال اٹھا دیا کہ نیا دور کو بند کر دینا چاہیے کیونکہ اب سرکاری زبان ہندی بن گئی ہے۔ اس کے بعد فائل نہایت تیزی اور خاموشی سے حد یہ ہے کہ سکریٹری محکمہ کے بالائے سر آگے بڑھتی ہوئی وزیر اطلاعات کے پاس پہنچ گئی اور انھوں نے تعرض کے بغیر مہر تصدیق ثبت کر دی اور سکریٹریٹ کے قاعدے کے مطابق وزیر کے یہاں سے فائلیں واپسی سفر پر سکریٹری کے پاس لازمی طور سے آتی تھیں، سکریٹری آنند نرائن سپرو آئی سی ایس سر تیج بہادر سپرو کے فرزند تھے، انھیں یہ بات بے حد ناگوار گزری کہ اتنے اہم مسئلے سے متعلق فائل بالا بالا وزیر کو بھیج دی گئی اس کے علاوہ انھیں یہ بھی حیرت ہوئی کہ راقم الحروف نے ابتدائی منزلوں میں یہ تجویز، اختلاف و احتجاج کے بغیر کیسے قبول کر لی۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ اردو سے متعلق تمام کام میری ہی وساطت سے انجام پاتے ہیں چنانچہ انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تب پہلی بار مجھے اس کاروائی کا علم ہوا۔ میں نے بتایا کہ یہ ساری کارروائی میری مختصر سی غیر حاضری کے دوران ہوئی ہے اور مجھے تو اب پہلی بار معلوم ہو رہا ہے انھوں نے مجھ سے تصدیق چاہی کہ رسالہ تو وزیر اعلا کے حکم کے بغیر جاری نہیں ہوا ہوگا؟ میرے اثباتی جواب پر انھوں نے ایک تفصیلی نوٹ براہ راست وزیر اعلا کو لکھوایا اور یہ بات زور دے کر کہی کہ اس فیصلے سے اردو کا نہیں حکومت کا نقصان ہوگا کہ حکومت کی اطلاعات اردو داں کو نہیں پہنچ سکیں گی اور اس سے اردو داں طبقے میں خواہ مخواہ کی بے چینی پیدا ہوگی۔ وزیر اعلا پنڈت گووند بلبھ پنت نے سکریٹری کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے رسالے کو جاری رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی اور شعبہ اردو میں اس فیصلے پر جشن کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور رسالہ پوری آب و تاب سے ترقی کے زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔''

(نیا دور صف صدی نمبر: نیا دور کا زریں دور: علی جواد زیدی ص 74)

اس طرح یہ رسالہ اپنی بقا کی جنگ اپنے ابتدائی مراحل میں ہی شروع کر چکا تھا لیکن اس کے مدیران نے اسے ایسا معیار عطا کیا کہ پھر ایک طویل عرصے تک اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ادب کی خدمت کرتا رہا۔

علی جواد زیدی نے گاندھی جینتی نمبر، جمہوریت نمبر، آزادی نمبر، تعمیری ادب نمبر جیسے خصوصی نمبر شائع کیے۔ ان کے بعد محمد فرحت اللہ انصاری نے جمہوریت نمبر شائع کیا اور پھر صباح الدین عمر جب اس کے مدیر بنائے گئے تو انھوں نے رسالے کی توقیر میں اضافے کی غرض سے اپنی تمام تر توانائیاں اس کی مرصع سازی میں صرف کیں۔

صباح الدین عمر نے اس ہنر کو ادبی صحافت میں بڑی خوبی سے استعمال کیا، زبان و بیان پر ہی نہیں قواعد و عروض و قافیے سے واقفیت کی بنا پر ایک ایک سطر ایک ایک مصرعے پر گہری نظر رکھتے انھیں درست کرتے جس کی بابت صلاح الدین عثمانی لکھتے ہیں:

''یہ ممکن نہ تھا کہ رسالے کی اشاعت میں کتابت کی ادنیٰ سی بھی خامی رہ جائے اخبار و رسالے کے صفحات میں مضامین سجانے lay out میں تو وہ ماہر تھے لکھنؤ کے اچھے کاتبوں کا کہنا ہے کہ ان کے بعد کتابت اور صفحات کے سجانے کا ہنر جاننے والا کوئی نہ رہ گیا۔''

(صلاح الدین عثمانی: صباح الدین عمر مرحوم، نیا دور نصف صدی نمبر مارچ اپریل مئی 1995)

اسی طرح ان کے اداریے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ایک اداریے کے متعلق ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں لکھتے ہیں:

''نیا دور کی صحافتی تاریخ میں سب سے طویل اداریہ بھی صباح الدین عمر کا لکھا ہوا ہے جو 26 جنوری 1960 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ اداریہ بہت باریک کتابت کے ساتھ نیا دور کے پانچ مکمل صفحات پر مشتمل ہے جو نیا دور کی موجودہ کتابت یا کمپیوٹر کی ٹائپنگ کے لحاظ سے کم از کم بیس صفحات کے برابر ہے۔ یہ پورا اداریہ قومی اور بین الاقوامی طور پر جمہوریت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔''

(ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، سہ ماہی روح ادب، جولائی تا ستمبر 2022، ص: 15)

صباح الدین عمر کی ادارت میں بھی خصوصی نمبر نکلنے کا سلسلہ برقرار رہا انھوں نے ملک کے عظیم رہنماؤں کی رحلت پر خاص نمبرات کا اہتمام کیا۔ مہاتما گاندھی نمبر، پنڈت جواہر لال نمبر، لال بہادر شاستری نمبر، افسانہ نمبر، غالب نمبر، احتشام حسین نمبر، جمہوریت نمبر اور اگست کے شمارے بھی نمبر ہی کی شکل میں شائع کیے یہ خصوصی نمبر قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنے۔ اسی کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین پر ایک خصوصی گوشہ 'نذر ذاکر' جون 1969 میں شائع کیا۔ ان کے دور کے یہ خصوصی نمبرات دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور مستند حوالے ہیں۔

مدیر سید خورشید احمد کی ادارت میں نیا دور کے خاص نمبر شائع ہوئے ان کی مدت ادارت میں تقریباً آٹھ خاص نمبر منظر عام پر آئے۔ ان میں سے امیر خسرو نمبر، جمہوریت نمبر (2)، انتودیہ نمبر، ترقیاتی نمبر، آزادی نمبر، مسعود حسن رضوی نمبر، عبد الماجد دریا بادی نمبر کچھ اس انداز سے جلوہ افروز ہوا اس کی بدولت نیا دور کے معیار میں زبردست اضافہ ہوا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، اقبال، سلام مچھلی شہری، اور شمیم کرہانی پر گوشے بھی نکالے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اہم ادبی خدمت یہ بھی رہی کہ انھوں نے ابتدا سے لے کر خود کے دور ادارت تک کے تمام شماروں کو ایک فائل کی صورت میں یکجا کر کے یوپی اردو اکیڈمی میں محفوظ کر دیا۔

امیر احمد صدیقی نے بھی خورشید صاحب کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اطفال نمبر، جمہوریت نمبر، آزادی نمبر، ترقیاتی نمبر، منشی نول کشور نمبر، اندرا گاندھی نمبر، عثمان عارف نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، منشی دیا نرائن نگم نمبر، فراق نمبر حصہ اول، فراق نمبر حصہ دوم اور یاد رفتگاں نمبر وغیرہ شائع کر کے اپنی کاوشوں کی دستاویز تیار کر ڈالی۔ نسیم انہونوی اور جمیل مہدی پر خصوصی گوشے شائع کر کے ان کی ادبی خدمات کو جاوداں کرنے کا اہم کام انجام دیا۔

شاہنواز قریشی کی نیا دور سے وابستگی ایک طویل عرصے تک رہی وہ دو مرتبہ اس کے مدیر بنائے گئے اور

مدیر سے پہلے وہ جوائنٹ ایڈیٹر، اور ایکٹنگ ایڈیٹر کے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی ادارت میں جو خاص نمبر منظر عام پر آئے ان میں قومی ہم آہنگی نمبر اور امبیڈکر نمبر، شمع حریت نمبر، وامق جونپوری نمبر، اور کیفی اعظمی خصوصی نمبر نکالے جو کہ قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔

شاہنواز قریشی کے بعد نیا دور کی باگ ڈور امجد حسین کے ہاتھوں میں رہی انھوں نے اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے قومی یکجہتی نمبر، اودھ نمبر حصہ اول، ضمیمہ اودھ نمبر، اودھ نمبر حصہ دوم، نصف صدی نمبر، گاندھی نمبر، یادگار آزادی نمبر شائع کیا اودھ نمبر بہت مقبول ہوا جو کہ بے حد یادگاری نمبر تھا۔ انھوں نے شیخ علی حزیں پر ایک گوشہ بھی شائع کیا۔ اس کے علاوہ امجد حسین نے ادیب اور شاعر کو ملنے والے اعزازیے کی رقم میں بھی اضافہ کروایا یہ تبدیلی بھی اہم تھی۔ نجیب انصاری جو زیادہ تر سب ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر تھے انھیں بھی نیا دور کی ادارت 6 ماہ کے لیے ملی جسے انھوں نے اپنی صلاحیت سے نبھایا۔

نیا دور میں ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی جیسی فعال شخصیت کا تقرر ہوا۔ ان کی ادارت میں سب سے پہلے مولانا محمد علی جوہر جیسا اہم نمبر قارئین کے سامنے آیا جسے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد تو وضاحت حسین رضوی نے سلسلہ وار خصوصی نمبرات نکال کر اپنے ادارتی عہد کو جو کہ 2004 سے 2016 تک رہا کو ایک تاریخی عہد میں بدل دیا۔ ان کی انتھک محنت کی بدولت پچیس خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر، علی جواد زیدی نمبر، ڈائمنڈ جوبلی نمبر، انقلاب 1857، رشید حسن خاں نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، شکیل بدایونی نمبر، رثائی ادب (دسمبر 2009)، میر تقی میر نمبر، عرفان صدیقی نمبر، اردو صحافت نمبر، مجاز نمبر، احتشام حسین رضوی نمبر، رثائی ادب (نومبر 2013) خمار بارہ بنکوی نمبر، منشی دوارکا پرساد نمبر، ترقیات نمبر، رثائی ادب نمبر (دسمبر 2014) محمود الٰہی نمبر، علی برادران نمبر، رثائی ادب نمبر (اکتوبر 2015)، جاں نثار اختر نمبر (دو حصوں میں) وجاہت علی سندیلوی نمبر، نوائے رفتگاں نمبر اور میر انیس نمبر۔ بلا شبہ اہم شخصیات پر معیاری مضامین لکھوانا کوئی آسان کام نہ تھا جس کی بدولت نیا دور ایک ایسا شہ پارہ بن گیا جس میں ادب اور ادیب دونوں ہی محفوظ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کئی گوشے بھی شائع کیے جن میں عرفان صدیقی، چودھری سبط محمد، منٹو، عصمت کے علاوہ بھی کئی ادیبوں پر ہیں۔

وضاحت حسین رضوی کی انتھک کوششوں کے طفیل اس کے صفحات کی تعداد میں اضافہ ہوا نہ صرف یہ کہ اس کے صفحات 32 سے 48 ہوئے بلکہ خریداروں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ انہی کی کوششوں سے ممکن ہو پایا۔ 2015 میں انھوں نے تخلیق کار کو ملنے والے اعزازیے کی رقم کو دوگنا کرا دیا یہ ان کی اردو دوستی کا بڑا ثبوت ہے، یہی نہیں انھوں نے رسالے کو اپنی کوششوں سے I.S.S.N نمبر بھی دلایا جس سے اسکالرز مستفید ہو رہے ہیں۔ وضاحت حسین رضوی نے نیا دور کی بازیافت کا بھی کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے نیا دور میں جتنے خصوصی نمبر شائع ہوئے ان کے مضامین کو نصاب بندی کے تحت جدید تدوین کے ساتھ دوبارہ منظر عام پر لانے کا کارنامہ انجام دیا جس سے ادب کے وہ قاری جو ان اہم شماروں سے محروم رہ گئے تھے ان تک ان کی رسائی ہو گئی بلا شبہ اس کام کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان خصوصی نمبرات کی مقبولیت کے باعث بعض نمبروں کو ہندی قارئین کے لیے ہندی میں بھی شائع کیا گیا۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر، مجاز، خمار بارہ بنکوی، اور دوارکا پرساد افق بطور خاص ہیں۔ جبکہ وہ اور کئی خاص نمبروں کی منظوری لے چکے تھے مگر ان کے تبادلے کے بعد وہ شائع نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر وضاحت حسین صرف ایک صحافی ہی نہیں بلکہ ایک قابل قدر محقق اور ادیب ہیں انھوں نے اردو ناولٹ پر تحقیق کی ہے۔ ان کی تقریباً 10 کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور وہ آج بھی پوری فعالیت کے ساتھ ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس رسالے کو جاودانی عطا کرنے میں جہاں مدیران کی کاوشیں ہیں وہاں اطہر مسعود کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا یقیناً ایک ادبی بد دیانتی ہوگی۔ اطہر مسعود صاحب نے اپنی پی ایچ ڈی کی تحقیق کا موضوع نیا دور کے اشاریے کو بنایا جو کہ ایک کار مشکل تھا لیکن اس مرد خوش خصال نے اس جوئے شیر کو سر کر کے ہی دم لیا انھوں نے پہلے 1955 سے 2001 تک کا کام مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری لینے پر کام کو بند نہیں کیا وہ مستقل اس کی اشاریہ سازی پر کام کرتے رہے 2020 تک کا اشاریہ مکمل کر چکے ہیں۔ ان کی اس عظیم ادبی خدمت کے لیے اردو ادب ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔

یہ رسالہ علم کا ایک ایسا مرکز بنا جس نے ذہن جدید کی آبیاری میں بھی اپنا بڑا کردار ادا کیا کیونکہ یہاں جو اصول مرتب کیے گئے تھے وہ تخلیق کے معیار پر مبنی تھے نہ کہ تخلیق کار کی شخصیت پر۔ یہی وجہ رہی کہ اتنے طویل عرصے تک ایک سرکاری سرپرستی میں نکلنے والا جریدہ جانبداری کے الزام سے بھی بچا رہا اور اس بات سے بھی کہ یہ محض سرکاری نظریات کی نمائندگی کرنے والا رسالہ ہے۔

المختصر نیا دور ادبی صحافت میں ایک نئے سورج کی طرح طلوع ہوا 'تھا' جس کی ضیا تقریباً سات دہائیوں پر محیط رہی۔ یہ ادب کا ایک برگ ثمر دار ثابت بھی ہوا جس پر اردو ادب کی تمام اصناف بطور شاخیں پھولی پھلیں، مختلف رنگ کی بہاریں خصوصی نمبر اور شماروں کی شکل میں لہلہائیں ادب کو ثمر دار کرتی رہیں۔ نئی نئی کونپلوں کی مانند ادیبوں اور شاعروں کی شناخت قائم کرتا رہا۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صورت حال کچھ یوں بدلی کہ بقول چکبست؎

زبان حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردش افلاک نے جاہ و حشم میرا

نیا دور کا جسے ہم عہد زریں کہیں اپنی ابتدا یعنی علی جواد زیدی سے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی ادارت تک کا زمانہ رہا۔ ڈاکٹر وضاحت رضوی کے بعد سہیل وحید نے اسے سنبھالا۔ دیدہ زیب انداز میں اور باقاعدگی سے رسالہ قارئین کو ملتا رہا۔ انھوں نے بھی نیا دور کی روایت کے مطابق مجتبیٰ حسین خصوصی نمبر شائع کیا۔ جو کافی پسند کیا گیا۔ نیا دور کے معیار کو سید عاصم رضا نے بھی برقرار رکھا انھوں نے گورکھپور نمبر ترتیب دیا تھا، جو چند وجوہات کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔ نیا دور جس نے اپنے اولین دور میں ہی اپنے زوال کی سازشوں پر دستخط ہو جانے تک کے سانحے کو دیکھا تھا اور پھر اسی محکمے میں ہی اپنی بقا کی کاوشوں کو بھی سراہا اپنے آپ کو قائم رکھا تھا ان کے بعد یہ رسالہ رو بہ زوال بھی ہوا کیونکہ عاصم رضا کی زیر ادارت اس کا آخری شمارہ اکتوبر 2019 میں منظر عام پر آیا پھر غزال ضیغم مدیر رہیں لیکن انھوں نے کوئی شمارہ شائع نہیں کیا پھر انجم نقوی آئے جنھوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے ایک شمارہ جو کہ نومبر 2019 سے اکتوبر 2020 کا عام شمارہ تھا نکالا۔ ان کے بعد غزال ضیغم دوبارہ اس کی مدیر بنائی گئیں لیکن ایک بھی شمارہ منظر عام پر نہیں آیا۔

غزال ضیغم کے ریٹائرمنٹ کے بعد ریحان عباس کو مدیر کی ذمے داری دی گئی، نیا دور اب پھر جاری ہو چکا ہے موجودہ مدیر نے مشترکہ شمارے کے طور پر خوبصورت شمارہ جاری کیا۔ اسی طرح انھوں نے فکشن نمبر بھی شائع کیا اور امید ہے کہ یہ رسالہ اپنی اسی آب و تاب کو برقرار رکھے گا اور پھر ادب کی معاصر آواز بن کر افق ادب پر جھلملائے گا۔

■

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor, MANUU, Lucknow Campus
504/122, Tagor Marg, Near Shabab Market
Daliganj, Lucknow - 226020 (UP)
Mob.:9598987727

اردو کو روٹی روزی سے جوڑنا ضروری ہے

اشتیاق سعید

موضع مہاراج پور ضلع اعظم گڑھ میں حاجی عبد الرزاق کا شمار شرفا میں ہوتا رہا ہے۔آپ زمیندار گھرانے سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی حاجی عبدالرزاق صاحب کے خلفِ ثالث ہیں۔ آپ کی ولادت 23 ستمبر 1966 کو مہاراج پور میں ہوئی۔جب ہوش سنبھالا تو خود کوگاؤں کے مکتب میں پایا۔یہی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا۔کھیلنے کودنے کے بھی دِن یہی تھے۔ چنانچہ بجائے پڑھائی کے لہو ولعب میں زیادہ دلچسپی لیتے اور والدِ محترم کے عتاب کا شکار ہوتے رہے۔ جیسے تیسے کرکے ابتدائی تعلیم مکمل کی پھر ثانوی تعلیم کے لیے جامعتہ الرشاد،اعظم گڑھ آگئے۔ یہاں کھیلنے کودنے اور شرارتوں کے مواقع کم کم ہاتھ آتے۔کیونکہ مدرسے کا ماحول تھااور اساتذہ بھی سخت گیر تھے۔ جامعتہ الرشاد سے قریب ہی شبلی منزل تھی جس میں ادارہ دارالمصنفین تھا۔ اِدارے میں مختلف موضوع پر ہزارہا کتابیں نیز دنیا بھر کے رسائل و جرائد تھے۔ یہیں سے ماہنامہ 'معارف' بھی شائع ہوتا ہے۔لہٰذافرصت کے اوقات میں دارالمصنّفین سے استفادہ کرنے لگے۔ کتابوں کی ورق گردانی نے انہیں جستہ جستہ کتابوں کا رسیا بنا دیا اور یہیں سے لکھنے پڑھنے کا رجحان بننے لگا۔ انٹر میڈیٹ کے بعد آگرہ یونیور سٹی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سندیں حاصل کیں اور اعظم گڑھ سے ملحق گاؤں میں واقع پرائمری اسکول میں‌اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ بعد ازاں شبلی کالج کے استاد ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ پیش ہے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی سے اشتیاق سعید کی بات چیت۔

اشتیاق سعید: ڈاکٹر صاحب فی زمانہ آپ ماہرِ شبلیات کے خطاب سے جانے پہچانے جاتے ہیں،اس لیے آپ سے میرا پہلا سوال یہی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کو موضوع بنانے کا خیال کیسے آیا؟

محمد الیاس اعظمی : ایم اے کے دوران غالب اور حالی کورس میں موجود تھے اِن کو پڑھتے ہوئے اکثر خیال آتا کہ اس میں مولانا شبلی نعمانی کو بھی ہونا چاہیے تھا... اس کے بعد میں نے مولانا شبلی کو پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ اِن کا کام تو ہر میدان میں ہے۔ اِن میں ہمہ گیری ہے اور میں مسلسل اِن کا مطالعہ کرتا رہا کافی پڑھ لینے کے بعد پتا چلا کہ وہ جس پائے کے تھے ان کے شایانِ شان ان پر کام نہیں ہوا ہے۔ پھر میں نے مولانا کے ان گوشوں کو تلاش کیا جن پر کام نہیں ہوا تھا اور ان کے فراموش کردہ گوشوں پر کام شروع کردیا۔

اس: اب تک آپ نے مولانا شبلی پر کل کتنی کتابیں تحریر کی ہیں؟

م ا ا: کل چھبیس کتابیں ہیں۔اِن میں ایک کتاب دو جلدوں میں ہے اور ایک تین جلدوں میں۔انھیں بھی شمار کیا جائے تو کل تیس کتابیں ہیں۔

اس: کتابوں کے عنوانات بتا سکتے ہیں؟

م ا ا: بیماری کے سبب حافظہ تو کمزور ہو چکا ہے پھر بھی لکھیے جیسے جیسے یاد آتا جائے گا بتاتا رہوں گا۔ آثارِ شبلی، کتابیاتِ شبلی، مکتوباتِ شبلی، مراسلاتِ شبلی،شبلی شناسی کے سو سال،نوادراتِ شبلی، علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو، مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں شبلی کا حصّہ،شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، اقبال اور دبستانِ شبلی، متعلقاتِ شبلی، شبلی اور جہانِ شبلی، شبلی اقتباسات کی روشنی میں، شبلی سخنوروں کی نظر میں، اثراتِ شبلی (دو جلدیں)، خطباتِ شبلی (نو دریافت)، شبلی کے فارسی خطوط ایک مطالعہ، شذراتِ شبلی، شبلی خودنوشتوں میں، علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں، نقوشِ شبلی، کلامِ شبلی کے اعلام واشخاص، بیانِ شبلی (تین جلدیں)، تصانیفِ شبلی کے تراجم، شبلی ایک بازیافت، شبلی کے مکتوب الیہ

اس: ماشاء اللہ آپ کا حافظہ تو قوی ہے۔آپ نے غالباً ساری کتابوں کے نام لے لیے۔کیا آپ نے محض علامہ شبلی پر ہی خامہ فرسائی کی ہے یا دوسرے موضوعات پر بھی کچھ لکھا ہے؟

م ا ا: قرأت کے فن پر چار کتابیں تحریر کی ہیں: اسہل

التجوید، علم ترتیل، تذکرۃ القراء، قرأ عظام اوران کے علمی اور دینی کارنامے اِس کے علاوہ کئی لوگوں کی سوانح لکھی ہے: شاہ معین الدین احمد ندوی حیات و خدمات، یگانۂ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی ادبی مضامین کے چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں: عکس واثر، مطالعات ومشاہدات، حرف واثر، لفظ واثر، عظمت کے نشاں، ساحلوں کے شہر میں (سفرنامہ)

اس: کیا آپ نے کچھ کتابیں مرتب بھی کی ہیں؟

م ا: جی! آٹھ کتابیں مرتب کی ہیں:

علامہ شبلی کی موازنہ انیس ودبیر، علامہ شبلی کی اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر، شاہ معین الدین احمد ندوی کی متاعِ رفتگاں، مولانا مجیب اللہ ندوی کی کاروانِ رفتگاں، اسفار مجیب، کتابیاتِ مجیب، نشور واحدی کا کلیات حصّہ غزلیات، حصّہ منظومات

اس: آپ کی کل پچاس سے زائد کتابیں ہو چکی ہیں۔ اِن میں سے کئی کتابوں پر یا آپ کی قلمی کاوشوں پر کئی انعامات واعزازات بھی ملے ہوں گے؟

م ا: انعامات واعزازات تو ڈھیروں ملے ہیں مگر چند جو سرِ دست یاد آرہے ہیں وہ میں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں: شبلی کالج کا 'امتیازِ شبلی ایوارڈ'، شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشن ٹرسٹ، حیدرآباد کا 'افتخارِ شبلی ایوارڈ'، مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا کا 'جان گلکرسٹ ایوارڈ'، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کا 'مسعود حسن رضوی ایوارڈ برائے تحقیق

م ا: انعام واعزاز سے قلم کار، فن کار، مصور اور دیگر فنونِ لطیفہ سے منسلک لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہے اس سے مزید کام کرنے کی توانائی میسّر آتی ہے نیز آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ اس لیے تمام ادیبوں، فنکاروں اور آرٹسٹوں کو وقتاً فوقتاً انعامات واعزازات ملتے رہنا چاہیے۔

اس: اب یہ بتائیے فی زمانہ اردو کی سمت ورفتار کیا ہے؟

م ا: اِن دنوں اردو ترقی کی جانب گامزن ہے۔ شعر وادب پر کافی کام ہورہا ہے۔ کتابیں بھی خوب شائع ہورہی ہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہوگئی ہیں۔ سچ پوچھیے تو اردو میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے دم پر زندہ رہ سکتی ہے، بہ شرط کہ اِسے روٹی روزی سے جوڑا جائے۔ اگر اِسے روٹی روزی سے نہیں جوڑا گیا تو یہ ایک روز اپنی اصل حیثیت کھودے گی۔ اِس وقت اردو کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خود اردو والے اپنے گھروں میں بہت کم اردو بولتے ہیں اور اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، جو بحیثیت زبان اردو کی عدم ترقی کا سبب ہے۔ اگر اردو کے تئیں یہ رویہ نہ بدلا گیا تو اردو کے حسن سے یقینی طور پر ہم محروم ہوجائیں گے۔

اس: بجا فرمایا ڈاکٹر صاحب آپ نے۔ مگر اردو کو روٹی روزی سے جوڑنے کا طریقۂ کار کیا ہوسکتا ہے؟

م ا: اشتیاق صاحب، اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومتی سطح پر کوشش کی جائے، اور اردو کو بحیثیت زبان جو حقوق

سے جوڑنے کا رونا روتے ہیں دوسری جانب ادیبوں، شاعروں میں آپسی نااتفاقی ہے۔ ہر علاقے میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنی اپنی ڈھائی اینٹ کی مسجد تعمیر کررکھی ہے۔ کیا اِس سے اردو ادب کو فروغ ملے گا؟

م ا: اس سے بجائے فروغ کے نقصان ہوگا۔

اس: اچھا یہ بتائیے جو لوگ اردو کی روٹی روزی سے منسلک ہیں، مثلاً ہمارے اساتذہ! یہ اردو کو کتنا فیض پہنچا رہے ہیں؟

م ا: اساتذہ سے جس فیض کی توقع کی جاتی ہے، وہ تو ادا نہیں کررہے ہیں۔ البتہ تدریسی خدمات وہ ضرور انجام دے رہے ہیں۔

اس: چونکہ آپ خود بھی درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہیں چنانچہ آپ آج کے اساتذہ کے حالات پر روشنی ڈالیں۔

م ا: ہمارے اساتذہ کا حال یہ ہے کہ وہ چاہتے تو ہیں کہ اردو زبان وادب کی خدمت کریں، وہ یہ حق ادا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن کچھ وسائل کی کمی اور کچھ صلاحیتوں کے فقدان کی وجہ سے وہ محض استاد ہو کے رہ گئے ہیں۔ انہیں ملازمت کے تدریسی فرائض سے اوپر اٹھ کر اردو زبان وادب کے ذوق کو عام کرنے کے لیے جد وجہد کرنی ہوگی اور حکومتی سطح پر اساتذہ کو پورے طور پر فارغ البال کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھا سکیں۔

اس: ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس ڈھیروں کتابیں،

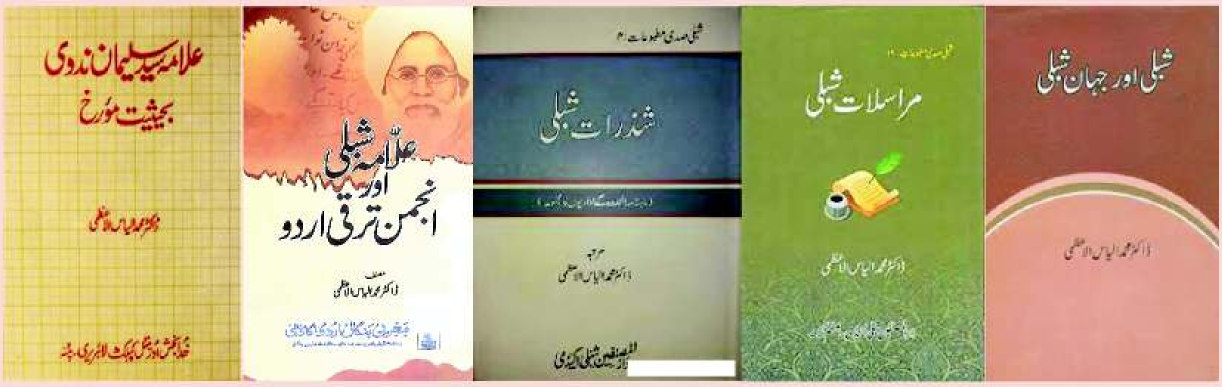

2018ء، ایک لاکھ روپے کا ایوارڈ، کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا، فاطمہ گرلس کالج اینڈ اسکول داؤد پور، نیشنل اسکول محمد پور، جامعۃ الفلاح اور بزم حفیظ، جونپور، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے سندِ توصیف اور اعزاز سے نوازا۔

اس: اچھا یہ بتائیے، جب بھی آپ کو اعزاز یا ایوارڈ سے نوازا گیا، آپ نے کیسا محسوس کیا؟

آئین نے دیے ہیں اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اردو کے مدارس ومکاتب قائم کیے جائیں۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو کو ترقی دی جائے۔ اردو کی جو بستیاں اور علاقے ہیں ان میں ان کی ضرورت کے لحاظ سے اردو میں کام کیے جائیں۔ مثلاً حکومت کے اعلانات، نوٹس، انتخابات کے تمام کاغذات اور عدلیہ کے ضروری کاغذات اردو میں فراہم کیے جائیں۔

اس: ڈاکٹر صاحب ہم ایک طرف اردو کو روٹی روزی

رسائل وجرائد لوگ تحفتہً ارسال کرتے ہیں۔ کیا آپ کو اِن تخلیقات میں خواہ شعری ہوں یا نثری وہ تنوع نظر آتا ہے جو گزشتہ صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں تھا؟

م ا: اس کے کئی اسباب ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہے، جن اصنافِ سخن میں گزشتہ صدی میں کام ہوا اور جو اہلِ اردو کے بہت قریب تھے۔ مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعیات اور غزل وغیرہ۔ اِن اصناف سے طبیعتیں مانوس تھیں۔ جبکہ ہمارے عہد میں جدید اصناف میں مثلاً ہائیکو، ماہیے،

مثلاً وہ اور جو دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں، اسی طرح نثری اصناف میں جو جدتیں اختیار کی گئی ہیں،ان سے اگر چہ ہمارے ادبا وشعرا واقف ہیں اور دادِ شعروادب بھی دے رہے ہیں۔مگر اِن سے ہمارا قاری واقف نہیں ہے۔اردو زبان و ادب میں اس وقت بہت بڑا مسئلہ قاری کا ہے۔اِس عدم توازن کی وجہ سے نہ تنوع نظر آرہا ہے اور نہ ہمارا ادبی حلقہ زبان و ادب کے ارتقا میں اپنا رول ادا کر پا رہا ہے۔اس کے تدارک کے لیے شعروادب کے حلقے میں وسعت پیدا کرنی ہوگی اور اصنافِ شعروادب سے عوامی طور پر انسیت پیدا کرنی ہوگی۔

اس: ڈاکٹر صاحب ! اردو ادب میں دو بڑے نقاد ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام گونج بن گئے ہیں۔دونوں کی تنقید سے ادب اور ادیبوں کو کتنا فیض پہنچا؟

م ا: اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں حضرات بڑے ادیب اور نقاد تھے اور دونوں نے اردو زبان و ادب کی تا حیات خدمت انجام دی۔شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی کتابیں اوران کے افکار زندہ رہنے والے ہیں، انہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔اسی طرح آں جہانی گوپی چند نارنگ نے بھی اردو زبان کی بڑی خدمت کی لیکن یہ دونوں نقاد ماضی کے ادیبوں اور نقادوں کے افکار ونظریات اوران کی کاوشوں سے بہت آگے نہیں جاسکے، یا بہت کچھ اضافہ نہیں کر سکے۔ ہمارے جو قدیم نقاد ہیں بالخصوص حالی اور شبلی اِنہوں نے اپنے عہد میں جو کچھ کر دکھایا اور جس طرح اثر انداز ہوئے، ماڈی وسائل کی آسانی کے باوجود شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ جس قدر کام کر سکتے تھے وہ نہیں کر سکے۔

اس: چونکہ تنقید خشک موضوع ہے اس لیے کیا اِسے لوگ باگ دِلجمعی سے پڑھتے ہیں؟

م ا: تنقید بلاشبہ پڑھی جاتی ہے جس طرح تخلیق ذوق و وجدان کو متاثر کرتی ہے اسی طرح تنقید تخلیقی شعور میں بالیدگی پیدا کرتی ہے۔

اس: یونیورسٹیوں کے زیادہ تر پروفیسران مؤلف اور مرتب کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔کیا آپ ایسے پروفیسران کو بھی جانتے ہیں جو باقاعدہ طور پر تخلیق کار ہیں؟

م ا: بہت سے پروفیسرز ہیں اور ماشاء اللہ کام بھی کر رہے ہیں۔ان کی تخلیقات گاہے گاہے رسائل و جرائد کی زینت بھی بنتی رہتی ہیں۔اس میں شعری ادب بھی شامل ہے اور نثری ادب بھی، لیکن المیہ یہ ہے کہ اِن کے قلم سے شعروادب کی ایسی تخلیق نہیں ہورہی ہے جو مثالی بن جائے۔نثری ادب میں متعدد بڑے افسانہ نگاروں نے اپنے عہد کے مسائل پر ان کی تخلیقات نے اثر ڈالی۔اب ایسی تخلیقات سامنے نہیں آرہی ہیں۔

اس: ڈاکٹر صاحب، آپ جب بھی ممبئی تشریف لائے تو مجھے یاد پڑتا ہے ڈاکٹر خورشید نعمانی سے نیاز حاصل کرنے ان کے گھر ضرور جاتے رہے۔موصوف سے آپ کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔آپ کچھ ڈاکٹر نعمانی صاحب کے بارے میں عرض کیجیے۔

م ا: ڈاکٹر خورشید نعمانی صاحب کا تعلق دبستانِ شبلی سے ہے اور میرا بھی۔اس تعلق کی وجہ سے ہم دونوں میں قربت بڑھی۔دوسری وجہ ہم دونوں ہی دبستانِ شبلی کے شعروادب اور تاریخ پر کام کرتے رہے ہیں۔موضوع کی یکسانیت کی سبب ان سے ملنے ملانے کا سلسلہ دراز ہوا۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے باوجود اس کے شفقت سے پیش آتے، میری حوصلہ افزائی کرتے۔مجھ پر اور میری کتابوں پر تبصراتی مضامین لکھے۔سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ ادیبوں اور نقادوں کی صف میں جن لوگوں نے مجھے پہنچایا ان میں ڈاکٹر خورشید نعمانی کا نام بھی شامل ہے۔آپ انتہائی شریف شخص تھے اور شعروادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔

اس: ڈاکٹر خورشید نعمانی کے علاوہ آپ کن ادیبوں کو اپنے قریب پاتے ہیں؟

م ا: میری رگ رگ میں تو علامہ شبلی نعمانی بسے ہوئے ہیں۔باوجود اس کے ہمارے عہد کے چند بڑے ادیب و نقاد جن میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام سب سے نمایاں ہے۔اِن کے علاوہ پروفیسر محمود الٰہی، ڈاکٹر اشفاق اعظمی، کبیر احمد جائسی، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، پروفیسر اصغر عباس مرحوم وغیرہ کے بہت قریب رہا ہوں اوران کی تصنیفات اور تخلیقات کو پسند کرتا ہوں۔

اس: ڈاکٹر صاحب، آپ نے غالباً پچاس سے زائد کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں تو یقیناً آپ کا کوئی شاگرد بھی ہوگا۔عموماً ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ شعرا و ادبا کے وصال کے بعد کم از کم ایک نسل تک استاد کو شاگردان زندہ رکھتے ہیں اوران کی میراث کے امین ہوتے ہیں؟

اس: عرض کردوں کہ میرا اب تک کوئی شاگرد نہیں ہے۔ میرا تعلق دبستانِ شبلی سے ہے۔مجھے قوی توقع ہے کہ دبستانِ شبلی کے اہلِ قلم اور مصنفین ہی میری فکر جو دراصل فکرِ شبلی کا حِصہ ہے، وہی اس کے امین ہوں گے اور وہی اس کو ترقی دیں گے۔میرے قریب بہت سے اہلِ قلم ہیں اور وہ مجھ سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں۔باوجود اِس کے وہ میرے شاگرد نہیں ہیں۔

> **اردو زبان و ادب میں اس وقت بہت بڑا مسئلہ قاری کا ہے۔اِس عدم توازن کی وجہ سے نہ تنوّع نظر آرہا ہے اور نہ ہمارا ادبی حلقہ زبان و ادب کے ارتقا میں اپنا رول ادا کر پا رہا ہے۔اس کے تدارک کے لیے شعر و ادب کے حلقے میں وسعت پیدا کرنی ہوگی اور اصنافِ شعر وادب سے عوامی طور پر انسیت پیدا کرنی ہوگی۔**

ا س: ڈاکٹر صاحب، آپ دارالمصنفین کے اعزازی رفیق ہیں۔آخر رفیق کی ذمہ داری کیا ہے؟

م ا: بڑے مصنفین کو ادارے سے جوڑے رکھنے کے لیے یہ عہدہ دیا جاتا ہے۔رفیق کا دوسرا کام یا ذمہ داری کہہ لیں تحقیق اور تصنیف ہوتا ہے۔

ا س: دارالمصنفین میں ڈائریکٹر کے عہدہ کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟

م ا: مجلسِ عاملہ اور مجلسِ انتظامیہ دو تنظیمیں ہوتی ہیں۔ مجلسِ عاملہ ڈائریکٹر کے عہدہ کا انتخاب کرتی ہے۔

ا س: ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ، جو آپ نے اپنا قیمتی وقت مجھ ناچیز کو دیا اور ہمارے قارئین کے لیے بہت سی معلومات مہیا کرائیں۔اب چلتے چلتے نئے لکھنے والے مصنفین کے لیے کچھ پیغام عنایت کردیں۔

م ا: اشتیاق صاحب شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے جو آپ مجھ سے ملنے ممبئی سے اعظم گڑھ تشریف لائے اور مجھ سے مکالمہ قائم کیا۔رہی بات نئی نسل کی تو میں انھیں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھتے ہوئے ادب کی تخلیق، تصنیف اور تالیف کا کام کریں۔ کتابوں کے مطالعے کا خاص طور پر اہتمام کریں۔اپنے علاقوں میں کتب خانے قائم کریں اور اردو کے قاری پیدا کریں۔ورنہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہماری تخلیقات اور تحقیقات بغیر قاری کے بے معنی ہوکر رہ جائیں گی۔

■

Ishtiyaque Saeed
B-01, New Mira Paradise,
Geeta Nagar, Phase-2,
Mira Road-401107, Thane (MS)
Cell.:9930211461
E-mail : ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

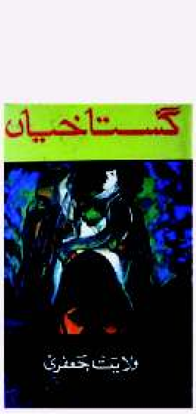

سہیل کاکوروی

وہ خود اپنی جگہ اک انجمن تھا

(ولایت جعفری مرحوم کی یاد میں)

ولایت جعفری صاحب رائے بریلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اس خاندان کے افراد میں حب الوطنی کے جذبے موجیں مارتے تھے۔ ان کے پردادا مجاہد آزادی تھے جن کے خاندان سے تہذیب اور شرافت کی جو روایتیں ان تک پہنچی تھیں ان کی نہ صرف انھوں نے پاسداری کی بلکہ خود کو ایک مثال بنا کر پیش کیا۔ ان پر دوران ملازمت بہت سخت وقت آئے لیکن ہمیشہ مسائل کو انھوں نے حکمت عملی سے حل کیا وہ خلوص سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ میں نے کبھی اس وقت بھی ان کی پیشانی کو شکن آلود نہیں دیکھا جب وہ کسی معاملے میں بہت پریشان بھی ہوئے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بہت دلنشیں ہوتی تھی۔ جب وہ دوردرشن میں ڈائرکٹر تھے تو تخلیق کاروں اور فنکاروں کا وہاں ہجوم رہتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ وہ باصلاحیت لوگوں کے قدردان تھے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی جو فنکار خصوصاً دوردرشن کے پروگراموں تک نہیں پہنچ پائے یا نہیں پہنچتے تھے اور جعفری صاحب کو اس کا علم ہوتا تھا تو وہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کرلاتے تھے یا اپنے ماتحتوں کو ہدایت کرتے کہ ان اشخاص کی تلاش کریں۔ اس میں وہ اپنے نظام کا قاعدہ مدنظر رکھتے اور ذاتی طور پر شخصیات کا خیر مقدم کرتے۔ ہر سطح پر محبت ان کا شیوہ تھا۔ رنگ منچ کی جتنی توسیع ان کے زمانے میں ہوئی وہ یادگار ہے۔ ٹی وی کے ڈراموں کے جب پروگرام تیار ہوتے تو اس میں اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود دلچسپی لیتے تھے اور مفید مشورے دیتے تھے۔ وہ اسکرین پلے لکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے حبیب تنویر جیسے فنکاروں کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور اکثر کہتے تھے کہ کہانی لکھنا میرے لیے سب سے زیادہ آسان ہے۔ یہ بھی بتایا کہ اگر کوئی کہانی میرے ذہن میں ابھرتی ہے تو میں اپنے کو لکھنے سے نہیں روک پاتا ہوں۔ یہ بھی ہوا کہ سڑک پر خیالات کی موجیں اٹھنے لگیں تو کہیں سے کاغذ لیا قلم دستیاب تھا اور کہانی لکھ ڈالی۔ خیال کو نہیں جانے دیا۔ بعد میں اسے سجانے سنوارنے کا کام کرتے۔ تجربات کی بہتات تھی جو بیشتر ان کی تحریروں میں جگہ پاتی تھی۔ تحریر ان کے مزاج کی طرح ہی شگفتہ ہوتی تھی اور وہی مزاج شاعری میں بھی تھا۔ اس لیے ان کے اندر کے شاعر کی بالادستی ان کی ہر تخلیق میں نظر آتی تھی۔

مرحوم جاوید حمیدی نے بڑی مشکل سے کسی طرح دوردرشن کے پروگرام میں میرا داخلہ ممکن بنایا تھا۔ اس وقت تک ان کے اختیارات محدود تھے اور اگرچہ میں دوردرشن پر اپنا پہلا پروگرام لائیو بہت کامیابی سے کرچکا تھا۔ مرحوم جاوید حمیدی کے اختیار میں جو پروگرام تھا اس میں انھوں نے میرے لیے جگہ بنائی اور اس وقت کے وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر ہری کرشن اوستھی سے انٹرویو کرا دیا اور مجھے کہا کہ پروفیسر ہری کرشن اوستھی جی بڑی شخصیت، مجاہد آزادی اور ڈائرکٹر ولایت جعفری کے استاد ہیں جن کا احترام وہ پاؤں چھو کر کرتے ہیں۔ اگر کہیں کچھ برا ہوا تو سمجھو تمھارے راستے بند۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ میں اس پر غور نہیں کرتا کہ آگے کیا ہوگا بلکہ ابھی کیا ہوتا ہے اس پر میرا دھیان رہتا ہے۔ اسی عزم کے ساتھ میں نے بات چیت شروع کی۔ ایک دم مجھے ریکارڈنگ روم کی طرف سے اشارہ ملا، اسے میں اختتام کا اشارہ سمجھا اور ابھی آپ کا شکریہ ہی کہا تھا کہ ہیجانی کیفیت میں جاوید بھائی نے پانچ منٹ باقی رہنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں شکریہ کے بعد کیا کرتا، جملہ جوڑا، ''میرے سوالوں کے جواب کا شکریہ اب اپنے متعلق آپ بتائیں'' اور پانچ منٹ اسی میں بخوبی صرف ہوگئے۔ اب سب لوگ جعفری صاحب کے کمرے کی طرف چلے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے شاگرد سے میرے انٹرویو کرنے کے طرز کی اتنی تعریف کردی کہ جاوید صاحب وی آئی پی بک لے آئے جس پر اہم لوگوں کی رائے دوردرشن کی کارکردگی پر مثبت انداز میں اثر انداز ہوتی ہے اور وہاں انھوں نے چند جملوں میں جس طرح فراخ دلی سے میری تعریف لکھ دی وہ اس وقت تک موجود رہے گی جب تک دوردرشن کا وجود قائم ہے، اور اس کا یہ اثر ہوا کہ جب میں ولایت جعفری مرحوم کے ساتھ ان کے استاد کو رخصت کرکے واپس لوٹ رہا تھا تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے اپنے کندھے پر بڑے ہی مشفق ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا، یہ جعفری صاحب مرحوم کے ہاتھ تھے اور انھوں نے اجنبیت کی ساری دیواریں گرادیں اور حسد اور نفرت کے وہ در بھی اکھاڑ پھینکے جو میری راہ روکے تھے کیوں کہ در خیبر کے فاتح عظیم کی ہمت بے مثالی ان کے وجود میں خون بن کر گردش کررہی تھی اور مجھے بھی اس نسبت پر فخر ہے کہ میں بھی مولائے کائنات کی اولاد ہوں۔ بہر حال مرحوم جعفری صاحب کے پاس روز آنا جانا ہونے لگا۔ میں اپنی کامیابی کے سبب دوردرشن کے معزز پروڈیوسر جناب مظہر محمود صاحب کے بھی قریب ہوا۔ وہ بااختیار تھے اور ان کی فراخ دلی سے میری کمپیرنگ کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ مظہر صاحب کا ادبی شعور میرے لیے راہ نما بنا اور ان کا خلوص باد موافق بن گیا۔ جعفری صاحب کو بہت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مظہر صاحب کا میرے ساتھ سلوک ہر طرح سے ان کے لیے اطمینان بخش تھا۔

ولایت جعفری صاحب کا ہر طرز عمل لائق تقلید تھا۔ انھوں نے لکھنؤ دوردرشن کے تمام پہلوؤں کا اپنی بصیرت سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور اس کے اسباب سنوارنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لائے اور نڈر ہوکر ان عناصر پر ضرب لگائی جو اس نظام کی ترقی کی راہ

میں رکاوٹ بنے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ سدھار دیا۔ وہ بہترین افسانہ نگار اور شاعر تھے اور ادب سے ان کا لگاؤ بے مثال تھا۔ ان کے دور میں ہندی اردو کی ادبی نشریات کی سطح بھی بلند ہوئی کیونکہ ادب کی نزاکتوں پر جعفری صاحب کی نظر بہت پینی تھی۔ میرے دوست اشعر علیگ کی شاعری کے مداح تھے۔

شاید مظہر صاحب اس وقت رخصت پر تھے یا کسی دوسرے کام میں مصروف تھے ان کے اردو کے ادبی پروگراموں کی نشریات رکنا نہیں تھی اور مجھے حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوئی کی پروگرام میرے بہت پرانے دوست آلوک شکلا کو جعفری صاحب نے سپرد کردیے جو بنیادی طور پر ہندی کے ادیب اور کوی بھی تھے۔ اصل میں انھوں نے کہا کہ ادب کی راہیں مضبوط ادبی شعور سے ہوتی ہیں اور جس میں یہ شعور ہوتا ہے وہی سرخرو ہوتا ہے۔ مجھ کو مظہر صاحب نے اپنے پروگرام 'آئینہ' میں اس طرح شامل کر دیا تھا آلوک شکلا نے بھی تقریباً وہی کام لیے جو مظہر صاحب لیا کرتے تھے اور جعفری صاحب راہ نمائی کیا کرتے تھے۔

مشکل کام اپنے ذمے لے کر بھی وہ کبھی ذہنی تناؤ میں نہیں رہتے بلکہ آسانیوں میں بہت زیادہ مطمئن نہیں رہتے تھے۔۔ پوری زندگی انھوں نے غلط سے صلح نہیں کی اور سچ کے ہمیشہ پاسبان رہے۔ اس میں مخالفتیں جھیلیں لیکن پروا نہیں کی، خیر کا پرچم بلند کیا اور اس کے علم بردار رہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں نے تو ان کو آئڈیل سمجھا اور ان کی ردائے محبت اور شفقت کے لطیف سائے میرا وجود ہمیشہ محسوس کرتا تھا اور اب بھی کر رہا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

ولایت جعفری کا سب سے نمایاں کام روشنی اور آواز کی تکنیک پر تھا۔ وژن 1919 ان کا پہلا روشنی اور آواز کا پروگرام تھا اور اس نے ان کو روشنی میں لانے کا کام کیا۔ اس کے بعد تو متعدد پروگرام اس نوعیت کے انھوں نے کیے۔ لکھنؤ والوں نے تو ان پر تب پھول برسائے جب یہاں کی تاریخی عمارت بیلی گارد (ریزیڈینسی) میں 'بڑھتے قدم' عنوان سے شو چلا۔ یہ شو جنگ آزادی کے حقائق اور اس سے منسلک واقعات پر مبنی تھا۔ ولایت جعفری اپنے اس نایاب تجربے کی بنا پر ایک معتبر ہدایت کار تسلیم کر لیے گئے اور ان کے حوالے سے ہی روشنی اور آواز سے اہل لکھنؤ متعارف بھی ہوئے۔ اس شو کا سلسلہ چلتا رہا۔ لوگوں کے قدم کئی کئی بار اس کی طرف بڑھے، جس نے ایک بار دیکھا اس کا شوق اسے پھر وہاں لے گیا۔ جعفری صاحب اپنی اس کامیابی پر فخر ضرور کرتے تھے۔ غرور تو کبھی ان کے پاس سے گزرا ہی نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کئی پروگرام روشنی اور آواز کے حوالے سے کیے اور ان کی تخلیقیت نے ان کو ہر قدم پر کامیابیوں سے ہمکنار کیا وہ جہاں رہے نیک نام رہے۔ وژن 1919 بڑھتے قدم، بہادر شاہ ظفر، غالب، انارکلی، ممتاز محل۔ ان کے روشنی اور آواز کے اہم پروگراموں کے عنوان ہیں جو لکھنؤ، دہلی اور چنڈی گڑھ میں ہوئے اور ہر جگہ ان کی کامیابی بحیثیت ہدایت کار ان کا نام اس کی تاریخ میں بصد احترام درج ہوگیا۔

لکھنؤ دوردرشن میں بہت کچھ ان کے دور میں نیا ہوا۔ اسپانسرڈ سیریل کا بھی یہاں آغاز ان کے دور میں ہوا۔ ان کو لکھنؤ سے خاص انس تھا۔ وہ اس سرزمین کو گلزار محبت تصور کرتے تھے جہاں تہذیب اور تمدن کے پھول کھلتے تھے جن کے رنگوں سے ان کے احساس جمالیات کو فرحت حاصل ہوتی تھی جس کی بوئے دلنواز سے ان کی روح کو تازگی ملتی تھی۔ وہ جتنے دن تندرست رہے یہاں کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا حصہ رہے۔ چھوٹی نشستوں میں اپنی موجودگی درج کرانے میں کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور جہاں پُر فکر مباحثے اور مذاکرے ہوتے تھے ان کی بات اور ان کا بیان قابل قدر ہوتا اور وہ اتنا اہم بیان ہوتا کہ اکثر وہ جلسوں کی خبروں کی سرخی بن کر جگمگاتا تھا۔ لکھنؤ حلب آئینہ سازاں ہے اور وہ یہیں سے صاف وشفاف آئینہ بن کر نظروں کے سامنے آئے وہ دلوں میں سما گئے اور تھیٹر کی تاریخ میں شان سے درج ہوئے۔ ان کو یاد کر کے میں اپنا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

کچھ پھول کھلا کر چلا گیا، کچھ خواب دکھا کر چلا گیا
اک آگ سی دل کی دنیا میں دلدار لگا کر چلا گیا

وہ حب الوطنی کو جزو ایمان سمجھتے تھے اور خیر سگالی کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ دوستی اور تعلق نبھانے میں ان کا جواب نہیں تھا۔

علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجروح وغیرہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ جب دوردرشن کے ڈائرکٹر تھے تو ان شعرا کی لکھنؤ آمد پر کسی بھی طرح ان کی گفتگو اور شاعری کی صدائیں محفوظ کرنے کی سعی کرتے تھے۔ نیشنل نیٹ ورک کے لیے سب سے پہلا بڑا مشاعرہ لکھنؤ دوردرشن میں ان کے دور میں ریکارڈ ہوا جس کا اہتمام اس وقت کے پروڈیوسر ڈاکٹر مظہر محمود نے کیا اور عہد ساز شاعروں کی کہکشاں ولایت جعفری صاحب کی رہنمائی میں سجی۔ وہ بزم عالی یادگار تھی، کیفی اعظمی صدارت کر رہے تھے اور استاد محترم پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نظامت فرما رہے تھے۔ مشاعرے میں پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی، عرفان صدیقی موجود تھے اور اس مشاعرے میں میرا ہونا میرے لیے باعث فخر تھا۔ جب مشاعرہ نشر ہوا اور میں ملا تو مزاجاً ہنس کر جعفری صاحب نے کہا کہ یار تم نے تو پڑھنے میں اعتماد کی ایسی تیسی کردی۔ میری، اس پروگرام کے لیے منتخب کی ہوئی، غزلوں کی تعریف کی۔ میرا ایک شعر ان کو بہت پسند تھا اکثر پڑھتے تھے اور ان کی اہلیہ نے اسے ساز پر گایا بھی تھا اور وہ شعر جعفری صاحب نے خاص کر اس سیمینار کی اپنی تقریر میں پڑھا تھا جو میری انجمن کی طرف سے بعنوان 'بقائے انسانی میں صوفیوں کا حصہ' پر منعقد ہوا تھا۔ وہاں موجود مشائخ کو مخاطب کر کے وہی شعر پڑھا ؎

تقدیر بدل دے گا مری اس نے کہا ہے
اس شخص کو وشواس کا وردان ملا ہے

بہت محبت سے کہتے تھے بیٹا یہ امر شعر تم نے کہہ دیا۔ وہ عارضۂ قلب میں بھی مبتلا رہے، بلڈ شوگر بھی رہی، لیکن عمل کی راہ میں گرد وغبار پیدا کرتے رہے جو زبان کی بزم میں ان کی گلباریاں بھی بھلی لگتی تھیں ؎

بہت باتوں میں جی لگتا تھا اس کی
وہ خود اپنی جگہ اک انجمن تھا

ولایت جعفری صاحب ایک ایسے شریف النفس انسان تھے جن کے لطف وکرم کو دیکھ کر انگریزی میں کسی ایسے انسان کے لیے ایک مفکر نے کہا ہے کہ "ایک شریف النفس انسان کی صفت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کوئی احسان کرتا ہے تو اس کو ہلکا کر دیتا ہے تا کہ احسان اٹھانے والے پر بھاری نہ ہو اور وہ یوں کچھ دیتا ہے کہ جیسے وہ کچھ حاصل کر رہا ہے"۔ اس لیے احسان جتانا تو دور وہ تو اس کا ذکر بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی یاد دلاتا تو بات ہی ٹال جاتے۔ ان کی حیات میں میں نے ان پر ایک مضمون لکھا جو شائع ہوا۔ جس میں ان کی شفقتوں کا ذکر تھا، کہنے لگے تمھیں اتنی پرانی باتیں یاد کیسے رہیں۔ میں نے کہا ان کی یاد میرا فرض ہے اور وہ میرے دل میں دائمی ہے۔ وہ ادا سے بس مسکراتے رہے۔

کثرت استعمال سے یہ جملہ بے اثر ہو گیا ہے کہ کسی کے جانے سے جو جگہ خالی ہوئی وہ آسانی سے نہیں بھرے گی، لیکن ولایت جعفری صاحب مرحوم کے انتقال پر یہ جملہ اپنی معنویت کے ساتھ میری اور بہتوں کی زبان پر ہے کیونکہ ایسی ہمہ جہت شخصیت کے لیے اسے بولنا مناسب ہے۔

■

Mr. Suhail Kakorvi
C/o, National Tractors
City Hotel, B. N. Road, Lalbagh
Lucknow- 226001 (UP)
Mob.:7897185376

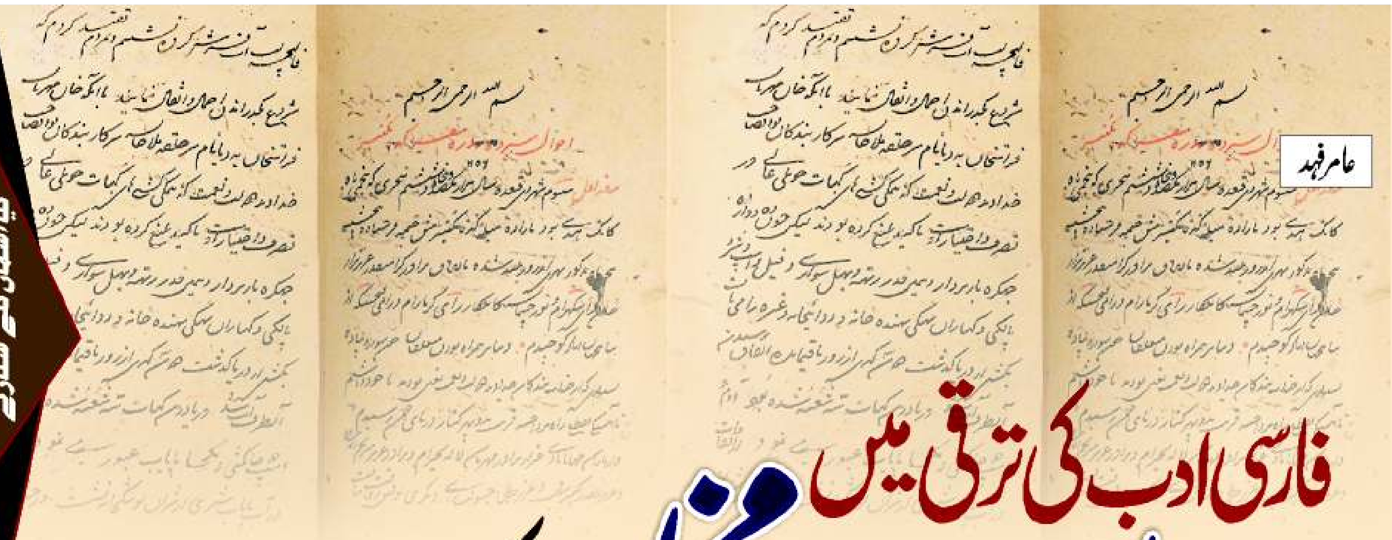

فارسی ادب کی ترقی میں آنند رام مخلص کی خدمات

عامر فہد

فارسی ادب کی ترقی میں ایک اہم نام آنند رام مخلص کا ہے۔ مخلص ایک مشہور مورخ، لغت نگار اور فارسی زبان کے بڑے شاعر تھے۔ ان کی پیدائش 1699 میں سودھرا، سیالکوٹ پنجاب کے ایک کھتری خاندان میں ہوئی۔ مخلص ان کا تخلص ہے اور مغل حکومت سے ان کو رائے رایان کا خطاب بھی ملا۔

(Hadi,Nabi, Dictionary of Indo Persian Literature, Indra Gandhi National Centre for the Arts, New Delhi 1975, P:433)

مخلص کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی جہاں انھوں نے فارسی زبان سیکھی تھی۔ ان کے اساتذہ میں مرزا بیدل اور سراج الدین علی خان آرزو کا نام آتا ہے۔ مخلص کی تالیفات، ان کے خصائل اور کردار پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک تو ان کے اجداد کا مسلمان امرا کی ملازمت اور دوسرا اس وقت کے بڑے عالم حضرت بیدلؒ کی صحبت اور ان کی درویشی کا رنگ ان پر اس طرح چھایا کہ اس کی جھلک ہمیں ان کی تحریروں میں نظر آجاتی ہے۔ دوسروں کی تکلیف اور مصیبت کو دیکھتے تو بے چین ہو جاتے۔ ان کی شخصیت بہت دل پذیر تھی اور حلقہ احباب بہت وسیع۔ اپنے احباب کا تذکرہ اپنی کتاب میں بہت احترام سے کرتے۔ ان کے احباب میں ان کے استاد خان آرزو، شرف الدین پیام، مرزا محمد قلی خان اور جان دیوانہ کا نام آتا ہے۔ مخلص صوفیا کا بہت احترام کرتے تھے۔ خاص طور سے ان کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت شاہ مدار سے بہت عقیدت تھی۔ وہ اکثر ان کے مزار اور عرس میں اپنے احباب کے ساتھ جایا کرتے تھے۔

(علی، ڈاکٹر سید اظہر، سفر نامہ مخلص، تصحیح و تحشیہ، ہندوستان پریس رامپور 1946، ص 13)

مخلص کی زندگی کا دوسرا پہلو ان کی تصنیفی خدمات ہیں۔ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف، الفاظ و محاورات کی تحقیق اور شعر و شاعری کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ادبی ذوق کا یہ حال تھا کہ اگر کسی نادر کتاب کا علم ہو جاتا تو اس کی نقل کرا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ مخلص کے کتب خانے کو دیکھ کر ہی ان کے ادبی ذوق کا پتہ چل جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید اظہر علی لکھتے ہیں:

"اپنی مصروفیتوں کے باوجود مخلص فکر شعر تصنیف و تالیف مجمع احباب میں بیٹھ کر شعر و شاعری اور اشعار کی تنقید، الفاظ اور محاورات کی تحقیق کے لیے ایسے وقت نکال ہی لیتا تھا، تو بے ساختہ اس کے ادبی ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ کسی نادر کتاب کا علم ہو جاتا تھا، تو اس کی نقل بھی کرا لیتا تھا۔ چنانچہ دیوان صائب کے نسخے کی نقل، کاغذ کتاب اور جلد پر اس نے ایک سو سترہ روپے خرچ کیے۔ اسی ادبی ذوق کا نتیجہ تھا کہ اس کے کتب خانے میں متعدد اہل قلم کی تصانیف کے ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے تھے۔" (ایضاً، ص 23)

مخلص کی تحقیق اور تفتیش کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔ ان سب کے علاوہ مخلص کے سامنے جب بھی فارسی کے نئے الفاظ و محاورات وارد ہوتے وہ ان کو جمع کر لیتے اور پھر ان کے معنی اور تشریح دریافت کرتے۔ اس سلسلے میں وہ ایرانیوں سے بھی مدد لیتے۔ ساتھ ہی وہ کتابوں کی ورق گردانی میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ان کی تصنیفی خدمات کی وجہ سے ہمیں اٹھارہویں صدی کی قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں:

بدائع وقائع: فارسی زبان میں یہ کتاب ہندوستانی تاریخ پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں 1141ھ سے 1161ھ کے حالات و واقعات کو تحریر کیا گیا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے یہ کتاب اس لیے بہت اہم ہے کہ مخلص نے اس کتاب میں جن واقعات اور حالات کا تذکرہ کیا اسے انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے جس کو خان بہادر محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج نے لاہور کے ایک کھتری خاندان سے خریدا تھا۔ ایک دوسرا نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے۔ علاوہ ازیں مخلص کا ایک دستخطی نسخہ کتب خانہ ہمایونی رامپور میں بھی موجود ہے۔

(علی، ڈاکٹر سید اظہر، سفر نامہ مخلص، تصحیح و تحشیہ، ہندوستان پریس رامپور، 1946 ص 40)

بدائع وقائع کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں نادر شاہ کا ہندوستان پر حملے اور اس کے دہلی میں قیام کا ذکر کیا گیا ہے۔ مخلص نے ترتیب وار ان شہروں کا ذکر کیا ہے جس کو نادر شاہ فتح کرتا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے لاہور پر حملے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وزیر آباد، ایمن آباد، گجرات اور دوسرے شہروں کا ذکر

کیا ہے۔ اس کے علاوہ دلی میں نادرشاہ کے داخل ہونے اور محمد شاہ کی شکست کا حال بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دلی میں قتل وغارت گری اور مال غنیمت کولوٹنے کا آنکھوں دیکھا حال بھی مخلص نے اس پہلے حصے میں بیان کیا ہے۔

اس کے دوسرے حصے میں محمد شاہ کا بنگڑھ کی طرف کوچ کرنے اور علی محمد خان روہیلہ کے خلاف مہم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مخلص اس مہم میں محمد شاہ کے ہمراہ تھا۔ اس سفر کے دوران وہ مختلف حالات و واقعات اور مقامات کو دیکھ کر ان کو قلمبند کر لیتا تھا۔ اس حصے کو سفرنامہ مخلص کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس سفرنامے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو تصویریں تھیں۔ ایک محمد شاہ بادشاہ کی سواری کی اور دوسری خیمہ کی جو مینا توری مصوری کا اعلی نمونہ ہے۔ محمد شاہ نے علی محمد خان روہیلہ کے خلاف بنگڑھ کا جو محاصرہ کیا تھا وہ اس سفرنامے کی جان ہے۔ اس سفر نامے کو تزک بابری اور تزک جہانگیری کے برابر درجہ دیا جاتا ہے ڈاکٹر سید اظہر علی لکھتے ہیں کہ:

”جب ہم سفرنامہ مخلص یا احوال سفر بنگڑھ کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ سوانح سفر تحریر کرنے میں مخلص نے بابر اور جہانگیر کی تقلید کی ہے۔ اس قسم کی مسلسل اور تاریخ وار تحریریں جو حقیقت میں روزنامچہ ہیں، فارسی اور اردو میں کم ملتے ہیں نیز ان میں جس تفصیل سے مخلص نے پھلوں اور پھولوں درختوں اور جانوروں کا حال ضبط کیا ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کی اس اعتبار سے بھی وہ بابر اور جہانگیر کے برابر نہیں، پر قریب ضرور آجاتا ہے۔“ (ایضا،ص 59)

بدائع وقائع کے تیسرے حصے میں احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر حملے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تیسرے حصے میں جہاں ایک طرف احمد شاہ ابدالی کے متعلق قیمتی دستاویز مہیا کیے ہیں وہیں دوسری طرف اس حصے میں انھوں نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں کا اور وہاں کے جغرافیائی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان مذکورہ تاریخی واقعات کے علاوہ مؤلف نے سوانح دربار اور اخبارات دربار معلی کے عنوان سے بھی اعطائے منصب اور اسباب حرب وآلات جنگ اور دوسرے احوال وکوائف بیان کیے ہیں۔ بیانات کے ضمن میں مؤلف نے بعض مراسلات اور سرکاری مکتوبات کو بھی نقل کیا ہے جو تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے دستاویزی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے جہاں ایک طرف جغرافیائی معلومات حاصل ہوتی ہے وہیں دوسری طرف معاشی، معاشرتی اور جنگی نوعیت کی اطلاعات بھی فراہم ہوتی ہیں۔ ان سے کسی بھی ملک اور اہل ملک کی تاریخ کو مرتب کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

(احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب، جلد سوم، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، 1977، ص 188)

مرآۃ الاصطلاح: فارسی زبان میں مخلص کی یہ دوسری مشہور کتاب ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب الفاظ ومحاورات، سیاسی فقروں اور اصطلاحات پر مشتمل ایک لغت ہے جو اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، معاشی، اقتصادی اور صنعتی معلومات سے بھری پڑی ہے۔ مرآۃ الاصطلاح وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ مخلص کی نظر سے جو بھی فارسی کی نئی اصطلاحات گزرتی ان کے معنی، تشریح اور امثال کے ساتھ ان کو تحریر کر لیتے تھے۔

اس طرح ان کے پاس اصطلاحات کا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ علما پرانے لغات کی تدوین اور ترتیب میں مصروف رہتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کی طرف ان کی توجہ نہیں لہٰذا ایک رسالہ جدید مصطلحات پر مشتمل کیوں نہ تحریر کیا جائے۔ چنانچہ مخلص نے تقریباً تین سال سخت محنت کی اور اس کتاب کو مرتب کر لیا۔ انھوں نے اس کتاب کے ہر باب کو حروف تہجی کی ترتیب پر لکھا ہے اور ہر باب کے آخر میں فارسی کے ضرب الامثال بھی تحریر کیے ہیں۔

مخلص نے اس کتاب میں اپنے معاصر شعرا وشخصیات کا ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب نہ ہوتی تو مخلص کے بعض معاصر شعرا کے متعلق ایک حرف بھی لکھنا دشوار تھا۔ انھوں نے جن شعرا وشخصیات کا ذکر کیا ہے ان میں مشہور سراج الدین علی خان آرزو، مرزا زکی، محمد یوسف نکہت، قزلباش خان اسد، زاہد علی خان، خان ہدایت اللہ خوشنویس، راجہ ہری سنگھ، ہاشم خان محزون، محمد علی حزین، میر شرف الدین پیام، عرفی، ظفر خان اور ارادت خان ہیں۔

اس کتاب میں مخلص نے مختلف شہروں، بازاروں اور وہاں کی صنعت کاری کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ہمیں اس دور کے شہروں اور وہاں کی صنعت وحرفت کے متعلق معلومات ملتی ہے۔ مثال کے طور پر شیشے کے آلات پٹنہ میں نہایت عمدہ بنتے تھے۔ پارچہ بافی احمد آباد میں بہت عمدہ ہوتی تھی۔ عطر گلاب پشاور میں بکثرت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہجہان آباد کے جمعہ بازار کی کیفیت، ہندوستان میں نمک کی کانیں، پھولوں کے مختلف اقسام جو اس وقت ہندوستان میں موجود تھے، کا ذکر بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ تخت طاؤس کا حال بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری اور دہ سالہ قزوینی کے علاوہ مرآۃ لاصطلاح اس تخت کے بارے میں تیسرا ماخذ ہے۔

اس کتاب کے ذریعے مغلیہ سلطنت اور اس کے دربار سے متعلق معلومات بھی ملتی ہیں۔ مخلص نے اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے امرا کے احوال بھی درج کیے ہیں۔ اس کے علاوہ منصب کی تفصیل، القاب و خطابات کی تفصیل، عدالت و دستور کی تفصیل، سلطنت کے وکیلوں کی تفصیل، شاہی لباس و شاہی دربار کے احوال، مجلس شوریٰ کی تفصیل، مردوں وعورتوں کے کپڑوں کی تفصیل اور مختلف مذاہب کے رسم ورواج کی بھی تفصیل اس کتاب میں مخلص نے درج کی ہے۔

مرآۃ الاصطلاح کے مآخذ جن سے مخلص نے استفادہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

آئین اکبری، اکبرنامہ، مآثر رحیمی، امثال مرزا محمد قزوینی، تذکرہ نصرآبادی، فرہنگ جہانگیری، عالم آرائے عباسی، بادشاہ نامہ طالب کلیم، خطوط وفرامین اور لاتعداد شعرا کے دواوین اور منظومات۔

مرآۃ الاصطلاح کے قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، کتب خانہ خدابخش بانکی پور اور پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

(اعوان، ذکریا بانو، مرآۃ الاصطلاح با مقدمہ، ترتیب وتصحیح وتحشیہ، پایان نامہ دکتری، دانشگاہ پنجاب لاہور، 1979، ص 33)

تاریخی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم ہے اس کی خصوصیت کے حوالے سے سید عبداللہ لکھتے ہیں: ”یہ کتاب اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتی ہے جو ہماری سیاسی تاریخوں میں موجود ہے۔ معاشرتی حالات کا ملنا اس قدر دشوار ہے کہ ان کے متعلق معمولی واقعات کا معلوم کر لینا بھی غنیمت ہے۔ انتظامات سلطنت، ہندوستانیوں کے رسوم اور دیگر مشاغل کا حال ہمیں دوسری تاریخوں سے بہت کم ملتا ہے اور اسی کمی کو مرآۃ الاصطلاح کسی حد تک پورا کرتی ہے۔“

(عبداللہ، سید، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، 1967، ص 134)

گلدستہ اسرار: مخلص کی ایک اور قیمتی تالیف گلدستہ اسرار ہے۔ دراصل یہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس میں مخلص نے ان خطوط کو اکٹھا کیا جو نادرشاہ کی طرف سے کابل کے صوبیدار کو بھیجا جاتا تھا۔ نادرشاہ ہندوستان میں موجودگی کے وقت کابل میں ہدایات اور احکامات کے لیے وہاں کے صوبیدار کو خطوط بھیجتا رہتا تھا۔ ان خطوط میں جن کا تعلق ہندوستانی معاملات سے ہوتا صوبیدار اس کو مخلص کے پاس بھیج دیتا تھا۔ مخلص ان خطوط کو وزیر اعظم کے

پاس پیش کرتا پھر وزیر اعظم بادشاہ کے حضور پیش کر کے شاہی احکام اور ہدایات لے کر تعمیل کے لیے دوبارہ مخلص کے سپرد کر دیتا تھا۔ مخلص ان خطوط کی نقل کرتے۔ اصل نسخہ حفاظت کے لیے متعلقہ محکموں میں بھیج دیا جاتا اور نقل کردہ نسخوں کو وہ اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ مخلص ان نقل کردہ نسخوں میں مختصر دیباچہ تحریر کرتے اور اس کو جمع کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس ایک اچھا خاصا مجموعہ اکٹھا ہو گیا، اسی مجموعے کا نام انھوں نے گلدستہ اسرار رکھا۔ ان کے اصل نسخوں کے ساتھ ساتھ مخلص کے نقل کیے ہوئے نسخے بھی اب غائب ہو گئے ورنہ ہمیں ان کے ذریعے نایاب معلومات فراہم ہو سکتی تھیں۔''

(علی، ڈاکٹر سید اظہر، سفر نامہ مخلص، تصحیح و تحشیہ، ہندوستان پریس رامپور، 1946، ص 40)

رقعات مخلص: رقعات مخلص کو 1852 میں دلی میں انشائے آنند رام مخلص کے نام سے طبع کیا گیا۔ دراصل یہ کتاب مخلص کے خطوط کا مجموعہ ہے جن کی تعداد 35 ہے۔ ان خطوط کے سلسلے میں ڈاکٹر سید اظہر علی لکھتے ہیں کہ:

''افادی اعتبار سے رقعات زیادہ تر ذاتی اور شخصی حیثیت کے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ رقعے، آٹھ، خان آرزو کے نام ہیں۔ اس کے بعد تعداد کے حساب سے وزیر اعظم قمر الدین اعتماد الدولہ کا نمبر ہے جن کے نام تین خط ہیں۔ پھر شرف الدین علی پیام اور سید لطف اللہ اور راجہ بخت مل کے نام دو دو خط ہیں۔ بعض نامعلوم الاسم امرائے دولت کے نام بھی تین خط ہیں۔ ایک خط کسی فرضی حسین کے نام ہے۔ فقیر اللہ آفریں لاہوری، محمد یار، قزلباش خان امید، خان احمد حسین خان، خدا یار خان، صفدر محمد خان دیوان لاہور، عبدالعزیز خان، راجہ خوشحال چند، شیر افگن خان، مرزا محمد جواد، اور ایک غیر معلوم شخص کے نام ایک خط ہے۔'' (ایضا، ص 50)

ان رقعات کو جب مخلص نے ترتیب دیا اس وقت اس نے اس پر ایک دیباچہ بھی تحریر کیا۔ ان رقعات کے ذریعے ہمیں اس دور کی شخصیات اور ان کے احوال کا پتہ چلتا ہے خاص طور سے اس نے جو خطوط خان آرزو کو لکھے تھے وہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں ان خطوط کے ذریعے مراٹھوں کے دلّی پر بار بار حملے کے متعلق معلومات ملتی ہے۔

چمنستان: مخلص کی یہ تالیف حکایات اور اقوال کا مجموعہ ہے۔ اس کا بیشتر حصہ مرآۃ الاصطلاح اور بدائع وقائع سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بعض اقوال خود مخلص کے ہیں اور بعض دوسرے بزرگوں کے ہیں۔ اقوال کے علاوہ کچھ تاریخی حکایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا تاریخی نام نسخہ دلنشیں ہے۔ یہ 1746 میں ترتیب دی گئی۔ چمنستان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چار باب ہیں جن کو چمن کہا گیا اور ہر چمن میں دو فصل ہے جن کو گلدستہ کہا گیا اور ہر گلدستے میں واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ آخری گلدستے میں مخلص نے اپنے جد امجد اور والد کے نصائح بزرگانہ کو درج کیا ہے۔ چمنستان میں ارباب حرفت کی اصطلاحوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا ماخذ مرآۃ الاصطلاح ہے۔ ان کے علاوہ اس میں نادر درختوں اور پھولوں کے نام اور بعض جگہ ان کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم ہے۔ پہلی اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس میں سلاطین شاہ عباس صفوی، اورنگزیب، امرا میں سعد اللہ خاں، جمدۃ الملک اور امیر الامرا کی زندگی کے واقعات کا ذکر ہے۔ اس کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ مؤلف نے بعض مشاہدات و چشم دید واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تیسری اہمیت یہ ہے کہ مؤلف بعض واقعات کا ذکر کرتا ہے جس سے اس زمانے کے شاہجہان آباد کی معاشرتی جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً چاندنی چوک میں قہوہ خانے تھے جہاں شعرا اور بذلہ سنج اکٹھا ہوتے اور شعری محفلیں جماتے۔ حویلیوں میں باغ تھے جن میں نہر گزرتی تھی۔ اولیا کے مزارات پر میلے لگتے تھے۔ چوتھی اہمیت یہ ہے کہ مخلص نے اپنی زندگی کے بعض نجی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے باپ، دادا، چچا اور اپنے بیٹوں کے نام شمار کیے ہیں۔

(احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب، جلد سوم، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، 1977، ص 166)

کارنامہ عشق: یہ شاہزادہ گوہر اور مملوکہ کی شہزادی کی محبت کی داستان ہے۔ اس کتاب کے شروع میں مخلص لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ 1144ھ میں وہ محمد حنیف خان، سراج الدین علی خان آرزو، شرف الدین علی خان بیام، اور لالہ فتح سنگھ کے ہمراہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر عقیدت پیش کرنے کے لیے گئے۔ راستے میں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے قریب ایک رات ایک دوست نے ان کو یہ کہانی سنائی تھی۔ اس کے بعد مخلص نے اس کہانی کو بہت شیریں اور خوبصورت انداز میں لکھ کر اس کا موضوع کارنامہ عشق رکھا۔ اگرچہ یہ داستان پوری طرح سے فرضی اور خیالی ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ہمیں اس دور کی ہندو مسلم تہذیب اور لوگوں کے افکار و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔

(عبداللہ، سید، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، 1967، ص 117)

ہنگامہ عشق: حقیقت میں یہ کنور سندر سین کرناٹکی اور رانی چندر پربھا کے محبت کی داستان ہے جس کو ہندی زبان میں ملک محمد جائسی نے لکھا تھا۔ مخلص اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ جب میں 1152 ہجری میں شاہجہان آباد میں اپنی زندگی گزار رہا تھا ان دنوں میں نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں محمد قلی خان، راؤ کرپارام اور فتح سنگھ کے ساتھ شاہ مدار کے میلے میں گیا۔ وہاں ایک رات میں پوری طرح سے سو نہ سکا۔ میں نے اپنے خادم سے کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ وہ دکن کا باشندہ تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے وہ کہانی سنائی تھی۔ اس کہانی کو بعد میں میں نے فارسی زبان میں منتقل کر دیا اور اس کا نام ہنگامہ عشق رکھا۔ اس نسخے کے آخر میں مخلص نے ایک اور نوٹ بھی لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ 1155ھ میں اس کتاب پر نظر ثانی کی تھی اور مناسب ترمیم و اضافہ بھی کیا۔

(عبداللہ، سید، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، 1967، ص 117)

مخلص کا طرز تحریر: مخلص کی تصانیف کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا طرز تحریر بہت نرالا تھا۔ کسی واقعے یا منظر کا صحیح نقشہ کھینچنے میں وہ کمال کر دکھاتے تھے۔ کلام میں متانت اور روانی تھی۔ اپنی کتابوں میں بلا تکلف اہل زبان کے محاورات استعمال کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں اکثر شعر و شاعری مل جاتی ہے۔ نثر کے کچھ فقروں کے بعد شعر ضرور لکھتے تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں جابجا ہندی الفاظ کا استعمال بھی کرتے تھے۔ ان کی تصانیف کو پڑھ کر بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ مخلص اپنے دور کے بڑے ادیبوں میں سے تھے اور تاریخ ادبیات فارسی میں غیر مسلم دانشوروں میں ان کا نام سر فہرست ہوگا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مخلص کی ان تصنیفی خدمات سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی ادب کی ترقی میں اگر غیر مسلم دانشوروں کی بات کی جائے تو آنند رام مخلص کا شمار اپنے دور کے بڑے مورخین، لغت نگار اور شعرا میں ہوگا۔ اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود اس نے بیش قیمتی کتابیں لکھیں جو موجودہ دور میں معلومات کا گنجینہ ہیں۔ مخلص کی ان تصانیف نے فارسی ادب کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔

■

Amir Fahad
Research Scholar, Dept of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 8376027216
Email.: fahadamiramu@gmail.com

رفعت سروش کی منظوم ڈراما نگاری اور تخلیقی جہات

ونود کمار

اردو میں منظوم ڈراما نگاری کی باقاعدہ ابتدا آغا حسن امانت لکھنوی سے ہوئی۔ انھوں نے 'اندر سبھا' کے نام سے منظوم ڈراما لکھا ہے جو 1853 میں اسٹیج کیا گیا جسے اردو کا پہلا ڈراما ہونے کا شرف حاصل ہے۔ منظوم ڈراما نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے نصف میں ہوتا ہے اس کی تقلید میں اور بھی اندر سبھائیں لکھی گئیں جیسے اندر سبھا (مداری لال) راحت سبھا (منشی چتر بھوج سہای) جشن پرستاں (لال بھیروں سنگھ عظمت) وغیرہ۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں منظوم ڈراما لکھنے والوں میں طالب بنارسی، آغا حشر کاشمیری اور احسن لکھنوی ہیں لیکن اس دور کے منظوم ڈراموں میں نظم کے پہلو بہ پہلو نثر کا بھی استعمال ہونے لگتا ہے، مکالمہ نگاری میں تصنع اور تکلفات برتے جانے لگے مگر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مقفی اور مسجع نثر کے استعمال میں کمی آنے لگی اور تیسری دہائی میں ان مکالموں کا زور ٹوٹ گیا جن میں تکلفات در آئے تھے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سرے سے منظوم ڈرامے کا چلن ہی ختم ہوگیا۔ اسی دور میں پارسی تھیٹر نے اپنی آخری سانسیں لیں جس کے ساتھ ہی اردو ڈراما بھی اسٹیج سے رخصت ہوگیا انیسویں صدی میں جو منظوم ڈرامے لکھے گئے وہ خاطر خواہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے لیکن ان سے لوگوں میں ڈراما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور لوگ اپنی تسکین کی خاطر تھیٹر ہالوں میں جانے لگے۔

ڈراما اندر سبھا کو اوپیرا بھی کہا گیا ہے۔ حالانکہ انیسویں صدی کے کسی ڈرامے میں اوپیرا کے اوصاف موجود نہیں ہیں کیونکہ وہ سب ڈرامے موسیقی کے اس تسلسل سے محروم ہیں جو اوپیرا کا وصف خاص ہے۔ واجد علی شاہ کا رادھا کنہیا کے قصے کو ڈانس ڈراما کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے اردو ڈرامے کی تاریخ میں ڈانس ڈرامے کی کوئی روایت قائم نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ رہی کہ ڈراما محل کی چار دیواری میں کھیلا گیا جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد تک وہ ڈراما نہیں پہنچ سکا۔ اگر دیکھا جائے تو باقاعدہ طور پر منظوم ڈرامے کا دور ریڈیو کے ذریعے شروع ہوا۔ سلام مچھلی شہری، مختار صدیقی، رفعت سروش اور عمیق حنفی وغیرہ نے اس کی طرف توجہ کی، ان میں رفعت سروش کو خصوصی اہمیت حاصل ہے انھوں نے منظوم ڈراموں کے علاوہ اوپیرا اور ڈانس ڈرامے بھی لکھے ہیں اور نثری ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ رفعت سروش کے منظوم ڈراموں میں (زمین آدم، شعلہ آگہی، نئی صبح، شاہجہاں کا خواب، جہاں آرا، ایک ملکہ شعر و سخن حبہ خاتون، ایک شہنشاہ عشق و وفا: جہانگیر، شکست زنداں اور نئی منزلیں اور اس دیوار کے سائے میں وغیرہ ہیں۔

رفعت سروش کے منظوم ڈرامے دو طرح کے ہیں ایک وہ جو ریڈیو کے لیے لکھے گئے جیسے 'روح وقت' اور 'روشنی کا کارواں' وغیرہ دوسرے وہ جو اسٹیج کے لیے لکھے گئے ہیں جیسے گھر کی جنت، شعلہ افسردہ، اسی دیوار کے سایے میں وغیرہ ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کو لکھتے وقت ریڈیو کے مقاصد کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں آواز کے زیر و بم اور میوزک کے صحیح استعمال سے ہی ڈرامے کی فضا تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو ڈرامے ریڈیو کے لیے نہیں لکھے جاتے ان میں اسٹیج کا خیال رکھتے ہوئے ڈراما تحریر کیا جاتا ہے۔ اس میں روشنی کا اتار چڑھاؤ، کرداروں کی نقل و حرکت اور ان کی مناسبت سے مکالمہ نگاری اور انھیں کی زبانی جذبات، دکھ درد اور خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے ایسی صورت میں الفاظ کا انتخاب بہت چابکدستی سے کیا جاتا ہے ورنہ الفاظ کا انتشار ڈرامے کا خون کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں رفعت سروش ایک کامیاب ڈراما نگار ہیں۔ رفعت سروش اپنی ڈراما نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"منظوم ڈرامے سے مجھے فطری مناسبت ہے مسلسل چالیس سال آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اور ڈراما پروڈکشن سے براہ راست متعلق ہونے کے باعث ڈراما نگاری میری تخلیقی سرگرمیوں کا بنیادی مرکز بن گئی ہے۔ میں نے 46ء سے اب تک ان گنت منظوم ڈرامے لکھے اور پروڈیوس کیے کیونکہ یہ ڈرامے پیش کرنے کے لیے ہی لکھے گئے اور پروڈکشن کی تمام ضرورتوں اور ریڈیائی تکنیک کو مدنظر رکھا گیا اس لیے ان میں غیر ضروری الفاظ اور عبارت آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔"

(رفعت سروش: اسی دیوار کے سائے میں، دہلی: نورنگ کتاب گھر، 1987، ص5)

رفعت سروش اپنے منظوم ڈراموں میں سماجی صورت حال، ملکی مسائل، گھریلو معاملات جیسے موضوعات پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ڈراما ایک ایسی صنف ہے جو اپنا اثر قارئین و ناظرین پر بہت جلد مرتب کر لیتی ہے۔ چنانچہ ایسے سنجیدہ موضوعات کو کھیل کھیل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جس سے ناظرین بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ لکھی ہوئی تحریر سے صرف پڑھنے والا ہی لطف اٹھا سکتا ہے۔ ایک عام آدمی جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا وہ اس سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈراما اپنا پیغام قاری و عامی دونوں تک یکساں پہنچاتا ہے اور دونوں قسم کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی لیے ڈرامے کا اپنا الگ مقام ہے۔ رفعت سروش کا ڈراما "اسی دیوار کے سایے میں" عام گھریلو مسائل کے موضوع پر لکھا گیا ہے جو لوگوں کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور ہر طرح کا انسان اس سے دوچار ہوتا ہے۔ ان واقعات کو یاد کر کے افتخار کا دل آنسوؤں سے بھر جاتا ہے اور وہ کف افسوس ملتا ہے کہ آج اس کے گھر کی جو حالت ہے یہ پہلے نہ تھی۔ افتخار موجود کیفیت سے باہر نکلتا ہے اور پھر پرانی یادوں میں گم ہو جاتا ہے اور خاندان کے بکھر جانے پر افسوس کرتا ہے۔ اس منظر کی پیشکش رفعت سروش اپنے تخلیقی ذہن سے شعری پیکر میں یوں کرتے ہیں۔

گیا تھا چھوڑ کر فقط اس ارادے سے
مل جائے گی پھر یہ گم گشتہ جنت

مگر اب یہاں کچھ نہیں ہے
فقط سوندھی مٹی کی خوشبو ہے باقی
یہ خوشبو مجھے کھینچ لائی ہے شاید

یہ بے روح کوٹھی جو گم صم کھڑی ہے
مجھے ایسا لگتا ہے، تابوت ہے یہ

قابل غور یہ بات ہے کہ رفعت سروش نے جس طرح افتخار کے جذبات کو پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفعت سروش انسان کے جذبات اور احساسات کو بیان کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ رفعت سروش کی فنکاری نے اس ڈرامے کو اعلی درجے کی تخلیق بنادیا ہے۔ منظوم ڈراما لکھنا ایک جوکھم بھرا کام ہے اور وہ بھی پابند نظم میں۔ رفعت سروش نے پابند نظم میں ڈراما لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کی دشوار گزار راہوں سے بآسانی گزر گئے، جس سے ان کی زبان و بیان اور فن شاعری پر مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ فنی لوازمات پر دھیان دیتے ہیں بلکہ ایسی صورت میں بھی مقصد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ بعض بعض جگہ شاعری کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ قاری ان کی سحر انگیزی میں کھو کر رہ جاتا ہے، مثلاً زمین آدم اور شعلہ آگہی میں ان کی شاعرانہ قدرت اور سوچنے کی انفرادی قوت اپنی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔

ایک ملکہ شعروسخن : حبہ خاتون

بنیادی طور پر حبہ خاتون اوپیرا کا مرکزی کردار ہے، جس کی زندگی کے تین مختلف پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حبہ خاتون دیہات کے ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، جوان ہوئی اور اس کی شادی دیہات کے ایک نوجوان سے ہوگئی۔ خوبصورتی اور ذہانت کے ساتھ طبیعت شعر کی طرف مائل تھی لیکن حالات کی وجہ سے شعری ملکہ خاطر خواہ پنپ نہیں سکا، کیونکہ سسرال والے اس کی صلاحیت کو سمجھ نہیں سکے اور نہ اس کی قدر کی۔ سسرال والے اس کو پریشان کرتے۔ چنانچہ حبہ خاتون سسرالی حالات اور اپنے فن کو مرتا دیکھ کر اداس رہنے لگی لیکن اس کی اداسی کا یہ دور تب ختم ہوا جب یوسف شاہ چک بادشاہ کشمیر نے اس کی سریلی آواز سنی اور جس کی وجہ سے وہ بادشاہ کے حرم میں داخل ہوگئی۔ یہ دور حبہ خاتون کے فن کی جلا اور خوشحالی کا دور ہے، مگر یہ دور دیرپا نہیں رہا۔ تیسرا دور حزن والم اور غم کا دور ہے۔ رفعت روش نے اس واقعے کو اپنے تخلیقی کار ذہن سے منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔

رفعت سروش کا کمال ہے کہ وہ قاری کو اپنی مٹھی میں رکھنے کا طریقہ خوب جانتے ہیں۔ رفعت سروش جب موسیقیت کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اپنے آپ میں یکتا نظر آتے ہیں۔ دیکھیے خود کلامی کی ایک جھلک، جس میں دردوغم اور موسیقیت کا حسین سنگم ہے:

حبہ خاتون: دن ڈھل گیا تو چھوٹ گیا روشنی کا ساتھ
دل ڈوبنے لگا تو گیا زندگی کا ساتھ
کنگن سے ہیں سجی ہوئی گوری کلائیاں
لیکن فریب حسن ہیں یہ خود نمائیاں
آیا کسی کو راس نہ عشوہ گری کا ساتھ
دن ڈھل گیا تو چھوٹ گیا روشنی کا ساتھ

حبہ خاتون گاتے ہوئے آہستہ آہستہ اسٹیج سے باہر چلی جاتی ہے، مگر اس کے گانے کی آواز مدھم مدھم سی آتی رہتی ہے۔ دوسرے دروازے سے یوسف شاہ چک اپنے مصاحبوں کے ساتھ شاہانہ روی سے داخل ہوتا ہے۔ گانے کی آواز کانوں میں پڑتی ہے تو وہ اس کی طرف کان دھرتا ہے اور کہتا ہے:

یوسف شاہ: کس قدر پیاری صدا ہے سوز بھی ہے ساز بھی
لطف آجائے جو ہو قاتل نگاہ ناز بھی
مصاحب: لے کے آتا ہوں ابھی اس ماہ پیکر کی خبر
میرے آقا کے لیے ہے یہ محبت کا ثمر

مصاحب دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اور تنہا یوسف شاہ رہ جاتا ہے پھر وہ کہتا ہے:

یوسف شاہ: وادی کشمیر ہم ہیں ہم یہاں کے تاجدار
زر، جواہر مال ودولت کا نہیں کوئی شمار
ہم ہیں یوسف شاہ ہم پر اک زمانہ ہے فدا
ہم کو لیکن بھا گئی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا

اوپیرا میں کہیں کہیں نثری انداز بھی پایا جاتا ہے، جو نامناسب محسوس ہوتا ہے مگر وہ اتنا مختصر ہے کہ قاری و ناظر کے دلوں میں خلش پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی پیروں کی بیڑیاں بنتا ہے۔ مثال کے طور پر:

ایک آدمی: یہ آسماں، یہ ستارے یہ کہکشاں کیا ہے،
حبہ خاتون: یہ سب خدا کی خدائی کا اک کرشمہ ہے
دوسرا آدمی: یہ روح کیا شے ہے اور دنیا میں آدمی کا وجود کیا ہے
حبہ خاتون: یہ روح آئینہ خدا ہے
تیسرا آدمی: بتایئے یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
حبہ خاتون: فریب ہستی ہیں اور خاک بننے والے ہیں

رفعت سروش نے ڈرامے میں ایک ایسی عورت کو موضوع بنایا ہے جو شعر گوئی کا ملکہ رکھتی ہے لیکن اس کے گھر والے اس کی اس پوشیدہ صلاحیت کو سمجھ نہ سکے سسرال والوں نے بھی اس کی قدر نہ کی۔ ملکہ کشمیر ہونے کے بعد اس نے مزدور اور کسان طبقے کی خدمت کو اپنا فریضہ سمجھا اور رعایا کو خوش رکھنے کے لیے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔

شاہ جہاں کا خواب

رفعت سروش کا اوپیرا 'شاہ جہاں کا خواب' بھی ایک شاہکار ہے۔ شروع میں اس کا نام 'تاج کی کہانی' تھا، جسے ترمیم و اضافہ کر کے چند سال بعد 'شاہ جہاں کا خواب' کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس میں تاریخی واقعے کو شعری انداز میں ڈرامائی صورت عطا کی گئی ہے۔ 'شاہ جہاں کا خواب' موضوعی اعتبار سے مغلیہ عہد کی تاریخ پیش کرتا ہے لیکن اس کے ضمن میں اس وقت کا ہندوستان اور اس کے حالات اور معاشرتی زندگی سب کچھ واضح صورت میں نمایاں ہیں۔ بنیادی طور پر کہانی جمنا کے کنارے محبت کی نشانی کے طور پر ایک شاندار محل بنوانے کی ہے، لیکن صرف تاج محل کی تعمیر کو الفاظ کا جامہ پہنانا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک مغل بادشاہ کی زندگی کے ایک مخصوص پہلو کو اجاگر کرنا اور اس کی شان و عظمت کو بیان کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاج محل کے وجود میں آنے کے عوامل بھی پیش کرنا ہے چنانچہ اسی مناسبت سے اس کے لیے الفاظ کا چناؤ، اس کی ہیئت اور اس کی ویسی ہی فضا بندی کرنا، جس سے اس کے مکمل خدو خال آشکارا ہو سکیں، ایک مشکل ترین کام ہے۔ رفعت سروش نے اس مشکل کو بڑی مہارت سے حل کیا ہے۔ اس اوپیرا کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے اوپیرا اور ڈانس ڈراما دونوں صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر قاضی عبدالستار رقم طراز ہیں:

'' رفعت سروش نے اس دشواری کو جس طرح آسان بنادیا ہے وہ داد کا مستحق ہے مثلاً شاہ جہاں کا خواب ایک متھ (Myth) ہے۔ جس پر تاریخ کی دھوپ چھاؤں کے پردے پڑے ہوئے ہیں شاعر نے اس نازک اور بحث طلب سوال پر اپنی شعریت سے اس طرح ناخن زنی کی ہے کہ اگر ایک حجاب اٹھا ہے تو ایک حجاب پڑا ہے۔''

(رفعت سروش، شاہ جہاں کا خواب، نئی دہلی: نورنگ کتاب گھر، 1980، ص8)

رفعت سروش کی ابلاغی ذرائع اور اوپیرا کی جزئیات پر بڑی گہری نظر ہے۔ موسیقی کے تانے بانے اور اسٹیج کے لوازمات سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ ساری خوبیاں اس اوپیرا میں مکمل طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں، جو کہ اوپیرا کی یک سوئی کا باعث ہیں۔ رفعت سروش ناظرین کو اپنی پکڑ میں رکھنے کا ہنر خوب جانتے ہیں، جس کے مدنظر شاہجہاں کا خواب میں رفعت سروش نے اوپیرا کے پہلے ایکٹ اور پہلے سین سے لے کر دوسرے سین تک پورے مضمون کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اس میں شاہ جہاں کی ممتاز سے

بے پناہ محبت اور محبت میں بے قراری کی ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ساتھ ہی ایک باوقار اور شان وشوکت والے بادشاہ کی زندگی جواب قید کی حالت میں ہے،لیکن تاج محل کے دیدار سے اس میں رمق باقی ہے۔اس کا اندازہ رفعت سروش کے چار مصرعوں سے لگایا جاسکتا ہے:

مگر جب بادشاہ کا صبر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور تسلی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ جہاں آرا سے مرنے کی تدبیر پوچھنے لگتا ہے اور جہاں آرا سے مخاطب ہوتا ہے۔(مکالمہ نگاری)

شاہجہاں: جہاں آرا! کوئی صورت بتاو جلد مرنے کی
طلسم زندگی کے دشت وایواں سے گزرنے کی

جہاں آرا: جو ہو تاریخ کی عظمت کا عنواں، مر نہیں سکتا
بنائے اک نئی جنت، جو انساں مر نہیں سکتا

فکر غالب

یہ ایک ڈانس ڈراما ہے،جس میں کچھ تمثیلی کردار بھی ہیں، جیسے 'وقت' اور 'تاریخ'۔ ڈانس ڈرامے میں رقص ایک کلیدی حصہ ہے۔ اس میں الفاظ سے زیادہ جسم کی حرکات وسکنات بہ زبان رقص فن پارے کی ادائیگی کرتے ہیں۔ چنانچہ رقاص اگر ماہر ہے تو موضوع کی ادائیگی عمدہ طریقے پر ہوگی ورنہ فن پارہ جاں بلب ہو جائے گا۔ بہر حال فکر غالب میں غالب کی عظمت کی گواہی تاریخ اور وقت سے دلائی گئی ہے، اور ان کے کلام کی روشنی میں غالب کی فکری عظمت کا احاطہ کیا گیا ہے دیکھیے:

تاریخ: ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
یہ بیان غالب کا روح بند کی آواز ہے
(پس منظر سے غالب کی آواز گونجتی ہے)

وقت: ہیں سبھی گلشن کی رونق سب سے ہے رنگ بہار
لالہ وگل ہوں کہ نسریں ہم کو سب پر ناز ہے

غالب کی قدر ومنزلت کے لحاظ سے تاریخ اور وقت نے جو گواہی دی ہے۔ اس سے غالب کی اہمیت اور عظمت کا خاکہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے ڈراما تخلیق کار کی عمدہ کوشش ہے، لیکن ڈرامے میں کہیں کہیں غیر ضروری جزئیات شامل ہیں جو کم وبیش ڈرامائی فضا کو متاثر کرتے ہیں غالب کے اشعار کی جو وضاحت جا بجا کی گئی ہے وہ غیر ضروری ہے، لیکن ڈرامے کی زبان بہترین ہے اور اظہار، ترسیل، پس منظر، لباس، حرکت اور روشنی کے حسین امتزاج سے ناظرین کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ رفعت سروش نے ان سب کو بڑی فن کاری سے جمع کیا ہے، جس کی وجہ سے ڈراما تاثر قائم رکھنے اور غالب کا خاکہ پیش کرنے میں مکمل طور سے کامیاب رہتا ہے۔

جہاں آرا

جہاں آرا شاہ جہاں بادشاہ کی پہلی اولاد تھی۔ بادشاہ اسے اپنے دل و جان سے چاہتا تھا۔ شہزادی جہاں آرا بہت ہی سمجھ دار اور ہوشیار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہ بھی سلطنت میں اپنی بیٹی سے مشورہ لیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شہزادی خوبصورت اور حسین بھی تھی، لیکن شہزادی کے ساتھ ایک دو روح فرسا واقعات رونما ہوئے، جن سے بادشاہ اور محل میں رہنے والا ہر ایک شخص متاثر ہوا۔ 30 برس کی عمر میں شہزادی آگ سے جل گئی اور دوسرے یہ کہ شہزادی کے جلنے کے بعد بادشاہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنا دربار دو تین دن تک نہیں لگایا۔ شہزادی کی بخشش کے لیے دعائیں کی جانے لگیں۔ ہدیہ وتحائف تقسیم کیے جانے لگے۔ چنانچہ ان واقعات اور ان کے اثرات کو اوپیرا میں خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا۔ پورے اوپیرا

میں ویسے تو بہت سارے کردار ہیں، لیکن ان میں سے دو کردار جہاں آرا اور دوسرے دارا مرکزی کردار ہیں۔ اوپیرا کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ بادشاہ کا جہاں آرا کے ساتھ سلوک کیسا تھا اور شہزادی کا بادشاہ کے ساتھ انداز تکلم کیسا تھا۔ اس میں خادمائیں بھی ہیں اور بہن بھائی بھی۔ لہذا ان کے مابین گفتگو اور ادب و لحاظ کیسا ہوتا تھا، اوپیرا میں یہ پوری طرح آشکارا ہے۔ اوپیرا میں نغمگی ہے اور مختلف صورت حال کو واضح کرنے کے لیے بحور واوزان میں تبدیلی بھی کی گئی ہے۔ یہ تبدیلی رفعت سروش کے تخیل کی بلندی، فنی مہارت اور ذہنی ارتقا کی مضبوط دلیل ہے۔ جب بھی کوئی فن پارہ تخلیق کار کے ذہن میں آتا ہے تو وہ اپنا سانچہ ساتھ لے کر آتا ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھتے ہیں کہ اگر ہم مغلیہ دور کے کسی کردار کو اوپیرا کا موضوع بنائیں اور موسیقی زمانہ حال کے مطابق ہو تو یہ نامناسب ہے۔ کیونکہ جب ہم نے مغلیہ دور کے کردار کو اپنا موضوع بنایا ہے تو اسی اعتبار سے ذہن میں مغلیہ دور کا خاکہ، اس دور کا رہن سہن، معاشرت، آپس کی بات چیت اور دلبستگی کے آلات کا نقشہ بھی آ گیا، لہٰذا ان لوازمات کے ساتھ اگر کردار کو بیان کیا جائے گا تو وہ اپنے پورے خدوخال کے ساتھ آشکار ہوگا۔ بشرطیکہ صنف کی تکنیک ملحوظ خاطر ہو۔ یہی ہے فن پارے کا اپنے ساتھ سانچہ لے کر آنا۔ بہر حال اس اوپیرا میں کہیں رباعی کی ہیئت ہے، تو کہیں غزل، مناجات کورس، قوالی اور آزاد نظم کی۔ اس اوپیرا کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں نثر کا استعمال ذرہ برابر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ دیکھیں دارو جہاں آرا کے بیچ کی گفتگو جوان کی بے تکلفی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

جہاں آرا: شکریہ، مگر دارا
عمر کی حقیقت کیا
سانس آنی جانی ہے
آنکھ بند ہو جائے
پھر یہ سب کہانی ہے

دارا: کون سی حقیقت ہے
اور کیا کہانی ہے
آج کیوں یہ سب سوچیں
آپ کا جنم دن ہے

رفعت سروش کے منظوم ڈراموں کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک غنائیہ شاعر ہیں۔ منظوم ڈراموں اور اس کی وہ قسمیں جو انھوں نے لکھی ہیں ان میں نغمگی کی ایک لے، مکالمے چست اور پلاٹ گٹھا ہوتا ہے۔ رفعت سروش نے مختلف موضوعات کو اپنے منظوم ڈراموں کے ذریعے پیش کیا ہے اور ہر ایک کا حق بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، رجائیت، عہد و ماحول کی عکاسی، المیہ نگاری، جوش وجذبات کا ابھار، موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا مناسب استعمال، غیر ضروری اشیا سے گریز، تفصیل طلب گفتگو کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں بیان کرنا وغیرہ رفعت سروش کے منظوم ڈراموں کی خصوصیات ہیں۔ رفعت سروش اپنے منظوم ڈراموں میں ایک نئی تکنیک استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ ابتدائیہ میں ہی موضوع خیال کو پیش کر دیتے ہیں۔ خواب اور تعبیر خواب حبہ خاتون اور شاہ جہاں کا خواب وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں، جو یہ غمازی کرتے ہیں کہ رفعت سروش قادرالکلام شاعر ہیں اور فن پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ رفعت سروش کے منظوم ڈرامے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے۔

■

Vinod Kumar
R/o Chack Nathal, Ward No 2, P/O : Sanji Morh
Tehsil: Marheen,
Distt: Kathua- 184148 (J&K)

محمد تنویر

مقبول عام ناول نگار

عادل رشید

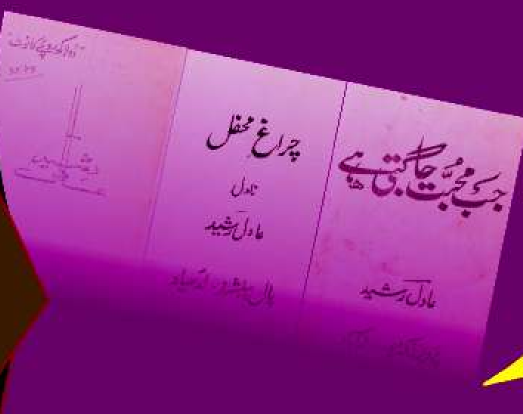

عادل رشید مقبول عام ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ایک زودنویس ادیب تھے۔ ہر مہینے ایک ناول لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ناول لکھے۔ جیسے لرزتے آنسو وغیرہ۔اُن دنوں اِن کے ناولوں کی بڑی مانگ تھی اور وہ دھڑا دھڑ بکتے تھے،علاوہ ازیں وہ شاہد،حجاب وغیرہ رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔

مقبولِ عام ادب کی تاریخ بھی ادبِ عالیہ کے ساتھ ساتھ چلتی چلی آ رہی ہے۔ اس کا تعلق اردو ادب سے بہت گہرا رہا ہے۔ پھر بھی ہمارے ناقدین اور محققین مقبولِ عام ادب کے مقبول ناول نگاروں کو ادبِ عالیہ کا حصہ ماننے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔ مقبولِ عام ادب سے تعلق رکھنے والے بے شمار مصنفین ہیں جنھوں نے اردو ناول نگاری اور اردو ادب کو اپنی تخلیقات کے ذریعے بہت بڑا سرمایہ عطا کیا ہے۔ جن میں کچھ مقبولِ عام ادب کے ناول نگاروں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

عادِل رشید، اکرم الہ آبادی، رضیہ بٹ، شکیل جمالی، گلشن نندہ، اے آر خاتون، ایم اے راحت، سراج انور، کرشن گوپال عابد، سعید امرت، اے حمید، عارف مارہروی، اِظہار اثر، رئیس احمد جعفری، قمر جائسی، قیسی رامپوری، مائل ملیح آبادی، مجاور حسین رضوی، محی الدین نواب، م کے مہتاب، نسیم انہونوی، نسیم حجازی، ابنِ صفی، تیرتھ رام فیروز پوری، دت بھارتی، ستیہ پال آنند، مخمور جالندھری، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی، خان محبوب طرزی وغیرہ وغیرہ۔

عادل رشید مقبولِ عام ادب کا ایک ایسا ہی نام ہے جو اب گمنامی کا شکار ہو چلا ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب اُن کے ناول بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے۔ قارئین ان کے ناولوں کا بے صبری کے ساتھ اِنتظار کرتے تھے۔ عادل رشید اگر آج کے دور کے ہوتے تو اُن کی حیات وخِدمات پر یقیناً دو چار رسالوں کے نمبر نکل چکے ہوتے، اور اگر نمبر نہیں بھی ہوتے تو گوشے تو ضرور آ چکے ہوتے، یا کچھ کتابیں تو ضرور ان کے نام سے آ چکی ہوتیں۔ مگر وہ زمانہ اور تھا اس وقت اردو معاشرے میں کچھ بڑے نام ایسے تھے جو اپنا مقام بنا چکے تھے اور اردو ادب میں ان کی ایک نمایاں پہچان بن چکی تھی۔ ان ناموں کی وجہ سے عادِل رشید کا فن دب کر رہ گیا ہمارے ناقدین اور محققین نے ان کی طرف اپنی نظر ہی نہیں ڈالنی چاہی۔ عادِل رشید اُن مقبول ادیبوں جیسے ہی تھے جنھوں نے قلیل معاوضے پر اپنی صلاحیتیں قربان کر دیں:

''ان کا اصلی نام 'سید منظور الحق' تھا۔ عادِل رشید 20 نومبر 1920 کو نارہ میں پیدا ہوئے۔ یہاں ان کی ننھیال تھی۔''

(عالمی اردو ادب، مقبولِ عام نمبر، مالک رام، اگست 2015، ص 16)

نارہ (ضلع الہ آباد) اتر پردیش میں واقع ہے۔

عادل رشید ایک جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد سید محمد فضل الحق ضلع الہ آباد، تحصیل سراتھو، قصبہ رشید مئی کے جاگیر دار تھے۔ عادِل رشید کے دادا، پردادا اپنے علاقے کے قابل حکیم تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا پوتا بڑا ہو کر حکیم بنے، ابھی عادل سال بھر کے بھی نہ ہو پائے تھے کہ دادا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی والدہ امۃ الفاطمہ کی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر ادیب یا بیرسٹر بنے، مگر افسوس کہ وہ بھی 8 سال کی عمر میں عادِل رشید کو چھوڑ کر اس دنیا سے رُخصت ہو گئیں۔ مگر خُدا نے ان کی تمنا پوری کر دی، ان کا بیٹا بڑا ہو کر ادیب بن گیا۔ عادل رشید نے تو اس دنیا کو الوداع کہہ دیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گئے اپنی 150 سے زائد تصانیف، جس کی بدولت عادل رشید آج بھی اردو ادب میں زندہ جاوید ہو سکتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا اپنا ایک الگ مقام بن سکتا ہے۔ اپنے کام کی زیادتی اور ہر وقت لکھتے رہنے کے سبب وہ بیمار بھی ہو جاتے تھے۔

''اسی طرح کی شکایت محسوس کی تو علاج کے لیے ناناوتی اسپتال (ممبئی) میں چلے گئے۔ وہیں پیر کے دِن 3 جنوری 1972 صبح کے ساڑھے تین بجے دِل کی حرکت بند ہو جانے سے اِنتقال کیا اور اسی شام جوہو کے قبرِستان میں سپردِ خاک ہوئے۔''

(تذکرۂ معاصرین حصہ دوم، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 17)

عادل رشید کا بچپن اپنے محلّے کی لائبریری میں زیادہ گزرا، علم و ادب کا ذوق ان کو اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ وہ اپنے محلے کی رفیع الزماں لائبریری میں جاتے اور رسالوں کا مطالعہ کرتے، ان کو لکھنے کا شوق بھی یہیں سے پیدا ہوا۔ صرف 15 سال کی عمر میں ہی انھوں نے اپنا پہلا افسانہ 'قرض' کے نام سے لکھا تھا۔ جو کانپور سے شائع ہونے والے رسالے 'مستورات' کے خاص نمبر (1935) میں چھپا تھا۔ اتنی کم عمری میں افسانہ لکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں قابلیت کی کمی نہیں تھی۔ ان کو خداداد صلاحیت حاصل تھی۔ اپنے افسانے 'قرض' تک ان کے قارئین ان کو 'سید محمد منظور الحق میوی' کے نام سے جانتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری شروع کر دی عادِل تخلص رکھا اور رشید میوی وطن سے نسبت ملا لی، لیکن بعد میں احساس ہوا کہ نسبت کبھی میوی چھپ جاتی ہے تو کبھی میٹوی، اس سے تنگ آ کر انھوں نے اس نسبت کو ہی ختم کر دیا اور صرف عادِل رشید بن گئے۔ عادِل رشید کے نام سے اتنے مشہور ہوئے کہ آج تک لوگ ان کو اسی نام سے جانتے ہیں، ان کے اصلی نام منظور الحق سے کم لوگ ہی واقف ہیں۔

مالک رام نے عالمی اردو ادب کے مقبولِ عام ادب نمبر جو اگست 2015 میں شائع ہوا تھا، اس میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عادل رشید بھی مقبول عام ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ایک زودنویس ادیب تھے۔ ہر مہینے ایک ناول لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ناول لکھے۔ جیسے لرزتے آنسو وغیرہ۔ اُن دنوں اِن کے ناولوں کی بڑی مانگ تھی اور وہ دھڑا دھڑ بکتے

تھے، علاوہ ازیں وہ شاہد، حجاب وغیرہ رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔''

(عالمی اردو ادب، مقبولِ عام ادب نمبر، مالک رام، اگست 2015، ص 216)

عادل رشید ابھی 8 برس کے ہی تھے کہ والدہ چھوڑ کر چلی گئیں، گیارہ برس کی عمر میں کانپور چھوڑنا پڑ گیا، فساد کی وجہ سے الہ آباد میں سکونت اختیار کی اس وقت وہ اپنے خاندان کے ساتھ کانپور میں ہی قیام پذیر تھے، 15 برس کے تھے کہ والد نے دوسری شادی کر لی، اسی دوران عادل رشید کو 'شاہد' رسالے میں ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی جس کی وجہ سے گھر اور والد دونوں کو چھوڑ کر بریلی چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد بریلی سے دہلی اور پھر اے آر کاردار (پروڈیوسر اور ڈائریکٹر) کی دعوت پر فلموں کی کہانی لکھنے کے لیے دہلی سے 350 روپے کی مستقل آمدنی چھوڑ کر ممبئی اپنی قسمت آزمانے چلے گئے۔ جہاں انھوں نے اے آر کاردار کے جھوٹے وعدے کی وجہ سے فاقہ کیے، بازار کی پٹریوں پر راتیں گزاریں اور پھر ممبئی سے ہی انھوں نے اپنے ناول لکھنے کا سفر شروع کیا۔ 'میر صاحب' ان کا پہلا ناول تھا جو ستمبر 1944 میں الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد سے پہلی بار شائع ہوا تھا۔ عادلِ رشید نے ناول کے علاوہ کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ 'خزاں کے پھول' کے نام سے ایک رپورتاژ لکھا جو 1949 میں شائع ہوا۔ یہ رپورتاژ یکم نومبر 1948 میں احمد آباد میں ہوئی کانفرنس کی ہے، اس کانفرنس میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے کئی مشہور مصنّفین شامل ہوئے تھے۔ عادل رشید کے ساتھ ممبئی سے احمد آباد کے اس سفر میں شامل ہوئے مصنفین کی اس جماعت میں اِن کے ساتھ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری، ساغر نظامی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، حبیب تنویر اور ہارون خوشتر شامل تھے۔ اس رپورتاژ میں عادلِ رشید نے سفر کے واقعات، کانفرنس کا منظر، صدارتی خطبات، وہاں پڑھی جانے والی غزلیں اور نظمیں اور اپنی کہانی 'اور ایک سال گزر گیا' کو پیش کیا ہے۔

خزاں کے پھول بھی عادل رشید کی طرح گمنامی کی دنیا میں کھو سی گئی تھی۔ اس کو دوبارہ مرتب کر کے شائع کرنے کا موقع مجھ راقم الحروف کو ملا جس کو 2022 میں اپلائڈ بکس دریا گنج کے ذریعے شائع کروایا۔ اس رپورتاژ کے مقدمے میں عادل رشید کے 87 ناولوں کے ناموں کے ساتھ کچھ افسانوں کے ناموں کی فہرست بھی درج ہے' آئینے' کے نام سے خاکے بھی درج ہیں۔ اس کے علاوہ فلمی شخصیات پر ایک تذکرہ 'فلمی مہرے (ایک اچھوتی پیشکش)' کا ذکر بھی ہے۔

عادل رشید نے' آئینے' کے نام سے خاکے لکھ کر اردو ادب کے لیے خاکہ نگاری میں بھی اِضافہ کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے فساد پر بھی ایک کتاب 'فسادی ادب' کے نام سے مرتب کی ہے۔ انھوں نے تذکرہ نگاری میں بھی ہاتھ آزمایا ہے۔ 1957 میں فلمی مہرے (ایک اچھوتی پیش کش) جو الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے کچھ فلمی شخصیات کے تذکرے لکھے۔ اس تذکرے میں 44 فلمی شخصیات شامل ہیں۔ ان سبھی سے عادل رشید کے بڑے ہی قریبی تعلقات رہے ہیں، اس تذکرے میں عادل رشید نے ان شخصیات کو ممبئی میں پیش آنے والی ابتدائی زندگی کی کشمکش کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کو ممبئی شہر میں کن کن مشکلوں سے گزرنا پڑا تھا، اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ عادل رشید نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہ وہ کس طرح ممبئی گئے اور وہاں کے شروعاتی حالات کس طرح کے تھے اور فلمی شخصیات کے ساتھ ان کے تعلقات کس طرح کے تھے یہ بھی بیان کیا ہے۔

اس تذکرے میں جن اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے ان میں نوشاد، نرگس، بھارت بھوشن، ثریا، دیو آنند، دلیپ کمار، نمی، اشوک کمار، کے۔ آصف، مینا کماری، کے۔ ایل۔ سہگل اور راج کپور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عادِل نے کچھ فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں جیسے ولی کی فلم 'زمانے کی ہوا' کی کہانی، یہ فلم جنوری 1954 کو ریلیز ہوئی تھی۔ عادل رشید نے پہلی بار 'دیوکا رانی' کی فلم 'اچھوت کنیا' پر تنقید کی تھی، راج کپور کی فلم 'آگ' پر اپنا ریویو بھی دیا تھا کہ وہ اپنی پہلی ہی فلم میں بڑا ڈائرکٹر بن کر سامنے آیا ہے، عادل نے بھوپال میں ایک فلم کمپنی بھی کھولی تھی اور ایک فلم بنائی جس میں اجیت کے ساتھ گیتا بالی ہیروئن تھی پر افسوس کہ فلم ڈائرکٹ نہیں ہو سکی۔ نعت اور قوالی بھی لکھی، (H.M.V CO.) ہز ماسٹرز وائس کمپنی میں ان کے گانوں کے گراموفون بھی ریکارڈ ہوئے، شاہد اور حجاب رسالے کے مدیر اور ناشر بھی تھے۔ بچوں کے لیے کچھ کہانیاں بھی لکھی ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں چوہوں کی حکومت، بچوں کی حکومت، ایران کی شہزادی، چین کی شہزادی۔

عادِل رشید کے ناولوں کا ڈنکا صرف ہندوستان میں ہی نہیں بج رہا تھا بلکہ پڑوسی ملک پاکستان میں بھی وہ اپنے ناولوں کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ وہاں کے پبلشرز بھی ان کے ناول شائع کیا کرتے تھے۔ اردو زبان کے علاوہ ان کے ناول ہندی زبان میں بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ اتنی صلاحیتوں کے باوجود پتہ نہیں کیوں ہمارے ناقدین اور محققین نے ان کے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی کی ہے۔ ان کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی جب کہ ان کے ناولوں میں ناول نگاری کا فن بھرپور انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

عادِل رشید ناول کے فن کا وہ ہیرا ہے، جس نے نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسرے لکھنے والوں کو بھی انھوں نے اپنے رسالوں میں مواقع دیے۔ انھوں نے ہی پہلی مرتبہ 'ہاجرہ مسرور' کے افسانوں کو شاہد اور حجاب میں جگہ دی۔ عادِل رشید نے نہ صرف ان کو اردو ادب میں روشناس کرایا بلکہ معاوضہ بھی دیا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی، یہاں تک کے ان کے افسانوں کو جگہ جگہ سے سنوارا بھی۔ عادل دوست بھی کمال کے تھے انھوں نے ولی کی فلم 'پتلی' کی کہانی کرشن چندر کو لکھنے کے لیے دے دی، کیونکہ اس وقت کرشن چندر کے حالات سازگار نہیں تھے۔ عادل رشید مقبولِ عام ادب کے وہ ادیب ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کی زندگی کا مقصد حقائق کی گہرائیوں تک اتر کر معاشرے کو سنوارنا تھا۔ وہ سماج کے حالات اپنے آنسوؤں اور خون سے لکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی طرزِ نگارش میں ایسا اثر اور زندگی ہے جسے کبھی فنا نہیں۔ وہ ایک حساس ذہن کے مالک تھے، اور اپنے ناولوں کا مواد اپنے آس پاس کے حالات سے ہی متاثر ہو کر لیا کرتے تھے۔ وہ ملک اور قوم سے بھی بے پناہ محبت کرتے تھے اسی لیے ان کے موضوع سوئے ہوئے ذہنوں کو بیدار کر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ناولوں میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر، جذبات، اسلوب اور تکنیک ان سب باتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اپنی انھی باتوں کی وجہ سے عادل رشید ناول کے فن میں کامیاب ناول نگاروں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ عادل رشید نے اپنی زندگی میں قریب 150 ناول اور کچھ افسانے بھی رقم کیے، ان کے کچھ ناولوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ میر صاحب، روپ، جب محبت جاگتی ہے، لبِ بام، دلہن، بربط کے تار، گلشن، وہ آئے گی، سشما، جرم و سزا، نگاہِ جمال، چراغِ محفل اور چودھویں کا چاند وغیرہ۔ اور ان کے افسانوں میں دکھتی رگیں (افسانوں کا مجموعہ)، درندے، سب رنگ (افسانوں کا مجموعہ)، دو لاکھ روپے کا نوٹ (افسانوں کا مجموعہ)، ایک پتھر ایک پھول، حسن جو روح میں ہے اور فسادی ادب (مرتب شدہ) وغیرہ شامل ہیں۔

■

Mohd Tanveer
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025

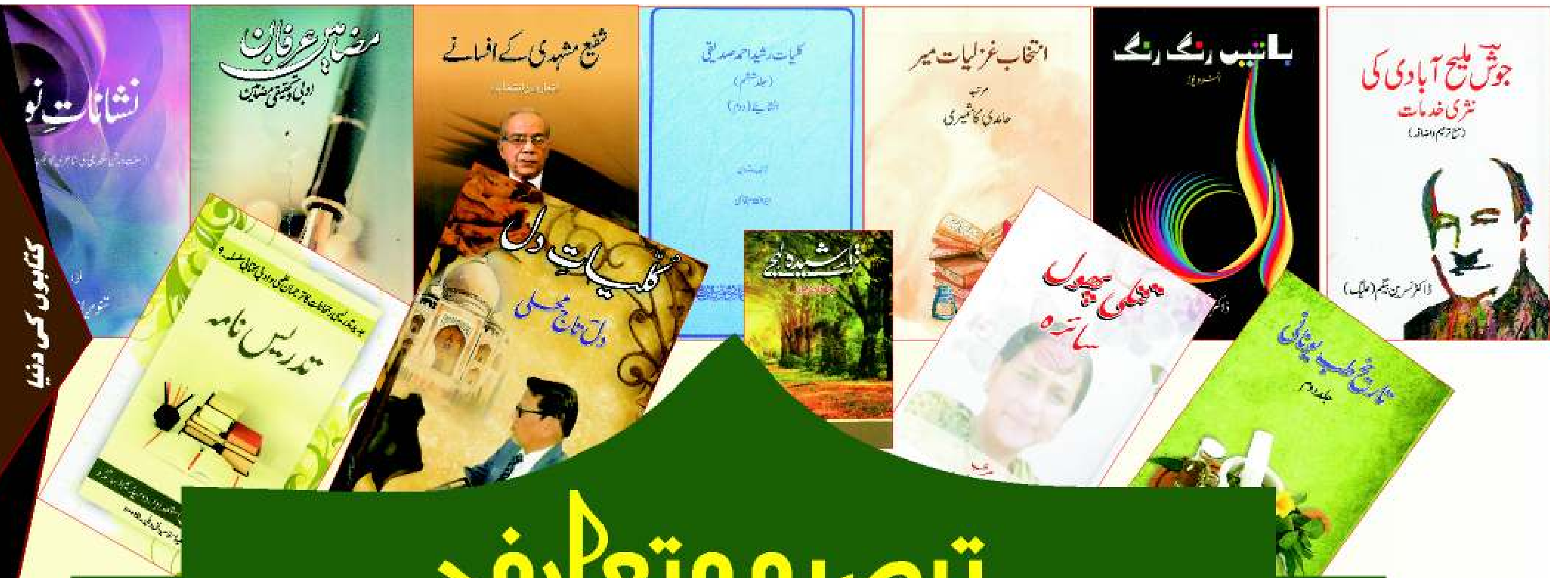

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

انتخاب غزلیات میر

مرتب: حامدی کاشمیری
قیمت: 115 روپے، چوتھی اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: شاہ عمران حسن، اے 22، شاہ ہاؤس، مکی مسجد کالونی، مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ:3 نالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی 110076

میر تقی میر اردو شاعری میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام میر تقی تھا جب کہ انھوں نے اپنا تخلص بھی 'میر' رکھ لیا تھا۔ اس طرح وہ میر تقی میر کے نام سے جانے گئے۔ ابھی وہ صرف دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے سوتیلے بھائیوں نے ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ حتیٰ کہ وہ آگرہ سے ہجرت کرکے دہلی چلے گئے اور اس وقت کے استاذ شاعر سراج الدین خان آرزو کی شاگردی اختیار کی۔ دہلی کے بعد میر تقی میر نے لکھنؤ میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈ لی۔ لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ نے ان کا ہر طرح سے تعاون کیا۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں ان کی شاعری کو عروج حاصل ہوا۔

اگر میر تقی میر کی تخلیقات کی بات کی جائے تو اردو میں ان کے چھ دیوان، ایک فارسی دیوان، تذکرہ نکات الشعرا اور ایک خودنوشت 'ذکرِ میر' بھی ہے۔

میر تقی میر کی پوری زندگی درد والم میں گزری۔ لکھنؤ آنے کے بعد بھی انھیں خوشحالی نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں خوشامد پسند نہ تھی، وہ کسی کی جی حضوری یا چاپلوسی کو اپنے لیے گناہ سمجھتے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد میں قصیدہ نہیں لکھا۔ انھوں نے غزلوں میں اپنے روح کی تسکین ڈھونڈ لی۔

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

میر تقی میر کی کو جہاں اردو شاعری کا امام کہا جاتا ہے وہیں انھیں غزلوں کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام سے ان کے فکر کی وسعت جھلکتی ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ، بے خبر
میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

میر کے کلام کی گہرائی وگیرائی اور رفعت ووسعت کی وجہ سے شروع سے اس کے افہام وتفہیم کا سلسلہ جاری ہے، اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اب تک ان کی شاعری کے متعدد انتخابات بھی شائع ہوچکے ہیں۔

ان میں سے ایک اہم کتاب 'انتخاب غزلیات میر' ہے۔ اس کتاب کو جموں وکشمیر کے معروف شاعر وادیب حامدی کاشمیری نے مرتب کیا ہے۔

حامدی کشمیری نے دعویٰ کیا ہے کہ میر کے تیرہ ہزار سے زائد اشعار میں بمشکل تین ہزار کے قریب اشعار ہیں جو فنی لحاظ سے تکمیلیت کا احساس دلاتے ہیں، بقیہ اشعار بس بھرتی کے ہیں اور فنی لحاظ سے ناقص ہیں۔ ان میں سے بیشتر اشعار بلندیا پست خیالات اور محض خیالات کے منظوم اظہار کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، جو ظاہر ہے دائرۂ شعر سے خارج ہیں۔

(انتخاب غزلیات میر ص14)

انھوں نے زیرتبصرہ کتاب کو مرتب کتاب حامدی کاشمیری نے میر کی دریافت نو (انتخاب غزلیات میر، ص 15) کہا ہے۔

حامدی کاشمیری مزید لکھتے ہیں کہ میری کوشش یہی رہی ہے کہ اس انتخاب میں ہر ایسے شعر کو شامل کیا جائے جو شعری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت سے متصف ہو، یعنی جو جامد حقیقی سطح سے انقطاع کرکے ایک نموپذیر اجنبی تخیلی فضا کی تخلیق پر قادر ہو۔ (انتخاب غزلیات میر، ص 16)

وہیں حامدی کاشمیری میر شناسی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ امر باعث طمانیت ہے کہ حالیہ برسوں میں میر شناسی ایک حد تک ایک بارآور دور سے گزر رہی ہے۔ نئے نقادوں نے عالمی معائیر نقد سے واقفیت حاصل کرکے اردو ادب کی قدر سنجی کی طرف توجہ کی ہے۔ نئے تنقیدی شعور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ماضی کے ادب العالیہ کے تعین قدر کی ضرورت کا احساس بھی فروغ پا رہا ہے، چنانچہ نئے نقادوں میں شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، نظیر صدیقی، مغنی تبسم، جمیل جالبی، فضیل جعفری اور وارث علوی نے میر کو نئے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پرکھنے کے عمل کی ابتدا کی ہے۔ اس عمل کو موثر اور ثمرآور بنانے میں اس ہندو پاک سیمینار کو اہمیت حاصل ہے جو 1978 میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے زیراہتمام منعقد کیا اور جس میں میر پر بارہ سے زیادہ مقالے پڑھے گئے۔ اس سے پہلے بھی میر پر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں عبدالحق، اثر لکھنوی، آل احمد سرور، فراق گورکھپوری، شبیہ الحسن، حسن عسکری، سید عبداللہ، خواجہ احمد فاروقی اور سردار جعفری کی تحریریں قابل ذکر ہیں۔

خیال رہے کہ اس کتاب کی ترتیب اور تیاری میں حامدی کاشمیری نے مسلسل پانچ برس لگائے تب جاکر کتاب سنہ 1988 میں منظر عام پر آئی۔ حامدی کاشمیری کے عزیز شاگرد عبدالمجید میر نے اس انتخاب میں ان کی بھرپور معاونت کی ہے۔

کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں میر تقی میر کے دواوین سے تقریباً تین ہزار اشعار منتخب کیے گئے ہیں، تاکہ ایک عام آدمی بھی کم وقت میں میر تقی میر کی شاعری سے بہ آسانی استفادہ کرسکے۔

کتاب کے اندر میر کے پہلے دیوان سے سب سے زیادہ اشعار منتخب کیے گئے ہیں، جب کہ دوسرے اور بقیہ دواوین سے نسبتاً کم اشعار لیے گئے ہیں۔

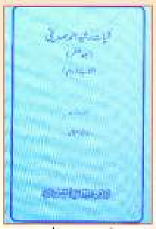

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد دوم)

مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی

صفحات: 510، قیمت: 235 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: احسن رضا، مکان نمبر 312، کے ایچ نمبر 277/176 لیفٹ پورشن، تھرڈ فلور، اپوزٹ رام گھاٹ کالونی (وزیرآباد ایکسٹینشن)، اسٹریٹ نمبر 6، دہلی 84

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے اہم طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور مزاح نگاری کے بہترین نمونے اردو ادب میں چھوڑے ہیں۔ ان کے ادبی سرمایے کو اردو کے نامور ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آٹھ جلدوں میں جمع کیا ہے۔ یوں تو رشید احمد صدیقی ایک اچھے استاد، محقق اور ناقد بھی تھے مگر ان کی اصل وجہ شہرت طنز و مزاح کے میدان میں ان کی جولانی طبع ہے۔ وہ نصف صدی تک اس میدان کے نمایاں شہ سوار تھے۔

زیرتبصرہ کتاب کلیات رشید احمد صدیقی کی آٹھویں جلد ہے۔ اس میں مرتب نے رشید احمد صدیقی کی جن تحریروں کو جمع کیا ہے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ سے ہے۔ ان کی نگارشات میں علی گڑھ کا پایا جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ مضمون، انشائیہ اور خاکے ہر ایک تحریر میں علی گڑھ کی جلوہ گری کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریر سے مستفید ہونے کے لیے قاری کا علی گڑھ سے واقف ہونا بھی ضروری ہے تبھی ان کی تحریر، اسلوب بیان سے لطف اندوز ہونا ممکن ہے۔

زیرتبصرہ کتاب کا پہلا مضمون 'سرسید اور علی گڑھ' کے عنوان سے ہے اس میں رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ تحریک کی علمی، ادبی، سماجی، اور فکری معنویت کو علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ یہ ایک تنقیدی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس میں ان حالات و حوادث کا ذکر ہے جن کے تحت یہ تحریک وجود میں آئی اور ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی حالات کو بہتر بنانے میں اس تحریک نے جو کردار ادا کیا اس کا محاسبہ کیا گیا ہے۔

اس میں ایک مضمون 'سلام ہو نجد پر' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں سرسید تحریک اور علی گڑھ اسٹوڈنٹ یونین کی عظمت رفتہ کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ایک مضمون جس کا عنوان 'سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا' اس میں سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اور سرسید کے حوالے سے جو تاریخی شواہد مختلف دستاویزوں یعنی سپاس ناموں اور ان کے جوابات، خطوط اور مضامین میں منتشر تھے ان کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے یہ مضمون تقریبا 131 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہے۔ اس میں خصوصیات کالج کے عنوان سے تین قسطوں میں لکھا ہوا مضمون ہے جس میں رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کے ہاسٹل کے حالات کو پیش کیا ہے۔ اس میں وہاں کے طلبا کو اس روایت سے متعارف کیا گیا ہے جس کے لیے علی گڑھ جانا جاتا ہے۔ اس میں کچھ مضامین آپ بیتی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق سفرنامے سے ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر برما اور سفر لکھنؤ کی روداد بیان کی ہے ساتھ ہی سرشاہ سلیمان، احسن مارہروی اور سر راس مسعود کے خاکے بھی ہیں۔ سرشاہ سلیمان کا شمار علی گڑھ کے ان باکمالوں میں ہوتا ہے جن کے علم و فن سے ایک عہد متاثر ہوا۔ وہ علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہے۔ وہ اعلیٰ ترین قانونی دماغ رکھتے تھے فیڈرل کورٹ کی ججی کے دوران ان کے دیے گئے فیصلوں کی تعریف و تحسین ایک دنیا نے کی ہے۔ 'شیخ اور سید' کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں شیخ عبداللہ 'پاپا میاں' اور سرسید کی شخصیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ احسن مارہروی کا خاکہ بہت عمدہ ہے۔ ان کا تعلق بہت محترم خانوادے سے تھا۔ انھیں اردو شاعری پر غیر معمولی قدرت تھی۔ ایک مضمون 'ڈیوٹی سوسائٹی کی سرگزشت' میں اس سوسائٹی کے قیام کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ 'برسبیل تذکرہ' اردو زبان پر لکھا ہوا ایک مضمون ہے۔ علی گڑھ کے کتب خانے پر بھی ایک مضمون ہے جس میں وہاں کے ذخیرۂ مخطوطات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ایک مضمون غالب اور علی گڑھ کے عنوان سے ہے اس میں انھوں نے مختلف دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ غالب کا اس ادارے سے خاص تعلق رہا ہے وہ اس طرح کہ سرسید اور ان کے راست تعلقات تھے، ساتھ ہی الطاف حسین حالی جو سرسید کے رفیق کار تھے انھیں غالب کی خاص شاگردی کا شرف حاصل تھا اور بھی طرف داران غالب علی گڑھ کے بطن سے جنم لیے۔ 'سیاحت برما' کے عنوان سے ان کے مضمون کی تین قسطیں اس میں شامل ہیں۔ 'میرا سفر'

کے عنوان سے ان کا ایک سفر نامہ لکھنو شامل ہے۔ حیدر آباد کا سفر نامہ بھی اس میں شامل ہے۔ ایک مضمون جامعہ کی دوسری جوبلی پر لکھا گیا ہے۔ ان سب کے ساتھ کچھ انشائیے بھی اس میں ہیں جیسے عدالت پچاس سال پہلے، چار درویش، شراب کی ممانعت، طوفان تکلم، خوانچے والا، طوطا کہانی اور مسجد کا قیدی بہت عمدہ انشائیے ہیں۔ ان سب میں ان کا اسلوب بیان واضح طور پر نمایاں ہے۔ رشید احمد صدیقی کا اسلوب شائستگی، شگفتگی اور علمیت سے عبارت ہے، وہ کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑتے، اس کی ساری جزئیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں خوش طبعی کے ساتھ فلسفیانہ افکار کی آمیزش جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر میں علی گڑھ کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور آجاتا ہے یہ ان کے اس ادارے سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ رشید احمد صدیقی نہ صرف بلند پایہ انشا پرداز، خاکہ نگار، طنزومزاح نگار ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا دل قوم کی اصلاح کے لیے بھی دھڑکتا ہے۔ امید ہے کہ اس جلد کا مطالعہ سرسید تحریک اور رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

دور سے معلومات...

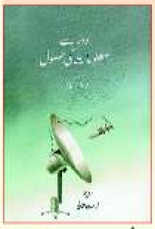

مصنف: محمد احرار عالم

مترجم: فرحت عثمانی

صفحات: 130، قیمت: 90 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: زرقا رحمٰن ، پرنسپل علامہ اقبال اسکول، میاں سرائے سنبھل، یوپی 244302

زیر تبصرہ کتاب اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہے کہ اردو میں محض شعرو شاعری کی کتابیں ملتی ہیں اور سائنسی معلومات کی کتابوں سے اردو کا دامن خالی ہے۔ یہ کتاب جو ریموٹ سینگ پر مشتمل ہے پوری طرح سے معلومات افزا ہے۔ جس کے ذریعے قاری دور سے معلومات کے حصول کی تمام کیفیات وتفصیلات کو جان سکتا ہے۔

یہ کتاب نو ر9 ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوانات اس طرح ہیں:

(1) دور سے معلومات حاصل کرنا (2) برقی مقناطیسی تابکاری (3) توانائی کے تفاعل (4) پلیٹ فارم، مدار، مصنوعی سیارہ اور سیسہ (5) مداروں میں مصنوعی سیارہ (6) معلومات کی وصولی، ترسیل اور عمل کرنا (7) بصری شبیہ کی تشریح اور تجزیہ (8) عددی شبیہ پر عمل کرنا اور اس کا تجزیہ کرنا (9) ٹھیک جگہ معلوم کرنے کا عالمی نظام۔

ان ابواب کے ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ جن میں متعلقہ چیزوں کے دیگر گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے قارئین کو بتاتے چلیں کہ دور سے معلومات کی حصولی ایک فن اور سائنس ہے۔ جس سے ہیئتی خصوصیات کو جسمانی طور سے چھوئے بغیر ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اسی فن پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

یہ کتاب اس قدر معلوماتی ہے کہ اس کو متعلقہ معلومات کا سمندر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں محدود طور پر محض موضوع پر ہی نہیں لکھا گیا۔ بلکہ مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بطور مثال اس میں فضائی کھڑکیاں، مصنوعی سیارے، بصری شبیہ، عددی شبیہ، خلائی جزو وغیرہ کے بارے میں بڑی ہی شرح وبسط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مفکرین کے اقوال تحریر کیے گئے ہیں۔ مناسب جگہ جدول دیے گئے ہیں اور جا بہ جا تصاویر بھی دی گئی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ عموماً اس طرح کی کتابیں خشک انداز میں لکھی ہوتی ہیں۔ جس سے پڑھنے والوں کو تھکاوٹ و اکتاہٹ کا سامنا ہوتا ہے۔ مگر اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو بڑے ہی دلکش و پر لطف انداز میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کی تحریر عمدہ ہونے کے ساتھ مترجم کی کاوش بھی قابلِ تعریف ہے کہ ان کا اندازِ ترجمہ نگاری ایسا ہے کہ کتاب دوسری زبان سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس پر اصل متن کا گماں ہوتا ہے۔ بطور نمونہ کتاب میں مصنوعی سیارے کے متعلق دی گئی معلومات کا اقتباس سطور ذیل میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''مصنوعی سیارہ ایک شئے ہوتا ہے جو زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ چاند قدرتی سیارہ ہے، جبکہ انسان کے بنائے سیارے میں دور سے معلومات حاصل کرنے، ترسیل کرنے اور مادہ پیمائی (مقام اور آمد و رفت) میں ایک اور شے کے لیے چھوڑے گئے پلیٹ فارم شامل ہوتے ہیں۔ مصنوعی سیارے کی محض دو اقسام ہیں (i) سورج ہمہ وقت یا قطبی مصنوعی سیارہ اور (ii) ارضیاتی یا زمینی ساکن مصنوعی سیارہ۔' (ص 53)

اسی مضمون کے نیچے ہی ان کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ جس سے موضوع ومضمون کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کتاب میں بیان کیے گئے موضوعات کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ اس کو فلکیات وموسمیات کے ساتھ ہی جنگی حالات اور عہدِ حاضر میں بہت ہی زیادہ مفید وکارآمد ذریعۂ آمد و رفت یعنی ہوائی جہاز کے لیے بھی جزو لازم کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو اڑانے میں دور سے معلومات کا حاصل کرنا بنیادی حصہ مانا گیا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو ہوائی جہاز کو فضا میں اڑایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو صحیح طرح سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے کتاب میں پیش کردہ معلومات سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جا سکتا ہے:

''ٹھیک جگہ معلوم کرنے کے لیے عالمی نظام (جی پی ایس) کی مدد سے ہوائی جہاز اپنے متعین کردہ راستوں پر کامیابی سے آتے جاتے ہیں۔ جی پی ایس کی ٹھیک جگہ معلوم کرنے کی بڑھی ہوئی درستی کی وجہ سے، اس نظام کو اب تصادم سے بچنے کے لیے ہوائی ٹریفک کے ایک لازمی جزو کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ جی پی ایس کی زیادہ درستی سے تحفظ وسلامتی سے سمجھوتہ کیے بغیر راستے کے مرحلے کے دوراں ہوائی جہاز کے درمیان علیحدگی کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔' (ایضاً، 121)

یہ کتاب اپنے خاص اور متعلقہ موضوعات پر مشتمل معلومات سے پوری طرح مالا مال ہے۔ مختصر طور پر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کو خرید کر مطالعہ کیا جائے۔ اور اپنی ذاتی لائبریری میں اس کو محفوظ کر کے کتاب دوستی کا ثبوت دیا جائے۔ یہ کتاب ظاہری خوبصورتی سے بھی آراستہ ہے۔

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

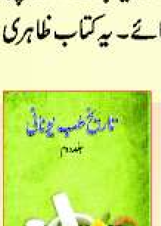

صفحات: 234، قیمت 140 روپے، سنہ اشاعت 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبید الکبیر، جامعہ ہمدرد نئی دہلی

'تاریخ طب یونانی' طب یونانی کی تاریخ پر مشتمل ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ کسی ایک مصنف کی قلمی کاوش نہیں ہے بلکہ مختلف اہل قلم اطبا کی نگارشات کا مجموعہ ہے جسے قومی کونسل کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اس کتاب کی دوسری جلد ہے جو کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اگلے سطور میں ہم انھیں ابواب کے مشمولات پر مختصر تبصرہ وتاثر پیش کریں گے۔ شروع میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی صاحب کا تعارفی نوٹ ہے جو کتاب کے موضوع، اس کی اہمیت، غرض اشاعت اور ترتیب وپیشکش کے مراحل میں شامل حکما واطبا کے تذکرہ پر مشتمل

ہے۔اس کے بعد کتاب میں معروف حکیم اور اہل قلم جناب سید ظل الرحمٰن صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ شامل ہے۔ یہ مقدمہ بڑا جامع اور مبسوط ہے۔ فاضل قلم کار نے طب یونانی کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔فن طب کی مختلف شاخوں، ان کے موجدین اور مختلف زمان و مکان میں طب یونانی کی ترویج و اشاعت کے طویل سفر کی روداد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ کسی کتاب میں مقدمہ کی جو فطری حیثیت ہونی چاہیے اس معیار پر یہ مقدمہ بہ تمام وکمال کھرا اترتا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں جنوبی ہند یعنی دکن کے علاقے میں طب یونانی کے احوال سے بحث کی گئی ہے۔دکن کے مختلف علاقوں کے اطبا کا تذکرہ، وہاں قائم ہونے والے تعلیمی اداروں اور ارباب طب کی فنی خدمات پر اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ باب NIUM بنگلور سے وابستہ جناب حکیم عبدالودود کا رقم کردہ ہے۔

کتاب کے دوسرے باب میں ہندوستان کی ریاست اودھ و بھوپال کی طبی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ باب حکیم افتخار احمد نقوی و حکیم عبدالعزیز صدیقی صاحبان کا تحریر کردہ ہے۔اس باب میں طب یونانی کے ارتقا اور اس میں پیش پیش رہنے والے خانوادوں، اداروں اور ان کی منصوبہ بندیوں کا تعارف و تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب حکیم فخر عالم صاحب کا مرتب کردہ ہے۔ یہ باب قدرے مفصل ہے جس میں طب یونانی کی تعلیم گاہوں کا تذکرہ ہے۔اس ضمن میں طب یونانی کے تعلیمی ادارے ان کے نصاب اور مفوضہ ڈگریوں کا مرحلہ وار ذکر کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی سے زمانہ حال تک طب یونانی کی تعلیم جن مناہج و مراحل سے گزر کر آج BUMS کی معیاری انڈر گریجویٹ ڈگری تک پہنچی ہے اس کی تشفی بخش روداد اس باب میں دیکھی جا سکتی ہے۔طب یونانی کے متداول اداروں اور پی جی لیول کے خصوصی اداروں کے قیام و ارتقا نیز ان کی کارکردگی اور ہمہ جہت اثرات کو بھی فاضل مرتب نے بیان کیا ہے۔

باب چہارم حکیم بلال احمد صاحب کا رقم کردہ ہے جو طب یونانی کی اہم مطبوعات کے جائزے پر مشتمل ہے۔اس کے تحت نوے سے زائد عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا تعارف مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ کتابوں پر مختصر نوٹ کے ضمن میں مصنف، مطبع اور سن اشاعت بھی درج کیے گئے ہیں۔

پانچواں باب جو ضخامت میں تقریباً اپنے سابق باب جیسا ہی ہے حکیم احمد سعید کا ترتیب دیا ہوا ہے۔اس باب میں اہم طبی مخطوطات کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ طب یونانی کے گراں قدر مخطوطات اور متعلقہ لائبریریوں کا ذکر بھی باب کا حصہ ہے۔

چھٹا باب یونانی طب کے تذکرہ نگاروں سے متعلق ہے۔ یہ باب حکیم معراج الحق صاحب کا مرتب کردہ ہے۔ موصوف نے تذکرہ نگاروں کو عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے خانوں میں ذکر کیا ہے۔عہد جدید کے تذکرہ نگاروں کی مزید درجہ بندی عربی و اردو کے عنوان کے تحت کی ہے۔اس باب میں اسحاق بن حنین وغیرہم کی نگارشات سے لے کر حکیم اشہر قدیر صاحب کی کتاب تاریخ طب و اخلاقیات تک پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مرتب نے الگ الگ زمانوں کے مؤرخین و مصنفین کا تعارف بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا ہر باب بجائے خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے تاہم اس کی ترتیب میں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ مجموعہ ایک مربوط کتاب معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر سلیس زبان میں جامع عناوین پر مشتمل نگارشات کا ایک شائستہ مجموعہ ہے۔اس کتاب کی ترتیب و تبویب اور نظر ثانی میں حکیم ظل الرحمٰن، احمد سعید، عبد الباری، رضی الاسلام ندوی، حسان نگرامی، پروفیسر محمد وامق وغیرہم جیسی شخصیات شریک ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

تحقیق و تنقید

جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات

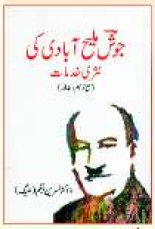

مصنف: ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)
ضخامت: 202 صفحات، قیمت: 500 روپے
ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی
مکان نمبر 372 گلی نمبر 14 غفار منزل، اوکھلا، نئی دہلی 25

جوش کا شمار جہاں اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے وہیں ان کے نثری کارناموں بالخصوص 'یادوں کی برات' کو اردو خود نوشت نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن عام طور پر ناقدین کی تحریریں ان کی شاعری اور ان کے فکر و فن کے حوالے سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جوش کے نثری کارناموں کے جائزے میں عام ناقدین کی سانسیں محض 'یادوں کی برات' کے تذکرے پر ہی پھولنے لگتی ہیں حالانکہ ان کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے اور بقول عبدالستار دلوی متفرق تحریروں کے علاوہ رسالے 'آجکل' اور 'کلیم' بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ) کی تصنیف 'جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات' جوش شناسی اور بالخصوص ان کی نثر نگاری کے تذکرے کے باب میں اسی خلا کو پُر کرتی ہوئی ایک اہم کاوش ہے۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر نسرین نے جوش کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بناتے ہوئے ان کی نثری خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر منظر عباس نقوی کے تحریر کردہ پیش لفظ کے علاوہ حرف آغاز اور کتابیات کے ساتھ تین ابواب حیات و شخصیت، تصنیفی سرمایہ اور اسلوب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ڈاکٹر نسرین بیگم نے آباء و اجداد، ولادت اور بچپن، شخصیت، تعلیم، شادی، ملازمت، رسائل کی ادارت، شاعری، پاکستان کی ہجرت اور انتقال جیسے ذیلی عناوین کے تحت جوش کی شخصیت و سوانح، تعلیم و تربیت، ذاتی و ازدواجی زندگی، مشاغل و ملازمت، ادارت و شاعری، ہندوستان سے پاکستان کی ہجرت اور پھر وفات غرض یہ کہ مکمل داستان حیات بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے اپنی بات کو مستند و مستحکم بنانے کے لیے قدم قدم پر تاریخی مواد و مآخذ کا سہارا لیا ہے جس سے کتاب کی تحقیقی حیثیت دوچند ہوگئی ہے۔

دوسرے باب کے تحت جوش کے تصنیفی سرمایے پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس میں بھی مقالات، مکاتیب، متفرق تحریریں اور خود نوشت سوانح عمری (یادوں کی برات) کے ضمن میں مصنفہ نے جوش کی تمام تر علمی و ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کی بڑی خوبصورت کوشش کی ہے بلکہ بغور دیکھا جائے تو یہی دراصل اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا منشا بھی ہے۔ اس حوالے سے خود مصنفہ لکھتی ہیں کہ 'مقالے کے اس حصے میں پہلے ان مقالات سے بحث کی گئی ہے جو ان کی زیر ادارت نکلنے والے رسالوں میں شائع ہوئے تھے اور اب 'اشارات' کے نام سے کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ مقالات کے بعد جوش کے وہ مکاتیب ہیں جو اب تک دستیاب ہو سکے ہیں، ان کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مکاتیب اگرچہ تعداد میں کم ہیں، لیکن جوش کی نثر نگاری کا کوئی تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی متفرق نوعیت کی تحریریں بھی ہیں جنھیں ہم اس مقالے میں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی نشان دہی کی گئی ہے تاکہ جوش کی جو بھی نثری تحریریں دستیاب ہیں ان کا کوئی بھی گوشہ تاریکی میں نہ رہے۔' کتاب کے آخری باب میں ڈاکٹر نسرین بیگم نے جوش کے نثری اسلوب کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جوش کی معرکۃ الآرا اور اردو خود نوشت سوانح نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والی تصنیف 'یادوں کی برات' اور دیگر تحریروں کے ذریعہ نہ صرف نثری ادب میں جوش کے مقام و مرتبے کے تعین کی سعی کی ہے بلکہ یہاں انھوں نے مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں جوش کے حوالے سے مروج باتوں کی تائید یا تردید بھی کی ہے۔

اس طرح زیر نظر کتاب تحقیق و تنقید میں اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف ایک اہم پیشکش ہے بلکہ اس سے جوش شناسی کے نئے در وا ہوں گے۔ موضوع و مواد کے علاوہ یہ کتاب زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بڑی اہم ہے۔ ڈاکٹر نسرین بیگم نے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں خالص تنقیدی زبان اور سائنٹفک طریقۂ استدلال سے کام لیا ہے۔ کتاب کے بیک کور پر پروفیسر عبدالستار دلوی کی تحریر نے اس کی اہمیت و افادیت میں چار چاند لگا دیا ہے۔ امید ہے کہ نسرین بیگم کی یہ کتاب علمی و ادبی حلقے میں مقبول ہوگی اور اس سے جوش شناسی بالخصوص جوش کے نثری اسلوب کے افہام و تفہیم میں مدد ملے گی۔

تراشیدہ لہجے (چند نمائندہ شعرا)

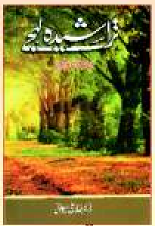

مصنف: ڈاکٹر صابر علی سیوانی
صفحات: 352، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2023
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: امتیاز احمد، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'تراشیدہ لہجے' ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی ساتویں کتاب ہے۔ اس سے قبل موصوف کی چھ کتابیں انوار سخن، سیاق و سباق، دکن میں شعر و ادب، مجتبیٰ حسین کے بہترین کالم، ادب شناسی اور تدوین متن کی روایت آزادی کے بعد ارباب نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ 'تراشیدہ لہجے' ہند و پاک کے معروف و غیر معروف اور حاشیے و گمنامی کے خانے میں دھکیل دیے گئے بیس شعرا کے حالاتِ زندگی کی تفصیلی معلومات پر مشتمل ہے۔ ان بیس شعرا میں ظہیر دہلوی، ریاض خیرآبادی، مضطر خیرآبادی، ثاقب لکھنوی، وحشت کلکتوی، سیماب اکبرآبادی، اختر انصاری، خورشید احمد جامی، جاں نثار اختر، کرپال سنگھ بیدار، فنا نظامی کانپوری، ہلال سیوہاروی، مظہر امام، زیب غوری، شکیب جلالی، ظفر گورکھپوری، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، راحت اندوری اور بشیر بدر کے نام شامل ہیں۔ کتاب کی ابتدا سخن ہائے گفتنی سے ہوتی ہے جس کے تحت مصنف ہمیں ان مذکور شعرا کے تعارفی خاکے سے روبرو کراتے ہیں۔ سخن ہائے گفتنی کی ابتدائی سطور اردو شعر و ادب میں رائج حمایت و مخالفت اور پسند و ناپسند کے رجحان پر قدغن لگاتی ہوئی نظر آتی ہیں جبکہ آخری سطور مذکورہ شعرا کی شخصیت کے اجمالی خد و خال کو اجاگر کرتی ہیں۔

ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے کتاب میں شامل تمام شعرا کے حالات زندگی کا از ابتدا تا انتہا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں ولادت، تعلیم و تعلم، ملازمت و حرفت، اور ادبی خدمات و حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے سماجی و سیاسی منظر نامے کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ شعرا کی تاریخِ پیدائش اور نام و نسب کے سلسلے میں مختلف ادبا کی آرا و نظریات کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ظہیر دہلوی کے حالاتِ زندگی اور ادبی عظمت و وقعت کے بیان پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے ان کی پیدائش، شجرۂ نسب، معاش و معیشت، سماجی و سیاسی پس منظر، سخن وری کی طبع آزمائی کے لیے مختلف استادانِ سخن کے تعاون و مدد کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ بعد ازاں ظہیر دہلوی کی شعری کائنات کے مختلف امتیازات اور خصائص مثلاً مومن کا سا طرزِ سخن، ذوق کا حسنِ بیان، غالب کی

بندشوں اور ترکیبات کی تقلید، نازک ولطیف احساسات کی پیکر تراشی، روزمرہ ومحاورات کا برجستہ استعمال اور الفاظ کے موضوع انتخاب اور برمحل استعمال کا تجزیہ کرنے کے بعد انھیں شعری افق کا تابندہ ستارہ قرار دیا ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون علی حیدر نظم طباطبائی کی شخصیت کے تذکرے پر مشتمل ہے جس میں ان کی شعر گوئی کے کمالات اور خوبیوں سے زیادہ ان کے نظریۂ شعر و شاعری پر توجہ دی گئی ہے۔ نظم طباطبائی کا فطری رجحان نظمیہ شاعری کی طرف تھا اس لیے انھوں نے نظمیہ شاعری میں مرثیہ کو غزل پر فوقیت دی اور یہ کہا کہ مرثیہ گوئی سے بڑھ کر شعر کے لیے کوئی میدان نہیں ہے۔ اس میدان میں جس کا قلم رواں ہے، وہ فطری شاعر ہے۔ مصنف نے نظم طباطبائی کی تصنیف کردہ کتاب 'شرح دیوان اردوئے غالب' کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے اور ایک دو اشعار کی تشریح کے ذکر سے اس کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کیا ہے اور آخر میں ان کی شعری خوبیوں کے تجزیہ و تذکرہ کے بعد انھیں سلطنت سخن کا پاسبان قرار دیا ہے۔

ریاض خیر آبادی کے مضمون میں مصنف نے ان کی شاعری کی خصوصیات اور امتیازات کے تنقیدی جائزہ کے بعد انھیں خمریاتی شاعری کے امام سے تعبیر کیا ہے۔ ریاض خیر آبادی کے شعری سرمایے کے تناظر میں یہ لقب مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے خمریات کے فن اور اس کے جملہ عناصر کو جس قادر الکلامی اور فنی چابکدستی سے نبھایا ہے ایسا بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ریاض کے ذکر کے بعد مضطر خیر آبادی کی شخصیت اور فن کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جس میں ان کے شعری محاسن، ندرتِ بیان اور برجستگیِ الفاظ و تراکیب کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز ان کے مشہور زمانہ شعر۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے، میں وہ ایک مشت غبار ہوں

کے ماخذ پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس غزل کے بقیہ اشعار کے ذکر سے یہ واضح کیا ہے کہ شعر کے اصل خالق مضطر خیر آبادی ہی ہیں۔

ثاقب لکھنوی اور وحشت کلکتوی کے بیانِ زیست میں بھی وہی روش اختیار کی گئی ہے جو سابقہ شعرا کے ذکر میں کی گئی یعنی پیدائش، تعلیم و تدریس، اساتذہ، ملازمت اور سخن گوئی کے محاسن و کمالات کا تفصیلی جائزہ۔ ان کی شعری خوبیوں اور خاصیتوں کے مطالعے کے بعد انھیں بالترتیب کلاسیکی روایت کے سفیر اور سخن طرازی کی دلکش تصویر سے ملقب کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے حالات کو سپردِ قرطاس کے بعد سیماب اکبر آبادی اور اختر انصاری کی شعری کائنات اور جہانِ سخن کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی ادبی عظمت و وقار اور فنی اعتبار و معیار کو مختلف زاویوں اور اقتباسات کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف سیماب اکبر آبادی کے شعری امتیازات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اچھی شاعری وہی شخص کر سکتا ہے جو زبان اور فن شاعری کا مقتدر عالم ہو۔ جسے عروض کے فن سے واقفیت ہو اور جو صنائع بدائع، روزمرہ اور محاورات سے پوری طرح باخبر ہو۔ فارسی زبان کے مبادیات سے کماحقہ آشنائی رکھتا ہو اور تھوڑی بہت عربی زبان کی بھی شد بد ہو۔ اس لحاظ سے اگر سیماب کی علمیت، قابلیت، مہارت اور مختلف زبانوں پر عبور کی بات کی جائے تو وہ ان تمام صفاتِ سخنوری سے اچھی طرح واقف تھے۔''

اختر انصاری کے شعری جہان کی خوبیوں کے تجزیے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

''منفرد اسلوبِ بیان، محاورات کے استعمال، پیکر تراشی، علامت نگاری اور جذباتیت و تخیل سے مملو اختر کی شاعری شعر و سخن کی ثروت مند تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔''

مذکورہ بالا شعرا کے بعد آنے والے تمام شعرا کے حالاتِ زندگی کے بیان اور ان کی شعری کمالات کے اظہار میں مصنف نے وہی ایک مخصوص طریقۂ نگارش اختیار کیا ہے۔ چنانچہ مصنف نے خورشید احمد جامی کے کوائفِ زندگی اور امتیازاتِ سخنوری کے تجزیہ کے بعد انھیں نشاطِ غم کا ترجمان، جاں نثار اختر کی جہانِ شاعری کے مطالعے کے بعد انھیں نغمہ و غزل کا مایہ ناز فنکار، کرپال سنگھ بیدار کی سخنوری کے جائزے کے بعد انھیں قلمروِ شعری کا تاجدار، فنا نظامی کانپوری کی شعر گوئی کی توضیح و تفسیر کے بعد انھیں انسانی اقدار کا پاسدار، ہلال سیوہاروی کے شعری کمالات کی بحث و تمحیص کے بعد انھیں ظریفانہ شاعری کا علمبردار، مظہر امام کی شعری خوبیوں کے انکشاف کے بعد انھیں جدید اردو غزل کا بنیاد گزار، زیب غوری کے سخن کے امتیازی پہلوؤں کے تجزیے کے بعد انھیں عصری شعری حسیت کا عکاس، شکیب جلالی کے شعری افق کی نقاب کشائی کے بعد انھیں ندرتِ شعری کی بہترین مثال، ظفر گورکھپوری کے آسمانِ سخن کے نمایاں ستاروں کے اظہار کے بعد انھیں زندگی کے نازک رشتوں کا نقش گر، فہمیدہ ریاض کے شعری جہاں کی خوبیوں کے تذکرے کے بعد انھیں نسائی شعری روایت کی پیش رو، پروین شاکر کی سخن طرازی کے جمالیاتی عناصر کے ذکر کے بعد انھیں خواب اور خوشبو کی علامت، راحت اندوری کے شعری محاسن کے تجزیے کے بعد انھیں جرأت انکار کا شاعر، سلطان اختر کی شعری کائنات کے مطالعے کے بعد انھیں شہر سخن کا قلندر، بشیر بدر کے شعری امتیازات کے مطالعے کے بعد انھیں عصری شاعری کا بدر کامل اور وسیم بریلوی کے جہانِ شاعری کے تجزیے کے بعد انھیں مشاعروں کی کامیابی کے ضامن جیسے القاب سے تعبیر کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک اچھی اور مفید کتاب ہے کیونکہ اس میں درج کچھ شعرا ایسے ہیں جن پر واقعی بہت کم کام کیا گیا ہے جبکہ کچھ شعرا ایسے ہیں جن پر وافر مقدار میں مواد دستیاب ہے۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل تمام شعرا کے حالاتِ زندگی اور شعری کمالات اور جمالیات کو ایک ہی طرزِ اسلوب کے توسط سے بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کی زبان و بیان سادہ اور عام فہم ہے جبکہ جملوں کی نشست و برخاست بھی مناسب اور واضح ہے۔

مضامین

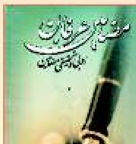

مضامین عرفان

مصنف/ ناشر: محمد عرفان جونپوری

صفحات: 240، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2022

پبلشر: نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

محمد عرفان انصاری کی تلاش و جستجو کا محور و مرکز جونپور کے علمی ادبی آثار، تاریخی اور تہذیبی و تمدنی باقیات ہیں۔ یہ وہی جونپور ہے جسے مدینۃ العلم و العلماء بھی کہا گیا اور شاہجہاں نے اسے 'شیرازِ ہند' کا خطاب یوں دیا کہ ایران میں شیراز بن طہمورث نے ایک ایسا شہر آباد کیا تھا جسے علم و ادب کے اعتبار سے مرکزیت اور مرجعیت حاصل تھی۔ شیراز ہند کی سانسوں میں فنونِ لطیفہ، علوم و ادبیات، مذہبی، اصلاحی تحریکات کی وہ خوشبو بسی ہوئی تھی کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی نابغہ شخصیت کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ

من جونفور اذا هبت رياح رضىً   منها تعطرت الدنيا وما فيها

(جونپور سے جب کوئی اچھی ہوا چلی تو اس سے دنیا اور اس کی ہر شے معطر ہوگئی)

جونپور کے علمی و ادبی افق پر علما، حکما، صوفیا اور شعرا کی اتنی کثرت رہی ہے کہ اس شہر کو

'شمس بازغہ' بھی کہا جاسکتا ہے۔ جونپور کے حوالے سے صرف اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ خاص طور پر جونپور کے شرقیہ آرکی ٹیکچر کے حوالے سے A Fuhrer کی کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر میاں محمد سعید نے کتابیں تحریر کیں اور جونپور کی شرقی سلطنت کے امتیازات اور تفردات پر روشنی ڈالی۔ صفی لکھنوی کی شعری زبان کو نثر میں بدل کر کہیں تو اس کے آثارِ قدیمہ جونپور کی عظمت کے گواہ ہیں۔ دوستوں کو برا نہ لگے تو یہاں اپنے ایک پرانے مضمون 'جونپور کا تخلیقی نور' سے کچھ جملے چرانے کو جی چاہ رہا ہے:

"یہی وہ سرزمین تھی جس کا شہرہ ایران اور عرب تک تھا اور جس کی رعنائی افکار اور لذت اسرار کی روشنی پورے ہندوستان میں تھی۔ مولوی کرامت علی، سخاوت علی، غلام حسین کے افکار سے کتنے شہر روشن ہوئے۔ مہدوی تحریک کا نقطہ آغاز بھی یہی شہر ہے جس کے بانی سید محمد جون پوری تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و ترتیب میں بھی جونپور کے علمانے ہی حصہ لیا تھا اور پہلی جلد مولوی جلال الدین مچھلی شہری نے مرتب کی تھی۔ اسی سرزمین سے فیض حاصل کرنے والے شیر شاہ سوری نے ہندوستان میں اقتدار و اختیار کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔"

محمد عرفان اسی جونپور کے سچے عاشق و شیدا ہیں اور یہاں کی ادبی اور ثقافتی روایت کے امین بھی۔ اسی لیے ان کا ارتکاز جونپور کے آثار و ادبیات پر ہے۔ 'مضامین عرفان' کا بھی غالب حصہ جونپور اور اس کے متعلقات کے حوالے سے ہی ہے۔ 'غالب کا ایک گمنام شاگرد زیدی جونپوری' ان کا ایک اہم اور اکتشافی مضمون ہے۔ انھوں نے سید نورالدین زیدی جونپوری کو تلمیذ غالب ثابت کیا ہے جب کہ تلامذہ غالب میں ان کا ذکر نہیں ملتا اور شاید ماہرین غالبیات کی نظر بھی اس نام پر نہیں پڑی۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب تحقیق میں امکانات کے نئے در کھولنے کی یہ ایک اچھی کاوش ہے۔

'سر شاہ سلیمان کی اردو خدمات' اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ جونپور کے اس عظیم فرزند کا تعلق سائنس اور شعبۂ قانون سے تھا۔ مگر ادب کا ذوق انتہا اعلیٰ اور بلند تھا کہ انھوں نے انتخاب قصائد ذوق، انتخابِ غزلیات ذوق اور مثنویاتِ میر کے عنوان سے کتابیں مرتب کیں اور ترتیب میں تمام اصول و ضوابط کا خیال رکھا۔ اس کے علاوہ وہ شاعر بھی تھے اور ان کا تخلص فدائی تھا۔

سلسلہ جونپور سے ہی 'شرقی دور کے فارسی شعرا کی ہندی نظمیں' کا تعلق ہے۔ اس میں محمد عرفان جونپوری نے ودیاپتی ٹھاکر، مولانا دانیال خضری، شیخ یحییٰ فنائی، سید محمد جونپوری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ برہان الدین کالپوی، پدماوت والے ملک محمد جائسی کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ شعرا تھے جنھوں نے ہندی میں شاعری کی۔ جونپور سے ہی تعلق رکھنے والے صحافی محمد کامل انصاری بی اے جونپوری کی کتاب 'ہماری صحافت' کا بھی انھوں نے بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے اور اس کتاب کے مشمولات اور محتویات کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ 'ایس ایم عباس کچھ یادیں کچھ باتیں' بھی جونپور سے متعلق ہے۔ عباس صاحب نے بھی جونپور کی ادبی اور علمی شخصیات کو اردو دنیا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، خاص طور پر اس حوالے سے وامق جونپوری: شخص و شاعر، جونپور کے چند شعرا (ماضی قریب اور حال کے آئینے میں) قابل ذکر ہیں۔ 'اسیم مچھلی شہری' کے تعلق سے جو مضمون ہے وہ بھی جونپور کی ایک اہم شخصیت سے متعارف کراتا ہے۔ اسیم کا ایک بہت عمدہ شعر ہے:

میرے آنسو بغاوت کر رہے ہیں   میری آنکھوں سے ہجرت کر رہے ہیں

محمد عرفان جونپوری نے بہت سی کتابوں پر تقاریظ تحریر کیے ہیں جن میں سے کچھ کتابوں کا تعلق شیرازِ ہند جونپور سے بھی ہے۔ مختار عاشقی جونپوری کے شعری مجموعہ 'پیانِ قلم' پر انھوں نے تقریظ تحریر کی ہے۔ اسی طرح ایس ایم عباس کی کتاب 'جونپور کے چند شعرا'، حسن جونپوری کے مجموعہ کلام 'خوشبو'، عبرت مچھلی شہری کے شعری مجموعہ 'حرف آرزو'، قاری اشتیاق احمد ضیا جونپوری کے شعری مجموعہ 'ضیائے غزل' پر بھی انھوں نے تقریظ لکھی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان کی تحریر و تنقید کے مرکز میں شہر جونپور ہی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جونپور کی علمی اور ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے بارے میں ابوذر انصاری جونپوری نے کہا ہے:

ہر اک روش پہ کھلتے ہیں شعر و ادب کے پھول   صد رشک لکھنؤ ہے زمیں جونپور کی

دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والی معتبر ادبی شخصیات پر بھی محمد عرفان جونپوری نے مضامین تحریر کیے ہیں جن میں مولانا شوکت علی کی ملی فعالیت، خطوطِ اکبر الہ آبادی میں پردے کا ذکر، محمد خالد عابدی اپنی کتابوں کے آئینے میں، شاکر کریمی کا افسانہ انہونی بات ایک تجزیہ، افسانہ چور پر مور کا تجزیاتی مطالعہ، اثر انصاری کی تصنیفات کا اجمالی جائزہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کتابوں کا اجمالی تعارف کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

جہانِ تبصرہ کے عنوان سے تقریباً 27 کتابوں پر انھوں نے تبصرے تحریر کیے ہیں۔ ان میں مختلف موضوعات سے متعلق اہم کتابیں ہیں۔ یہ تبصرے بھی ان کی تنقیدی بصیرت اور آگہی کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے اختصار کے ساتھ ان کتابوں کے اختصاصات پر روشنی ڈالی ہے۔

'مضامین عرفان' کے علاوہ انھوں نے 'حفیظ جونپوری ارباب ادب کی نظر میں' کتاب تصنیف کی تھی جس کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے ایس ایم عباس، قاری ضیا جونپوری وغیرہ کی کچھ کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو انھوں نے جونپور کے ادبی اور علمی آثار و باقیات سے اردو دنیا کو روشناس کرانے کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ اسے کچھ لوگ علاقائی عصبیت پر محمول کر سکتے ہیں مگر حقیقت میں انھوں نے مٹی کی محبت میں یہ سارے قرض اتارے ہیں اور اس میں کسی دیگر علاقے سے نفرت قطعی شامل نہیں ہے۔

ترتیب

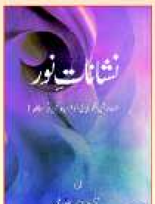

نشاناتِ نور

مصنف: تنویر احمد علوی، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر ثمر جہاں

صفحات: 232، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ڈاکٹر نوید اقبال علوی

مبصر: محمد قمر، D-4/1، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو ادب میں تنویر احمد علوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ تنقید و تحقیق کے میدان میں اس قدر بلند رہے کہ اس دور کے بہت سے ناقدین نے ان کی سرپرستی حاصل کی۔ انھوں نے تنقید و تحقیق کے ساتھ ساتھ شاعری، تاریخ نگاری اور اعلیٰ پائے کے مترجم کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنائی۔ ان کی تقریباً چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو شاعری اور اس میں خاص کر ہندوستان کی صوفیانہ شاعری پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ اسی کڑی میں انھوں نے سنت درشن سنگھ جی کا شاعری کو بھی بڑے ہی غور و فکر سے مطالعہ کیا اور بعد میں اس پر اپنا تجزیاتی مضمون تحریر کر کے 1996 میں ایک کتابی شکل دی لیکن کسی وجہ سے یہ کتاب شائع نہ ہوئی۔ تنویر احمد علوی پر ریسرچ کے دوران ڈاکٹر ثمر جہاں کو یہ مسودہ تنویر احمد علوی کی ذاتی لائبریری سے حاصل ہوا۔ تنویر احمد کے بیٹے ڈاکٹر نوید اقبال کی مدد سے یہ کتاب اشاعت کے مرحلے تک پہنچی۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'نشاناتِ نور' تنویر احمد علوی کی اہم تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت میں ڈاکٹر ثمر جہاں نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا ہے۔ اس کتاب میں سنت درشن

سنگھ جی کے چار شعری مجموعوں، تلاشِ نور، منزلِ نور، متاعِ نور اور جادۂ نور پر تنویر احمد علوی کا تجزیاتی مضمون شامل ہے۔ درشن سنگھ جی کا شمار اس دور کے اہم صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا اصل محور گرونانک جی کی تعلیمات اور دوسرے صوفی سنتوں کے پیغامات کے ہی اردگرد گھومتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں محبت کے پیغام کو انسانی عظمت کی ترقی کا ذریعہ بنایا۔ اس کتاب میں مرتب نے ایک طویل مقدمہ لکھ کر اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقدمے کے بعد تنویر احمد علوی نے تصوف کی روایت اور انسان دوستی کی قدروں پر ایک مفصل مضمون تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے تصوف کو خود سے خدا تک پہنچنے کا ایک روحانی تصور بتایا۔ تصوف ایک مذہبی شعور ہے جہاں انسان اپنے جسمانی بندھنوں سے بھلے ہی آزاد نہ ہو لیکن ذہانت کے سہارے اپنی فکر اور سوچ کا رخ بدل لیتا ہے۔ اس کتاب میں تنویر احمد علوی نے سنت درشن جی مہاراج کے روحانی خیالات کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ درشن جی کی شاعری کے علاوہ تنویر احمد علوی نے تصوف کی مختلف جہتوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کے خیالات پر بھی مدلل بحث کی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'روشنی کی میراث' ہے جس میں سنت درشن جی کی ابتدائی تعلیم اور ان کے روحانی سفر کی تفصیل ہے۔ سنت درشن جی کے والد خود 'روحانی کرپال مشن' کے پیشوا تھے جس کے ذریعے لوگوں میں انسان دوستی اور بھائی چارے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ان کے والد بچپن سے ہی ان کو اپنے گرو پرم سنت ساون سنگھ جی کے روحانی پروگرام میں لے جایا کرتے۔ جہاں سے درشن سنگھ جی کو بھی بزرگوں کی صحبت سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ گرو ساون سنگھ جی کے کہنے پر ہی انھوں نے فارسی ادب کی تعلیم کی طرف قدم بڑھایا اور شاعری کے میدان میں خوب ترقی کرتے رہے۔ انھوں نے صوفیانہ شاعری میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے شعری رموز و نکات کو سمجھا اور اس دور کے مقبول شاعر شمیم کرہانی کی شاگردی اختیار کی۔ ان بزرگوں کی صحبت نے درشن جی کی شخصیت اور شاعری کو مزید ترقی دی۔

کتاب کا تیسرا باب 'تلاشِ نور' ہے جو کہ درشن سنگھ جی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کئی نظمیں شامل ہیں اور ان سبھی نظموں کا تنویر احمد علوی نے تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں پہلی نظم 'گرونانک دیوٗ' ہے جس میں درشن جی نے گرونانک جی کی اخلاقی قدروں اور ان کی تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔ گرونانک کے علاوہ شری کرشن جی کی بانسری کی سریلی آواز کو بھی نظم کے پیرائے میں ڈھالا ہے جو کہ انسان کو اب بھی دکھ تکلیف سے نجات دلانے میں مدد کرتی ہے۔ اسی طرح نظم 'بن باس' میں شری رام چندر کی شخصیت کو بیان کیا ہے۔ درشن جی نے مذہبی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنماؤں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں درشن جی نے ان رہنماؤں کے اخلاقی افکار اور ان کے سیاسی شعور کو سماج کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا چوتھا باب 'منزلِ نور' ہے جو درشن جی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں گرونانک جی کے پانچ سو سالہ یومِ ولادت کے موقع پر نذرانۂ عقیدت کے طور پر لکھی گئی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی شعریات میں درشن جی نے شراب، ساقی، مے خانہ، پیرِ مغاں اور شیشہ و جام جیسی تراکیب کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ یہ شعری تراکیب انھوں نے فارسی اور اردو کے بڑے شاعروں کے کلام کے مطالعے سے حاصل کیے ہیں۔

اسی طرح کتاب کا پانچواں باب 'متاعِ نور' ہے جو کہ درشن جی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں درشن جی کے طالب علمی کے دور میں لکھی ہوئی غزلیں ہیں۔ جس میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی اور ہندی کی بھی غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں کے تجزیے میں تنویر احمد علوی نے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ ان میں رومانیت اور تخیل پسندی کا عکس روایتی شاعری کے زیرِ اثر آیا۔ آگے یہ بھی بتاتے ہیں کہ درشن جی کی غزلوں میں عشقِ مجازی کا رنگ ضرور ہے لیکن درشن سنگھ جی نے اپنے روحانی افکار کی مدد سے اس مجازی رنگ کو عشقِ حقیقی کے رنگ میں بدل دیا ہے۔ یہی ان کی غزلوں کی اہم خوبیاں ہیں۔

کتاب کا آخری باب 'جادۂ نور' ہے جو کہ درشن جی کا آخری شعری مجموعہ بھی ہے۔ اس میں تین حصے ہیں پہلا 'نخانہ مُرشد' جس میں 16 نظمیں ہیں، دوسرا 'سجادۂ نور' ہے اس میں 28 نظمیں اور کچھ قطعات بھی ہیں، تیسرا 'نغمۂ آدم' ہے اس میں 10 نظمیں اور 3 قطعات شامل ہیں۔ ان نظموں کے تجزیے میں تنویر احمد علوی نے تمام پہلوؤں پر اپنی تنقیدی رائے پیش کی ہے۔ اس میں ایک نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' ہے جو کہ درشن جی نے علامہ اقبال کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی۔ اسی طرح درشن جی نے محمدؐ کی مدح میں بھی نظم تحریر کی اور ان کے علاوہ ملک کی دوسری عظیم ہستیوں جیسے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ وغیرہ پر بھی ان کی اہم نظمیں موجود ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تنویر احمد علوی کی ادب کی ساری اصناف پر گہری نظر ہے۔ انھوں نے سنت درشن جی کے صوفیانہ کلام کے تجزیاتی مطالعے میں بلا کی ذہانت کا استعمال کیا ہے۔ تنویر احمد علوی نے درشن جی کی نظموں اور غزلوں کا پہلے بغور مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے دوران علوی صاحب کو درشن جی کی شاعری میں کئی باریک نکتوں نے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ انھوں نے درشن جی کے سبھی شعری مجموعوں کا مطالعہ کر لیا اور اس پر اپنا تجزیاتی مضمون تحریر کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس کتاب کو اشاعت کے مرحلے تک پہنچانے میں تنویر احمد علوی کے صاحبزادے ڈاکٹر تو ید اقبال اور سنت درشن جی کے فرزند جناب راجندر سنگھ جی کا بھی تعاون انھیں حاصل رہا ہے۔ امید ہے کہ اس مادیت پرستی کے دور میں یہ کتاب انسانی عظمت اور احساسِ مروت کے لیے ایک روشنی ثابت ہوگی اور قارئین کو درشن جی کی صوفیانہ شاعری کو ایک نئے پیرایے میں سمجھنے کا موقع ملے گا۔

تتلی پھول سائرہ

مرتب: علامہ عبدالمنان

صفحات: 192، قیمت: 250 روپے

رابطہ: چیمبر 694، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی

مبصر: راشد جمال فاروقی، شاہین باغ، نئی دہلی

مذکورہ کتاب 'تتلی، پھول، سائرہ' کے مرتب عبدالمنان ہیں۔ یہ کتاب 192 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اردو کی شاعرہ، نقاد اور محقق کی علمی و ادبی خدمات کا تجزیہ ہے۔ اس کتاب میں مقالے لکھنے والوں نے سائرہ عظیم کی کتاب 'بند دریچے' کی شاعری کے حوالے سے نئی اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب میں جو قلمکار شامل ہیں، وہ اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

''تتلی پھول سائرہ' ایک انوکھا اور چونکانے والا نام ہے۔ اس میں شامل تمام قلمکاروں نے موقع در موقع سائرہ عظیم کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے۔ فاضل مرتب عبد المنان نے سمینار میں پڑھے جانے والے یا کہیں نہ کہیں رسائل و جرائد میں چھپنے والے ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ علامہ عبدالمنان نے ابتدا میں ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، جو پڑھنے کے لائق ہے۔

یہ ادبی کارنامہ قطعی نادر ہے جس میں اساتذہ کے علاوہ سینئر شعرا و ناقدین اور نئے لکھنے والے لوگوں کے تحریر کیے گئے مقالات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح یقیناً نئی نسل کی آبیاری بھی ہوگی اور مستقبل میں نئے تخلیق کار اور محقق تیار ہوں گے جو آئندہ زمانے میں زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ زبان کی روایت اور اس کی پاسداری کو

زندہ رکھیں گے۔ سائرہ عظیم کی شاعری میں شعریت ہے، غنائیت ہے جو کامیاب غزل کی پہچان ہے۔ انھیں شعوری طور پر یہ ادراک ہے کہ وہ کس طرح کی شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی شعری انفرادیت انھیں اپنے ہمعصروں سے جدا رکھتی ہے۔ آج کا ہر فرد مصروف ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انھوں نے غزل کے اہم عناصر کو بڑی چابک دستی اور فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ عہد حاضر کا ہر فرد جس شکست وریخت سے گزر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے سماج ایک طرح کی آپا دھاپی، کرختگی، پژمردگی، افسردگی اور انتشار و اضطراب کا شکار ہے۔ اس ماحول میں بھی سائرہ عظیم نے خود کو شگفتہ و شاداب رکھا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ وہ ان مسائل سے جوجھ کر بھی اچھے اشعار کہے ہیں۔

سائرہ عظیم کی شاعری پر غور وخوض کیا تو محسوس ہوا کہ ایک اور جنل اور جینوئن شاعرہ دور حاضر کو حسیت کے جام پیش کرنے میں مصروف ہے۔ ان کی سنجیدہ طبیعت نے ان کی شعری نگارشات کو مزید پرکشش بنا دیا ہے۔ ان کے اندر شاعری کا زبردست جذبہ ہے جو انھیں لائق وفائق شاعرہ بناتا ہے۔

ان کی شاعری میں ایک سلیقہ مندی ہے اور شعور بھی۔ اس کتاب میں کل 24 مقالے ہیں اور 6 تبصرے بھی جو ان کے شعری منظر نامے کا دیدار بحسن وخوبی کراتے ہیں۔ ان کے مضامین میں اتنی تہہ داری ہے کہ جتنی باران کا مطالعہ کریں گے اتنا ہی لطف اندوز ہوں گے اور نئے نئے چراغ روشن ہوتے نظر آئیں گے۔ ان کی شاعری میں تخیل بندی کا رجحان غالب ہے۔ وہ میدان شاعری سے باخبر ہیں۔ ان کی غزلوں میں قوس قزح کی رنگا رنگی ہے۔

جب کوئی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمی ضبط تحریر میں آجاتی ہے تو اس کی حرارت اور شدت بڑھ جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا الگ ذائقہ ہے جو شاعرہ کے قاری کے ذہن سے نکل نہیں پاتا۔ سچائی تو یہ ہے کہ کچھ شاعری ادب میں اس طرح کی وجود پذیر ہوتی ہے جو صدیوں تک دلوں کو گرماتی ہے۔ اس کی کیفیت اس کے قاری کو الگ لطف دیتی ہے۔

اردو ادب میں سائرہ عظیم کی شناخت ایک معبر شاعرہ اور محقق کی ہے جو سنجیدگی کے ساتھ اردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کی بنائے ترجیح ان موضوعات پر رکھی ہے جن پر عمومی طور پر توجہ کم دی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں قاری کے کانوں میں بہت دیر تک کوندتی اور گونجتی رہتی ہیں اور اپنی مٹھاس کانوں کے اندر اس طرح گھول دیتی ہیں جن کا لطف ہم بھول نہیں پاتے ان کی لفظیات، ان کی تراکیب، ان کا تخلیقی اظہار اور کی معنویت قاری کے ذہن کے در پر دستک دیتی رہتی ہے یہ بات میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سائرہ عظیم کی شاعری کو جتنی بار پڑھیں گے اتنی ہی بار معنویت کی پرتیں کھلتی چلی جائیں گی۔ کتاب صوری ومعنوی طور پر دلکش و دیدہ زیب ہے۔ میرا یقین ہے کہ اردو دنیا میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

تعلیم و تدریس

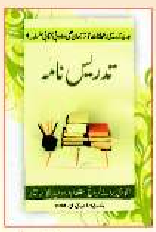

تدریس نامہ (کتابی سلسلہ 9)

مدیر: پروفیسر شہزاد انجم

صفحات: 320، سنہ اشاعت: مارچ 2023

ناشر: اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مبصر: آفتاب احمد منیری، سید عابد حسین، سینیر سیکنڈری اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یہ بات متفق علیہ ہے کہ ہماری دنیا میں جتنے بھی انسانی پیشے موجود ہیں، ان میں سب سے باوقار اور محترم پیشہ تدریس ہے۔ اس پیشے کی غیر معمولی اہمیت کا بنیادی سبب وہ اعلیٰ ترین انسانی قدریں ہیں جنھیں ایک معلم نہایت غیر محسوس طور پر اپنے طالب علموں میں منتقل کرتا ہے۔ اس تعمیری عمل کے نتیجہ میں ایک صالح معاشرہ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ آج کے مادی دور میں جہاں پر چہار جانب پروفیشنل تعلیم (Educational Profession) کا غلبہ ہے۔ ایسے وقت میں علم کے اخلاقی پہلوؤں کی اہمیت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ تمام ادارے قابل مبارک باد ہیں جو مسلسل درس وتدریس کے اغراض ومقاصد سے موجودہ نسل کو روشناس کرانے کی مستحسن کوشش کر رہے ہیں۔ اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شمار انھیں ممتاز اداروں میں ہوتا ہے جو اپنے قیام کے پہلے دن سے اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ تعلیم کے اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں کو عام کیا جائے۔ ادارہ کا سالانہ کتابی سلسلہ 'تدریس نامہ' اس سنجیدہ علمی کاوش کا ثمرہ ہے۔

'تدریس نامہ' کے تازہ ترین شمارہ کو اس لحاظ سے یادگار کہا جا سکتا ہے کہ اس شمارہ میں اردو زبان وادب کے مختلف اصناف کی تدریس سے متعلق مقالات علمی شامل ہیں۔

علاوہ ازیں ملک کے مشہور، ماہرین تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ علام السیدین کی بیش قیمتی تحریریں بھی 'تدریس نامہ' کے صفحات کی زینت بنی رہیں۔ مادر علمی جامعہ کے بنیاد گزاروں میں شامل ڈاکٹر ذاکر حسین کے علمی خطبات کو رسالے میں شامل کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے ادارہ کے ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم لکھتے ہیں:

''جب یہ رسالہ تیار ہو رہا تھا تو میری خواہش ہوئی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے تین ریڈیائی خطبات 'بچوں کی تربیت' اور خواجہ غلام السیدین کا مضمون 'معلم کی شخصیت' کو ضرور شامل کیا جائے۔ جن کے مطالعہ سے اساتذہ کو خاص روشنی ملے گی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا خیال تھا کہ ''نہ ضرورت سے زیادہ تعریف بچوں کے لیے اچھی نہ بے جا مذمت ہے، نہ اتنا گرایئے کہ قدم میں نہ اٹھا سکے نہ اتنا چڑھایئے کہ زمین پر قدم نہ رکھے... بچے کو خدا کا بندہ سمجھیے، نہ وہ آپ کی ملک ہے نہ آپ کا کھلونا، آپ کے پاس خدا اور انسانیت کی امانت ہے۔'' (ص 8)

تعلیمی وتدریسی مضامین کے علاوہ معروف فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید کا افسانہ 'سائے' بھی اس مجلہ میں شامل ہے۔ اس رسالے کو تخلیقی رنگ دیتے ہوئے فاضل مدیر نے ادبی دنیا کے ممتاز شعرا کی تخلیقات کو بھی شامل کیا ہے۔ تخلیقی گوشے میں جن شعرا کی تخلیقات شامل ہیں ان میں سے عتیق اللہ، شین کاف نظام، رؤف خیر، نعمان شوق، اظہر عنایتی، شہپر رسول، شہاب الدین ثاقب، خورشید اکبر، عالم خورشید، سرور ساجد، معید رشیدی، خان محمد رضوان اور سالم سلیم کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کی نثری وشعری اصناف کی تدریس کے سیاق میں جن علمائے ادب کی تحریریں تدریس نامہ کے اس خصوصی شمارہ میں شامل ہیں ان میں پروفیسر خالد محمود، شہناز انجم، محمد نعمان خان، سہیل احمد فاروقی، قمر الہدی فریدی، احمد محفوظ، کوثر مظہری، واحد نظیر، حنا آفرین اور خالد مبشر کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ سبھی تحریریں اردو زبان وادب کی تدریس کے ذیل میں چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصناف ادب کی تدریس کے رہنما اصولوں سے قاری کو متعارف کراتی یہ علمی تحریریں اس لیے بھی قابل قدر ہیں کہ ان کی مدد سے اردو کے نوعمر اساتذہ تدریس کے رہنما اصول سیکھ کر قوم کے نونہالوں کی مثالی تربیت کر سکتے ہیں۔

رسالہ کے مدیر پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے اداریے میں جن دو عبقری شخصیات کا ذکر کیا ہے ان کے مقالاتِ علمی اس قدر اہم ہیں کہ ان کا مختصراً ذکر کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے تین ریڈیائی خطبات بعنوان 'بچوں کی تربیت' کے ساتھ اس

مجلّہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان علمی خطبات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے اسرار کو منکشف کر دیا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے مقناطیسی طرزِ تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''اس ننھی سی جان کو دنیا میں خدا کے خلیفہ کے رتبے تک پہنچانے میں اس کے ماں باپ رشتہ دار اور ساری اردگرد کی انسانی دنیا کو بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور اکثر اسی حصے میں کسر ہو جاتی ہے اور آدمی کے سپرد اپنے بچوں کی تربیت کا جو کام ہے اس میں وہ ایسی ایسی حماقتیں کو گزرتا ہے کہ اکثر قدرت کا منشا پورا نہیں ہو پاتا۔'' (ص 13)

خواجہ غلام السیدین کا شمار بھی اپنے وقت کے ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک اہم تحریر 'معلم کی شخصیت' منصبِ تدریس کے تقاضوں سے روشناس کراتی ہے۔

سیدین صاحب کا یہ ماننا تھا کہ معلم کی شخصیت نظامِ تعلیم کی بنیادی اکائی ہے۔ لہٰذا ایک معلم کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ فطرت اطفال اور نظامِ تمدن دونوں سے واقفیت رکھے۔

تعلیم اور تدریس سے متعلق اس یادگار مجلّہ کی اشاعت کے لیے میں اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم اور ان کی پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

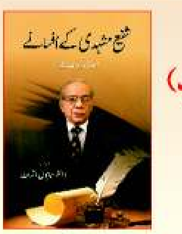

فکشن

شفیع مشہدی کے افسانے (تعارف و انتخاب)

مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف

صفحات 276، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: ڈاکٹر نسیم اختر، پٹنہ سٹی

'شفیع مشہدی کے افسانے (تعارف و انتخاب)' اپنے طرز کا ایک منفرد اور بیش قیمت افسانوی مجموعہ ہے۔ تیس افسانوں کے اس انتخاب، ترتیب اور پیش کش میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے جس کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے وہ کسی افسانوی انتخاب کی روشِ عام سے بالکل علیحدہ اور قابلِ داد ہے۔ شفیع مشہدی کے افسانوں سے پہلے کے چار عناوین ہماری خصوصی دلچسپی اور توجہ کا مرکز ہیں جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے: شفیع نامہ، میں اور میرے افسانے، شفیع مشہدی سے ایک ادبی گفتگو، کچھ ان کہانیوں کے بارے میں۔

پہلا عنوان: 'شفیع نامہ' شفیع مشہدی کے سوانحی احوال و ادبی کوائف کا ایسا خوبصورت منظر نامہ ہے جس میں ان کی پیدائش، خاندان اور تعلیم سے لے کر شادی، سرکاری و اعزازی عہدے، علمی، ادبی و فلاحی سرگرمیاں بیان کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس خاکے میں کچھ ایسا دل کش رنگ بھرا ہے اور اس قدر ربط و تسلسل پیدا کیا ہے جس سے ہماری نگاہوں کے سامنے شفیع مشہدی کی ایسی چلتی پھرتی تصویر ابھرتی ہے جس میں ان کے تابناک ماضی کی داستان بھی ہے اور حال کے فتوحات کا خوب صورت ذکر بھی۔

دوسرا عنوان: 'میں اور میرے افسانے' خود شفیع مشہدی کا رقم کردہ ہے۔ ڈھائی صفحے کی اس مختصر سی تحریر میں ایسی بلا کی تاثیر ہے جو ہمارے آتشِ شوق کو اس قدر بڑھاتی ہے کہ ہم شفیع مشہدی سے مانوس اور ہم آہنگ ہوتے ہوئے ایک ایک جملے کو بغور پڑھتے ہوئے کب خاتمے پر آجاتے ہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور پھر شفیع مشہدی کے اقتباسات ذہن کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیے افہام و تفہیم کے کئی دریچے کھول دیتے ہیں:

''میرا گھر ترقی پسند تحریک اور بائیں بازو کے ہم نواؤں کا مرکز تھا۔ اس لیے اس کا اثر قبول کرنا لازمی تھا۔ صوفیوں کی تمام تر کہانیوں اور ان کے زریں اصولوں کے درمیان میرا بچپن پروان چڑھا۔ آج بھی تمام تر دنیاداری اور سماجی ذمے داریوں کی ادائیگی میں تصوف ہمیشہ مشعلِ راہ رہا ہے۔'' (ص 13)

اب وہ سوالات جو اکثر ان کے افسانوں سے متعلق بڑی شدومد سے اٹھائے جاتے ہیں 'آپ لکھتے کیوں ہیں؟' اس کا جواب شفیع مشہدی نے بڑے معصومانہ انداز میں یوں دیا ہے:

''کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ آپ پانی کیوں پیتے ہیں۔ اس کا جواب سیدھا سا ہوگا کہ پیاس لگتی ہے، اس لیے پیتے ہیں۔ اگر مزید سوال کیا جائے کہ آپ کو پیاس کیوں لگتی ہے تو جواب دینا ذرا مشکل ہوگا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ادب کے ساتھ بھی ہے۔ ایک پیاس ہے، ایک تڑپ ہے، ایک اضطراب ہے جس کی تسکین کے لیے ہم لکھتے ہیں۔'' (ص 12,13)

ایک اور سوال جو اس کتاب کے فلیپ پر درج تحریر میں پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اٹھایا ہے کہ ''چند افسانوں میں وہ خاصے ناسٹلجک بھی دکھائی دیتے ہیں''۔

شفیع مشہدی نے اسے بخوشی تسلیم کرتے ہوئے اس کا جو جواب دیا ہے وہ ہماری نگاہوں کو خیرہ کرنے کے ساتھ ماضی کے تئیں دل میں ایک قابلِ قدر جگہ پیدا کرتی ہے:

''مجھے یہ الزام بخوشی منظور ہے۔ ناسٹلجیا تو میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ماضی پرست ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ماضی سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم ماضی میں جی نہیں سکتے مگر ماضی کے بغیر بھی جی نہیں سکتے۔'' (ص 14)

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے شفیع مشہدی سے لیے گئے اپنے ایک ادبی انٹرویو کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ تقریباً چوالیس پینتالیس سوالات پر مشتمل بالمشافہ ادبی انٹرویو ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے دامن میں بے پناہ معلومات اور انکشافات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس انٹرویو کے مطالعے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ شفیع مشہدی افسانہ نگاری سے پہلے وادیٔ سخن میں قدم رکھ چکے تھے اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ ان کی کہانیاں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر وغیرہ کے ساتھ ماہنامہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہونے لگیں۔ اس انٹرویو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے افسانے ترجمہ ہو کر ہندی، انگریزی، تلگو اور پنجابی زبانوں کی زینت بنتے رہے۔ جبکہ ان کے ڈرامے 'مٹھی بھر خاک' پر سری نگر دوردرشن نے 90 منٹ کی ٹیلی فلم بنائی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے اور بعض رانچی دوردرشن سے نشر ہوئے۔ میرے خیال میں شفیع شناسی کے باب میں اس انٹرویو کی حیثیت مستقل ایک کتاب جیسی ہے جو س.ش. مشہدی سے شفیع مشہدی تک کے ایک خوش گوار علمی، ادبی و افسانوی سفر کی روداد ہے۔

تین مختلف عنوانات میں ایک پوری فضا بندی اور ماحول آفرینی کے بعد ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے شفیع مشہدی کے افسانوں پر اپنا ایک تفصیلی مطالعہ 'کچھ ان کہانیوں کے بارے میں' پیش کیا ہے جسے ہم اس کتاب کا مقدمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے شفیع مشہدی کے تیس انتہائی کامیاب، نمائندہ اور منتخب افسانوں کو پیشِ نظر کتاب کی زینت بنایا ہے جن میں کرچیاں، شونار ہرین، جھاگ، سینچر شاہ، بنت زلیخا، سبکدوش، جھینی جھینی رے چدریا، سید کی حویلی، گرتی دیواریں جیسے شاہکار افسانے شامل ہیں۔ داد و تحسین کے مستحق ہیں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کہ انھوں نے اس انتخاب میں صرف تیس افسانوں کو ہی نہیں جمع کیا ہے بلکہ ایک ایک افسانے پر ایسی اچھی اور باریک نظر ڈالی ہے کہ اس سے شفیع مشہدی کے افسانوں کی ہیئت، ان کی خوبیاں، ان کی فنی ہنرمندی، ان کے کرداروں کی نفسیاتی بصیرت، ان کا سماجی سروکار اور عصری حسیت، ان کے عہد کی ترقی و تنزل، اسلوب بیان پر دسترس، غرض ساری چیزیں پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور تمام تصویریں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔ یعنی شفیع مشہدی کی بھی

اور ان کے افسانوں کی بھی۔ اس نچوڑ کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ واقعی شفیع مشہدی اپنے وقت کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے سے ایک شوق، ایک جذبہ اور انہماک پیدا ہوتا ہے اور جب ہم اسے پڑھتے ہیں تو پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جو ظاہری طور پر بھی بہت جاذب نظر ہے، اس کی ترتیب و اشاعت پر مرتب ڈاکٹر ہمایوں اشرف مبارک باد کے مستحق ہیں، جس انداز میں انھوں نے اس انتخاب کو جامعیت و وسعت بخشی ہے وہ قابل تقلید ہے۔

انٹرویوز

باتیں رنگ رنگ

مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 200، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

مبصر: ایس ایم حسینی، ندوہ کیمپس، ڈالی گنج، لکھنؤ

ڈاکٹر غضنفر اقبال کا تعلق گلبرگہ سے ہے اور اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، حال ہی میں برصغیر ہندوپاک کے مشاہیر کے انٹرویوز پر مشتمل 'باتیں رنگ رنگ' شائع ہوئی ہے، کتاب تین ابواب میں منقسم ہے فکشن، سخن، تحقیق وتنقید، صاحب کتاب نے ترتیب کا ایک خاص خیال رکھا ہے جو ان کی ادبیت نوازی کا غماز ہے، چونکہ ان تین مراحل سے ہی قاری کی تسکین ہوتی ہے اور شعور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

پہلے باب 'رنگ فکشن' میں سات انٹرویوز شامل ہیں، اس سے قبل غضنفر اقبال نے رنگوں سے پہلے کے عنوان سے انٹرویو کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''انٹرویو ایک فن جمیل ہے اور وہ ایک خود مکتفی ادب پارہ ہے۔''

رشید امجد کے انٹرویو میں افسانہ کی تعریف، ارتقا اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کو موضوع بناتے ہوئے پاکستان کے سیاسی وفکری پس منظر میں افسانہ کے خدوخال پر گفتگو کی ہے، سماجی ومعاشرتی سطح پر جدید افسانہ کے رجحان اور اس کی ابتدا میں کیا وجوہات رہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔

دوسرا انٹرویو مغربی بنگال کے افسانہ نگار فیروز عابد کا ہے جس میں تخلیقی محرکات اور ان کے افسانوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے، موجودہ زمانے میں افسانے کی صورت حال کیا ہے اور افسانے میں کن موضوعات کو جگہ نہیں دی گئی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی نے اپنے انٹرویو میں جوگیندر پال سے ذاتی تعلقات اور ان کے فکر وفن پر روشنی ڈالتے ہوئے پال کے فکشن کو زندگی کا رمزنامہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح مشہور فکشن نگار نورالحسنین نے اورنگ آباد کی ادبی فضا اور معاصر افسانہ نگاروں پر اظہار خیال کیا ہے، کہانی اور افسانہ کا فرق واضح کرتے ہوئے افسانہ میں تصوف کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری کا انٹرویو افسانے کی روایت اور تنقید پر ہے جس میں ان کی ادبی کاوشوں کا مفصل ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کے انٹرویو میں تصوف، عشق، فن اور زندگی جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، صحافت، ظرافت اور ادب اطفال کو بھی انٹرویو کا حصہ بنایا گیا ہے، صاحب انٹرویو نے مختلف اہل قلم کی خدمات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے افسانہ کو پیغام اور حقیقت پسندی کا دوسرا نام کہا ہے۔ اس باب میں مصنف نے افسانچہ کو اہمیت دی ہے اور تمام صاحب انٹرویوز کے خیالات جاننے کی کوشش کی ہے، مصنف نے انٹرویو شروع کرنے سے قبل صاحب انٹرویو کا تعارف اور ان کی ادبی خدمات کا مختصر ذکر کیا ہے، پورے انٹرویو کے لب لباب کو عنوان بنایا ہے۔

رنگ سخن کے تحت نو ادبا وشعرا میں پہلا انٹرویو ڈاکٹر مدحت الاختر کا ہے جس میں فن شعر پر گفتگو کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ معاصر شعرا کو ٹھہر کر اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کے بقول غزل ایک دھڑکتی ہوئی صنف سخن ہے، انٹرویو میں اردو نظم کی تشکیل پر بات کرتے ہوئے غزل اور نظم پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، حیدرآباد کے معتبر شاعر ڈاکٹر رؤف خیر نے 'یک مصرعی نظم' سے متعلق کلام کیا ہے اور شعری اصناف میں نئے تجربات کو ضروری قرار دیا ہے ''میں نے ایک نئی صنف سخن 'یک مصرعی نظم' کی بنیاد ڈالی ہے، یعنی صرف ایک ہی مصرعے میں ایک نظم۔''

آگے کہتے ہیں: ''اس صنف کا میں ہی موجد اور میں ہی خاتم ہوں، افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی ویسی پذیرائی نہ ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔''

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر شائستہ یوسف اور ڈاکٹر رعنا حیدری کے انٹرویوز نسائی شاعری اور تانیثیت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں، جس میں اورنگ آباد کی دیگر شاعرات وحیدہ نسیم، شفیق فاطمہ شعری اور کنیز فاطمہ وغیرہ کی شاعری سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

اس باب میں تمام شعرا سے ان کا خاندانی پس منظر، شعری ذوق کیسے پروان چڑھا اور کیونکر شاعری کی طرف راغب ہوئے اور زندگی کا کوئی اہم واقعہ جیسے سوالات یکساں ہیں۔

رنگ تحقیق وتنقید آخری حصہ ہے جس میں پروفیسر ناصر عباس نیر، پروفیسر مرزا سعید، اسلم مرزا، پروفیسر آفتاب احمد صدیقی اور ڈاکٹر انیس صدیقی کے انٹرویوز شامل ہیں، پاکستان میں تنقید کی صورت حال، فکشن تنقید اور تنقیدی مزاج پر عباس رضا نیر نے مفصل جوابات دیے ہیں۔ 'قطب مشتری تحسین وتخمین' کے مدون پروفیسر م ن سعید نے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اردو کا اولین نثر نگار تو در کنار، اردو کا نثر نگار ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اس کے دلائل بھی پیش کیے ہیں، دکنی زبان وادب سے متعلق آپ کی گفتگو معنی خیز ہے، ڈاکٹر انیس صدیقی نے اپنے انٹرویو میں تحقیق کے لوازمات اور اس کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اشاریہ سازی پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

آخری حصے میں دکنی شعرا، ادبا، محققین اور ان کی ادبی خدمات سے روشناس کراتے ہوئے اصناف ادب سے متعلق رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں تحقیق اور جامعاتی تحقیق کا زوال، تعلیمی صورت حال اور اساتذہ کی ذمے داری کیا ہونی چاہیے جیسے سوالات پر بھی خاص توجہ ہے۔

کتاب کی عمدہ طباعت اور رنگارنگا سرورق کشش کا باعث ہے، 'باتیں رنگ رنگ' میں دکنی شعرا وادبا سے متعلق خاصی معلومات انٹرویو کی شکل میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے پیش کی ہیں، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شاعری

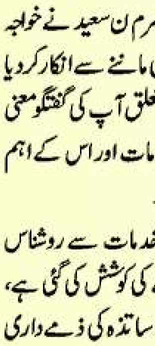

کلیاتِ دل

مصنف: دل تاج محلی، مرتب: ڈاکٹر شعیب رضا خان

صفحات: 591، قیمت: 700 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مبصر: ڈاکٹر سعدیہ سلیم

شعبۂ اردو سینٹ جانس کالج، آگرہ، یوپی

اردو شاعری کا سفر کئی صدیوں سے جاری ہے اور اس زبان نے کئی عالمگیر شعرا کو جنم دیا ہے۔ بہت سے شعرا نے اردو کے تہذیبی وثقافتی منظرنامے پر ایسے نقوش

چھوڑے ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کے ان بڑے ادیبوں میں بلاشبہ دل تاج محلی کا شمار بھی کیا جانا چاہیے جن کی تخلیقات آج بھی قارئین کو مسحور کر دیتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کو ڈاکٹر شعیب رضا خان صاحب (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، NIOS، گورنمنٹ آف انڈیا) نے بڑی محنت سے ترتیب دیکر کلیات دل کی شکل میں قارئین کے لیے پیش کر دیا ہے۔ اس کلیات میں نثر و نظم کے ساتھ ساتھ دل کے تعلق سے علمائے ادب کی آرا کو بھی پیش کر دیا گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے دل تاج محلی کس پائے کے شاعر ہیں۔ کتاب کا انتساب مشہور عالم اور اسکالر (پدم شری) پروفیسر اختر الواسع صاحب کے نام کیا گیا ہے۔

حصہ نثر 250 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں 41 مضامین ہیں جن میں افسانے، انٹرویو، ڈرامہ اور مقالہ، سب کچھ ایک ہی ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ ساری نثری اصناف کو ایک ساتھ پیش کر دینے سے یہ دقت آ گئی ہے کہ صرف عنوان پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ کون سی تحریر کس صنف سے متعلق ہے۔ یہاں ان تمام کا جائزہ تو پیش نہیں کیا جا سکتا اس لیے صرف عمومی تبصرے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ دل تاج محلی کا ایک انٹرویو اس کتاب میں شامل ہے جس سے ان کے ادبی سروکار کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ محترم دل صاحب ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے قلب کی تسکین اور معاشرے کی اصلاح کی خاطر لکھتے ہیں۔ اسی طرح اپنے افسانوں اور مضامین میں عورتوں کو مرکزی کردار بنانے کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ:

''اس لیے کہ عورت ہمارے معاشرے کی معمار ہے، ماں بیٹی اور بیوی بن کر وہ قربانیاں دیتی ہے اور اپنی ذمے داریوں کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھاتی ہے جو مرد پوری کر ہی نہیں سکتا۔'' (کلیات دل، ص:9)

کتاب میں شامل پہلا افسانہ 'دیدار تاج' ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے شاہ جہاں اور ممتاز محل کو بطور استعارہ استعمال کر کے کچھ اہم مسائل کی جانب توجہ دلائی ہے۔ افسانہ کے بعد ان کا مقالہ 'تاج محل......؟' شامل ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے تاج محل کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے اور کئی اہم معلومات فراہم کی ہیں جن سے عام زائرینِ تاج محل واقف نہیں ہوں گے۔ تاج محل کی خوبصورتی کا مکمل لطف لینے کے لیے یہ مضمون بہت اہم ہے۔ سیماب کی زبانی وہ کہتے ہیں کہ ؎

کیا متاعِ دو جہاں سے یہ گراں نعمت نہیں
پوچھتا ہوں میں کہ یہ کیا ہے اگر جنت نہیں

کتاب کا اگلا مضمون 'تاج محل، مجاز و حقیقت' ہے جس میں وہ تاج محل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ تاج محل کے دور تعمیر کا ایک فسانہ یوں مقبول ہے کہ بہت سے لوگ اسے سچ بھی سمجھتے ہیں کہ شاہجہاں نے تاج محل بنانے والوں کے ہاتھ کٹوا دیے تھے، جناب دل تاج محلی نے اس واقعہ کو بالکل غلط اور بے بنیاد بتایا ہے۔ لیکن دل تاج محلی نے ایک تاریخ سے ثابت حقیقت سے صرف نظر کرتے ہوئے شاہجہاں سے متعلق یہ لکھ دیا ہے کہ انہوں نے اپنی مرضی سے خود کو قلعہ بند کر لیا تھا۔ تاریخ کی تمام کتابیں اس پر شاہد ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے والد شاہجہاں کو قلعہ بند کر دیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ انہیں دوران نظر بندی کچھ مراعات حاصل رہیں۔ دل صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تاج محل دیکھنے آنے والوں کو سیاح کے بجائے زائرین کہنا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ حصہ نثر میں 41 عناوین کے تحت افسانے، مضامین، مقالے غرضیکہ ہر قسم کی تحریریں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں کفارہ، ایک بھول، ماں مرے موسی جیسے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دل تاج محلی کا اسلوب نثر افسانے اور مضمون و مقالہ میں زیادہ تبدیل نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے ان کے مضامین اور مقالے بھی خشک معلوم نہیں ہوتے اور نہ قاری پر گراں گزرتے ہیں۔ آپ ان کی کتاب کو اگر ایک بار پڑھنا شروع کر دیں تو پھر درمیان سے چھوڑنا ناممکن سا ہو جاتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خاصیت ہے۔ یہ خاصیت جس ادیب کی کتاب میں پیدا ہو جائے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آگرہ اور تاج محل سے محبت ان کی اکثر تحریروں میں صاف دکھائی دیتی ہے، اصلاح کا پہلو ان کے افسانوں اور مضامین ہر جگہ حاوی نظر آتا ہے۔

حصہ نثر کا ایک اہم مضمون 'تنقید یا تنقیص' ہے جس میں انھوں نے اہل قلم کو نصیحت کی ہے جو تنقید کے بجائے اکابر کی تنقیص کرتے ہیں۔ یہ مضمون بہت ضروری ہے اور ہر دور میں ان کی یہ نصیحت نقادوں کے کام آئے گی۔ نظیر اکبر آبادی پر دل نے عمدہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ نظیر پر ایک مضمون کے علاوہ ان کا ایک مختصر مقالہ بھی کتاب میں شامل ہے جو خصوصی طور پر مطالعہ کے لائق ہے۔ دل کا تعلق چونکہ آگرہ سے ہے اس لیے وہ اپنے شہر کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اپنے مضمون 'دار الادب، اکبر آباد' میں انھوں نے اکبر آباد کے کچھ مشہور شعرا کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں اپنے تعلق سے بھی بتاتے ہیں کہ وہ 56 سالوں سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اب تک ان کی 5 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ یہ مضمون مختصر مگر کارآمد ہے۔ اسی کے ساتھ حصہ نثر ختم ہوتا ہے۔

حصہ نظم میں بالترتیب حمد، نعت، غزلیات، متفرقات اور قطعات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ عید پر لکھے گئے قطعات، منقبت اور سلام ہیں۔ آخر میں کچھ موضوعاتی نظمیں ہیں جن میں میاں نظیر اکبر آبادی، جمہوریت، 26 جنوری، تو اور میں، عوام اور نظیر، عید اور مساوات وغیرہ ہیں۔ سب سے آخر میں کچھ دوہے موجود ہیں۔ شاعری کی یہ ترتیب روایتی اور کلاسیکی ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں منقبت اور سلام کو غزلیات سے پہلے رکھا جا سکتا تھا۔ حمد اور نعت سے پہلے ان کی بحر لکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جو کہ ایک نئی شئی ہے اور اس سے شاعری کے طلبا کو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ دل تاج محلی کے حمدیہ اشعار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قاری کے دل پر ایک ہی قرات میں اثر کر جاتے ہیں۔

دل تاج محلی کی شاعری انسانی تجربے کی شاعری ہے۔ اس میں جذبے کی گہرائی ہے، ان کی غزلیہ شاعری خالص احساسات کی شاعری ہے جس میں پیچیدگی نہیں خوبصورتی ہے۔ ان کا کلام قاری کے ذہنی کینوس پر بہترین تصاویر بناتا ہے اور ان سے بے شمار احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ دل تاج محلی کی غزلیہ شاعری کی اہم خصوصیت کلاسیکی اور جدید عناصر کے درمیان ہم آہنگ توازن قائم کرنے کی صلاحیت ہے۔ زبان پر ان کی گرفت، روایتی لب و لہجے کو برتنے کی صلاحیت انہیں منفرد بناتی ہے۔

غزلوں کے علاوہ کچھ متفرق اشعار، منقبت، سلام اور قطعات ان کی کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے بعد کتاب میں دل تاج محلی کے تعلق سے بعض ادیبوں کے خیالات و مضامین ہیں۔ سب سے آخر میں ان کی تصاویر دی گئی ہیں۔ منجملہ طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دل تاج محلی کی یہ کلیات ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جسے اردو کے قارئین کو لازمی پڑھنا چاہیے، نقادوں کو اس کی جانب نظر کرنی چاہیے اور ان کی شخصیت و شاعری کو ریسرچ کا موضوع بھی بنانا چاہیے۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

'اے پی جے عبدالکلام کے سماجی و سائنسی افکار' پر مسابقۂ مضمون نویسی میں کامیاب طلبہ و طالبات کے مابین تقسیمِ انعام کی تقریب

نئی دھلی : مذہب آپس میں پیار کرنا سکھاتا ہے اور وطن سے محبت ہمیں ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے جذبہ سے ہم کنار کرتی ہے، ہمارے سابق صدر جمہوریہ بھارت رتن اے پی جے عبدالکلام کی زندگی کا یہی ماحصل ہے۔ ان خیالات کا اظہار آر ایس ایس لیڈر اور مسلم راشٹریہ منچ کے سربراہ ڈاکٹر اندریش کمار نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے منعقدہ پروگرام میں بطور مہمان خصوصی خطاب کے دوران کیا۔ یہ پروگرام 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے سماجی و سائنسی افکار' کے عنوان سے مسابقۂ مضمون نگاری میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کے

درمیان تقسیمِ انعامات کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وطن سے محبت اور وطن کی خدمت ہی اے پی جے عبدالکلام کی زندگی کا سبق ہے اور اگر ہم ان کی شخصیت کو سمجھنا چاہیں تو یہی چیز کارگر ثابت ہوگی۔ اندریش کمار نے کہا کہ اس ملک کو انھی جیسی شخصیات کی ضرورت ہے جو اپنے علم اور کردار سے ملک کی خدمت کرنے والی ہوں، اس لیے جو بچے اے پی جے عبدالکلام سے منسوب اس مقابلہ مضمون نویسی میں کامیاب ہوئے ہیں انھیں میں مبارکباد پیش کرتا ہوں، ساتھ ہی میری یہ توقع ہے کہ وہ انھیں اپنا ماڈل بنائیں گے اور انھی کی طرح ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

قبل ازاں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل نے مہمان خصوصی ڈاکٹر اندریش کمار کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اندریش کمار جی مسلم راشٹریہ منچ کے سربراہ ہیں اور مسلمانوں میں سماجی بیداری لانے اور ان کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کر رہے ہیں۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست پر اس پروگرام میں تشریف لائے جس کے لیے ہم تہہ دل سے آپ کے شکرگزار ہیں۔ انھوں نے پروگرام کے مہمان اعزازی پروفیسر شاہد اختر سابق وائس چیئرمین قومی اردو کونسل و رکن کمیشن فار مائناریٹی انسٹی ٹیوشنز کا بھی تہہ دل سے استقبال کیا اور کہا کہ شاہد صاحب کونسل کے جب وائس چیئرمین تھے تب بھی اور اب بھی اردو زبان کے فروغ کے تئیں فکر مند رہتے ہیں اور جب بھی ضرورت پڑتی ہے ہمارا تعاون کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مسابقۂ مضمون نویسی میں کامیاب ہونے والے بچوں اور ان

کے والدین واساتذہ کا بھی خیر مقدم کیا اور کہا کہ سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں، مگر ان کی عظمت کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ سادگی و ایمانداری میں بے مثال تھے جس کے بے شمار واقعات ان کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں میں موجود ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی کے شعبے میں انھوں جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھی کی وجہ سے آج ہندوستان دفاعی شعبے میں غیر معمولی طاقت ور ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہمان خصوصی ڈاکٹر اندریش کمار کو گلدستہ پیش کیا، جبکہ پروفیسر شاہد اختر کو کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے گلدستہ پیش کیا۔

مہمان اعزازی پروفیسر شاہد اختر نے اپنے خطاب میں کہا کہ قومی اردو کونسل پروفیسر شیخ عقیل احمد کی سربراہی میں اردو کے فروغ کے لیے قابل تعریف کام کر رہی ہے۔ آج کا پروگرام سابق صدر جمہوریہ ہند کے حوالے سے ہے جن کی شخصیت ہمارے لیے، خصوصا طالب علموں کے لیے بے مثال نمونہ ہے۔ ان کی سادگی، ان کا علم، ان کا اخلاق اور قوم وملک کے تئیں ان کی غیر معمولی وابستگی ہمارے لیے قابل قدر ہے۔ جو بچے اس مسابقے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، آئندہ آپ کو ان کی زندگی کا مطالعہ مزید گہرائی سے کرنا ہے اور اپنے آپ کو انھیں کی طرح قوم وملک کی خدمت کے لیے تیار کرنا ہے۔ انھوں نے اندریش کمار کے سماجی پیغام کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ پورے ملک کو انتہا پسندی اور تشدد سے پاک کرنے اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

اس موقعے پر مضمون نویسی کے مسابقے میں کامیاب ہونے والے طلبہ وطالبات کو گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔ محمد عطاء اللہ (کیرلا)، سفینہ کوثر (پونے)، طہٰ خان (جلگاؤں)، امیمہ عمر امیر کر (رائے گڑھ) ہزار ہزار روپے کے تشجیعی انعام اور توصیفی اسناد سے نوازے گئے، جبکہ عاتکہ فہیم (کوٹہ، راجستھان) نے سوم، غلام محی الدین (مظفر پور، بہار) نے دوم اور انصاری منشا (بائیکلہ، ممبئی) نے اول پوزیشن حاصل کی جنھیں بالترتیب پانچ ہزار، ساڑھے سات ہزار اور دس ہزار روپے نقد اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔

اس پروگرام میں ڈاکٹر اندریش کمار کی کتاب 'چھوا چھوت مکت سمرس بھارت' کے اردو ترجمہ 'ہندوستان میں سماجی اور طبقاتی ہم آہنگی' کا اجرا بھی مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا اور عبدالباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر قومی اردو کونسل) نے کتاب پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ سماجی ہم آہنگی ومساوات کسی بھی ملک کی فلاح وترقی کی بنیاد ہے، اسی لیے ہمارے ملک کے صوفی سنتوں اور سماجی مصلحین نے ہمیشہ اس پر زور دیا ہے۔ اندریش کمار جی کی یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے، پہلے یہ ہندی میں تھی، اب اردو ترجمہ آجانے سے اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہوگا اور اس سے اردو والے بھی فائدہ اٹھاسکیں گے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحسن وخوبی انجام دی، جبکہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم ودانش موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 جون 2023

قومی اردو کونسل میں ہندی ورکشاپ کا انعقاد

نئی دھلی: وزارتِ تعلیم کی ہدایت کے مطابق سرکاری محکموں میں انتظامی امور ہندی زبان میں انجام دیے جائیں گے۔ اس بابت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں عمومی بیداری کے لیے ہندی ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا، جس میں دفتری امور میں انگریزی کے بجائے ہندی زبان استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ اس ورکشاپ میں بطور مقرر خصوصی وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری (محکمہ راج بھاشا) جناب جگدیش رام پوری نے شرکت کی۔ ورکشاپ کے شروع میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ

عقیل احمد نے موقر مہمان کو گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا اور اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے جس کا فروغ اور تحفظ ہر ہندوستانی کی ذمے داری ہے اور جس طرح مادری زبان کے تئیں ہمارے دلوں میں عزت واحترام پایا جاتا ہے اسی طرح قومی زبان کے تئیں بھی ہمارے دل میں احساسِ احترام ہونا چاہیے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے باہمی رشتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں زبانیں دراصل ایک ہیں، ان میں صرف رسم الخط کا فرق ہے اور اردو و ہندی دونوں زبانوں کا فروغ ایک دوسرے سے وابستہ

ہے،دونوں میں سے کسی ایک کو الگ کر کے ہم دوسری زبان کا فروغ نہیں کرسکتے،اس لیے ہمیں ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی ترقی اور ان کے تحفظ کے لیے کام کرنا چاہیے۔

مہمان مقرر جناب جگدیش رام پوری نے اپنی گفتگو میں ہندی کے قومی زبان بننے کے قانونی سفر پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی اور کہا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے اور اس کی حفاظت کرنا، اسے اپنے شب وروز کے کاموں میں استعمال کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔انھوں نے کہا کہ ہم ہندی زبان پر تو بہت بات کرتے ہیں، مگر جب ہندی میں پڑھنے لکھنے کی باری آتی ہے تو ہم اسے اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتے یا جھجھک محسوس کرتے ہیں، یہ آجکل کے پڑھے لکھے لوگوں کا عمومی مزاج بن گیا ہے۔حالاں کہ دنیا کے جتنے ترقی یافتہ ممالک ہیں ان کی ترقی اور کامیابی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تمام موضوعات کو مادری اور قومی زبان میں ہی پڑھایا اور سکھا جاتا ہے،ٹکنالوجی اور سائنس کو بھی وہ اپنی زبان میں ہی سیکھتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ ہمیں بھی اپنی قومی زبان کے تئیں اسی قسم کا احساس اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے،تبھی قومی زبان کو اس کا صحیح مقام مل سکتا ہے۔انھوں نے کہا کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ لینے،صحیح سمت میں محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے تبھی ہم منزل تک پہنچ سکتے ہیں،سرکار نے قومی زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے قانون بنادیا ہے،اس کے لیے ترجمہ اور تربیت وغیرہ کے مختلف منصوبے بھی چل رہے ہیں،مگر ان میں کامیابی تبھی ملے گی جب ہم صحیح فیصلے اور محنت ولگن کے ساتھ اپنی قومی زبان کی ترقی کا عہد لیں اور اپنی عملی وعلمی سرگرمیوں کا اسے حصہ بنائیں۔آخر میں پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہمان مقرر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں پہلے سے بھی دفتری کاموں میں اردو کے ساتھ ہندی زبان کا استعمال ہوتا رہا ہے،مگر اب ہم سرکاری ہدایت کے مطابق اس میں مزید سنجیدہ اقدامات کریں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل،قومی اردو کونسل،15 جون 2023

سری نگر میں کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز کے اساتذہ کے لیے چہارروزہ تربیتی پروگرام

نئی دہلی: قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ کے ساتھ ملک کی تقریباً تمام ریاستوں کے اردو طلبہ و طالبات کو بنیادی تکنیکی مہارتوں سے بھی لیس کررہی ہے تاکہ وہ موجودہ مسابقتی دور میں اپنے اور ملک کے لیے مفید ثابت ہوسکیں۔ان خیالات کا اظہار کونسل

کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے سری نگر میں ایک ٹریننگ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔اس میں جموں وکشمیر،لداخ، ہماچل پردیش و پنجاب میں کونسل کے ذریعے چل رہے کمپیوٹر سینٹرز کے ذمے داران اور فیکلٹی ممبرز شرکت کررہے ہیں۔اس پروگرام میں انھیں کمپیوٹر کورس کے نصاب میں ہونے والی نئی تبدیلیوں سے آگاہ کیا جارہا ہے تاکہ وہ آئندہ ان کے مطابق بچوں کو تعلیم دیں۔ یہ پروگرام چہار روزہ ہے اورنائلیٹ (چنڈی گڑھ) کے ٹرینرز کے ذریعے ٹریننگ دی جارہی ہے۔شیخ عقیل احمد نے مذکورہ صوبوں کے ساتھ ہندوستان بھر میں اردو کونسل کے ذریعے چلنے والے چھ سو سے زائد کمپیوٹر سینٹر کے ذمے داروں اور اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ بھارت سرکار کے ضوابط وشرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے سینٹر چلائیں تاکہ ہمیں درست نتائج حاصل ہوں۔انھوں نے کہا کہ کونسل کی جانب سے پچھلی کئی دہائیوں سے یہ کمپیوٹر سینٹر چلائے جارہے ہیں جہاں تعلیم وتربیت حاصل کرکے اب تک ہزاروں نوجوانوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور دیگر ریاستوں کے علاوہ جموں وکشمیر میں بھی ایسے نوجوانوں کی بڑی تعداد ہے جو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے مختلف شعبوں میں ملازمت کررہے ہیں یا اپنا سائبر کیفے وغیرہ چلارہے ہیں، ایسے بہت سے نوجوان ہمارے مختلف سینٹرز میں فیکلٹی ممبر کی حیثیت سے بھی کام کررہے ہیں۔انھوں نے کہا کہ جموں وکشمیر میں چلنے والے ان سینٹروں کی وجہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ نوجوانوں میں بیکاری کا رجحان کم ہوا ہے اور وہ مختلف قسم کی آئی ٹی اسکلز سیکھ کر اپنی معاشی ضروریات خود پوری کررہے ہیں۔شیخ عقیل نے کہا کہ چونکہ یہاں بے روزگاری بہت زیادہ ہے اس لیے ہماری کوشش ہوگی کہ مستقبل قریب میں ہم یہاں کونسل کی مزید ایسی اسکیمیں متعارف کروائیں،جن سے اردو زبان کا بھی فروغ ہو اور مقامی نوجوانوں کو روزگار بھی فراہم ہو۔اس موقعے پر مذکورہ صوبوں کے کمپیوٹر سینٹرز کے ذمے داران، فیکلٹی ممبرز کے علاوہ کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، انتخاب عالم اور نائلیٹ (چنڈی گڑھ) کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر سنیتا پوری بھی موجود رہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل،قومی اردو کونسل،22 جون 2023

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام نواں عالمی یومِ یوگ

نئی دہلی: یوگ ہندوستان کے قدیم فلسفے 'واسودیو کٹمبکم' کو بڑھاوا دیتا ہے اور یہ پوری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی منفرد کوشش بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے سری نگر میں عالمی یومِ یوگ

کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کیا۔ اس سے پہلے انھوں نے کونسل کے زیر اہتمام جموں وکشمیر،لداخ و پنجاب میں چلنے والے اسّی سے زائد کمپیوٹر سینٹرز کے اساتذہ ومقامی لوگوں کو بھی یوگ کروایا۔انھوں نے کہا کہ یوگ کرنے سے نہ صرف انسان کا جسم صحت مند اور توانا رہتا ہے بلکہ اس کا ذہن ودماغ بھی مضبوط رہتا اور بہتر طریقے سے کام کرتا ہے، اسی وجہ سے ہمارے وزیر اعظم نریندر مودی کہتے ہیں کہ یوگ صحت و تندرستی کے ساتھ ہماری درازیِ عمر کا بھی ذریعہ ہے۔شیخ عقیل نے کہا کہ یوگ ایک جسمانی ورزش ہے جس کی شروعات قدیم زمانے میں ہمارے ملک کے رشی منیوں نے کی تھی اور تب سے ہی یہ ہندوستان اور دنیا کے مختلف ملکوں میں مقبول رہی ہے،مگر جب سے نریندر مودی ملک کے وزیر اعظم بنے ہیں تب سے انھوں نے عالمی سطح پر اس کی

مقبولیت کو بڑھانے اور پھیلانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور انھی کی وجہ سے ہر سال 21 جون کو پوری دنیا میں عالمی یومِ یوگ منایا جاتا ہے، یہ یقیناً ہمارے لیے قابل فخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ دراصل مودی جی چاہتے ہیں کہ بھارت کے لوگ چست اور تندرست رہیں تاکہ وہ ذاتی ترقی کے ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی کما حقہ اپنا کردار ادا کرسکیں، کیونکہ جب وہ چست اور توانا رہیں گے تبھی خود اپنے لیے بھی مفید ثابت ہوں گے اور ملک کے بھی کام آئیں گے، ایک کمزور اور بیمار انسان نہ اپنے کام آسکتا ہے اور نہ اپنے ملک کے کام آسکتا ہے اس لیے ہمیں اپنی جسمانی صحت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور یوگ کو اپنے معمولاتِ زندگی کا حصہ بنانا چاہیے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ جموں و کشمیر میں ابھی یوگ کا چلن کم ہے مگر آج جس طرح یہاں کے لوگوں نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ آئندہ یوگ کے تئیں لوگوں میں عمومی دلچسپی پیدا ہوگی اور ہماری بھی کوشش ہوگی کہ یہاں عالمی یومِ یوگ کو خوب دھوم دھام سے منایا جائے۔

واضح رہے کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے پچھلے تین دنوں سے لگاتار عالمی یومِ یوگ کی مناسبت سے یوگا کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ چنانچہ 19 جون کو کونسل کے صدر دفتر میں ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام اسٹاف کو یوگا کروایا، اسی طرح 20 جون کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں 'اے پی جے عبدالکلام کے سماجی و سائنسی افکار' کے عنوان سے مسابقہ مضمون نویسی میں کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کے مابین تقسیم انعامات کا پروگرام منعقد ہوا تھا، اس میں بطور مہمان خصوصی آر ایس ایس لیڈر ڈاکٹر اندریش کمار نے شرکت کی اور انھوں نے بھی یوگا کی مشقیں کروائی تھیں جبکہ آج سری نگر میں پروفیسر شیخ عقیل احمد نے جموں و کشمیر و لداخ، پنجاب و ہماچل پردیش کے کمپیوٹر سینٹرز کے اساتذہ و مقامی لوگوں کو یوگا کروایا ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ اور انتخاب عالم بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جون 2023

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

محمود تیمور کی خدمات پر سمینار

نئی دهلی: ریسرچ اسکالرس فورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام چوالیسواں ان ہاؤس سمینار کا

انعقاد پروفیسر عبدالماجد قاضی، صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں کیا گیا، جس میں شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر نے شرکت کی، پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالر فورم کے سکریٹری ساجد ایم نے صدر جلسہ، اساتذۂ کرام اور ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبہ کے ریسرچ اسکالر سلیم اختر نے عربی افسانہ نگاری میں محمود تیمور کی خدمات کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس دوران موصوف نے محمود تیمور کا مختصر تعارف پیش کیا اور بتایا کہ محمود تیمور ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ محمود تیمور بہت سے یورپین اور روسی ادبا سے متاثر ہوئے۔ ابتدا میں محمود تیمور نے قصوں کے ذریعے مصر کے اجتماعی اور سیاسی حالات کی اصلاح کے لیے کوششیں کیں۔ بعد میں انھوں نے پوری انسانیت کی خیر و بھلائی کی طرف اپنے قصوں کے ذریعے رہنمائی کی۔ ریسرچ اسکالر نے محمود تیمور کے افسانوں کے خصائص اور فنی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، نیز محمود تیمور کے بارے میں کبار ادبا کے اقوال کا بھی تذکرہ کیا اور عربی افسانہ نگاری کے ارتقا میں محمود تیمور کے کردار پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈالی۔ ریسرچ اسکالر، سلیم اختر نے دیگر ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کی جانب سے کیے گئے سوالات کا تسلی بخش جواب دیا۔ بعد ازاں شعبہ کے صدر، پروفیسر عبدالماجد قاضی نے ریسرچ اسکالرس کو مبارکباد پیش کی اور مفید مشورے دیے۔ سلیم اختر کی کوششوں کو سراہتے ہوئے محمود تیمور کے ادب اور افسانوں کے مختلف گوشوں کی نشاندہی کی، اور محمود تیمور و دیگر ادبا کے ادب میں فرق بھی واضح کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جون 2023

عربی تنقید و تحقیق اور نبیل سلیمان

نئی دهلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سمینار ہال میں معاصر عرب دنیا کے مشہور ناقد اور نامور ادیب پروفیسر نبیل سلیمان کا والہانہ استقبال کے ساتھ ان کی عربی تنقید نگاری، ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں غیر معمولی علمی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اس موقع پر 'عربی تنقید و تخلیق نگاری اور نبیل سلیمان' کے موضوع پر ایک لیکچر کا بھی انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کی جب کہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کے بین الاقوامی روابط عامہ کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر نے شرکت کی۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے مہمان خصوصی پروفیسر نبیل سلیمان کا تعارف پیش کیا، جب کہ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر اور ڈاکٹر محمد اکرم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس سے قبل پروگرام کے آرگنائزر و کنوینر پروفیسر نعیم الحسن اثری نے کہا کہ شعبہ عربی اور اس سے وابستہ اساتذہ و طلبہ کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آج ہمیں عربی دنیا کے نامور ادیب اور ایوارڈ یافتہ ناقد کو براہِ راست سننے اور فیضیاب ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ پروگرام کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے عربی زبان و ادب میں ہندوستانی علما اور اساتذہ کی کاوشوں کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے علما نے عرب ممالک کے مختلف مشہور علمی ولسانی مراکز ومجامع سے ہر دور میں وابستہ رہ کر عربی زبان کی خدمت کی ہے، جن میں حکیم اجمل خان، پروفیسر مختار الدین، پروفیسر عبدالعزیز میمنی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے حضرات کے نام شامل ہیں۔ آخر میں شعبہ عربی ذاکر حسین کالج کے استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے شکریہ کی رسم ادا کی، پروگرام میں اساتذہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے علاوہ بڑی تعداد میں شعبہ کے ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جون 2023

آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا افتتاح

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا افتتاح ایوان غالب میں ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے مہمانوں اور طلبہ کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ چھ مہینے کا کورس ہے اور ہم سال میں دو مرتبہ چھ چھ مہینوں کے دو بیچ کا اہتمام کرتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار ادبی دنیا میں اپنا خاص امتیاز رکھتے ہیں اور یہاں سے جو لٹریچر شائع ہوتا ہے وہ بھی علمی بحثوں کو قائم کرتا اور انھیں آگے بڑھاتا ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ اس ادارے سے میرا پرانا تعلق ہے اور وہ تعلق علمی سرگرمیوں کے سبب ہے۔ آج سے پہلے میں ہمیشہ یہاں کسی علمی مذاکرے میں شرکت کی غرض سے آیا ہوں، لیکن مجھے ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ جس معیاری ادب کی بات ہم کرتے ہیں کیا اس کے مسائل میں اگلی نسل کی عملی شرکت ممکن ہو سکے گی؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اگلی نسل کو کم از کم بنیادی تعلیم سے واقف کرادیں۔ اردو فارسی کلاس کے استاد طاہر الحسن نے کہا کہ میں تقریباً دو سال سے اس ادارے سے وابستہ ہوں اور تدریسی فرائض انجام دے رہا ہوں، اس کورس میں ہر عمر ہر مذہب اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ہر خطے سے لوگ شریک ہوتے ہیں بلکہ بیرون ملک کے بھی کچھ طلبہ پچھلے کورس میں شامل تھے۔ موسیقی کے استاد عبدالرحمٰن نے کہا کہ موسیقی بھی ایک زبان ہے اور ہر زبان کی طرح اس کے قواعد ہیں جو ریاضت سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سب کو یہ موقع

دیتا ہے کہ اگر وہ خود نہیں آسکتے تو گھر میں یا دفتر میں بیٹھ کر بھی موسیقی کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جولائی 2023

اتر پردیش

اتر پردیش اردو اکادمی کا صحافت سمینار

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی کے قیام کے 50 سال مکمل ہونے پر جشن اکادمی کے تحت 17-19 جون 2023

کو گولڈن جوبلی تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی پروفیسر خواجہ اکرام نے کہا کہ ملک کی آزادی میں اردو کا اہم کردار رہا ہے، یہاں تک کہ شہید ہونے والا پہلا صحافی بھی اردو کا ہی تھا۔ اس کے باوجود اردو صحافت کافی پسماندہ نظر آتی ہے۔ موجودہ وقت میں میڈیا نے صحافت کو ختم کر دیا ہے۔ آج میڈیا کو سچی صحافت سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ تقریب میں سینئر صحافیوں کے ساتھ 2019 اور 2021 کے انعام یافتہ صحافیوں کو توصیفی سند و اعزاز سے نوازا گیا۔ اکادمی کے اکابرین پر مشتمل مجلّہ 'سہ ماہی اکادمی' کے خصوصی شمارہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اردو اکادمی کی گولڈن جبلی تقریب 'جشن اکادمی' کے افتتاحی پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ اردو اکادمی محض ایک اکادمی نہیں بلکہ ادب و تہذیب کا مرکز ہے۔ اکادمی کے ذریعے ہی لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ و بقا کے لیے سبھی سے آگے آنے کی اپیل کی، انھوں نے کہا کہ جب تک ہم خود اردو نہیں پڑھیں گے اور اپنی بیٹیوں کو جہیز میں اردو کتابیں نہیں دیں گے تب تک اردو زبان کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اتنے عرصے کے بعد بھی اردو صحافت ابھی بہت پیچھے ہے۔ انٹیگرل یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر وسیم اختر نے اردو کو روزی روٹی اور تکنیک سے جوڑنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسی تعلیم کا نظام ہو، جس میں اردو کا طالب علم سائنسداں بھی بن سکے۔ سابق آئی اے ایس افسر انیس انصاری نے کہا کہ یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، اس کے باوجود اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا معقول نظم نہیں ہے۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ اکادمی کے چیئرمین چودھری کیف الوری اور سکریٹری ایس ایم عادل حسن نے سبھی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے ادا کیے۔ اس موقعے پر متعدد اردو صحافیوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس میں احمد ابراہیم علوی، عبیداللہ ناصر، سہیل انجم، معصوم مرادآبادی شامل رہے۔ اس کے علاوہ سال 2019 اور 2021 کے لیے انعام کی حقدار قرار پانے والی شخصیات ڈاکٹر فخرالکریم، حکیم وسیم احمد اعظمی، شاد عباسی، ڈاکٹر شگفتہ یاسمین، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر رفعت جمال، آصف جعفری، مشتاق احمد، احتشام الدین صدیقی، ڈاکٹر طارق قمر، ڈاکٹر نسیم بانو، پروفیسر طارق سعید، پروفیسر سید محمد ہاشم وغیرہ کو توصیفی سند دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔

اردو صحافت کے دو سو سال کی مناسبت سے سمینار کا بھی انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار کے پہلے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ اتر پردیش اردو اکادمی نے صحافت پر دو روزہ سمینار کا انعقاد کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اردو صحافت کے دو سو برس مکمل ہونے کے موقعے پر اس بات کی ضرورت تھی کہ ہم اردو میں صحافت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اردو صحافت نے ملکی اور قومی تاریخ میں کیا خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر شبنم حمید نے اس موقعے پر کہا کہ ادب اور صحافت کا رشتہ اس طرح ہے جس طرح پھول کا خوشبو سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا میں دیار گنگ و جمن کی ہوں اس لیے مجھے تشبیہ کے لیے سنگم سے بہتر کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں دونوں الگ الگ بھی ہیں اور ایک بھی ہیں۔ پروفیسر سید محمد ہاشم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر نسیم احمد نے کہا کہ جشن اکادمی کے تحت دو روزہ قومی صحافت سمیناروں میں جو مقالے پڑھے گئے ہیں، امید کی جاتی ہے کہ ان سے نئی نسل کی رہنمائی ہوگی۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ادبی سرگرمیاں دراصل ہماری تہذیبی سرگرمیاں ہیں، اکادمی کے زیر اہتمام یہ سمینار بنیادی طور پر ہماری ادبی اور تہذیبی سرمائے کی قدردانی اور مستقبل کی راہیں ہموار کرنے کی سمت میں قابل قدر کاوش ہے۔ صحافت کو مثبت رویہ اور رجحانات کی سمت لے جانے کے لیے اس طرح کی کوششیں ضروری ہیں۔ پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ اردو صحافت کے دو سو سال ہماری صحافت برادری کے لیے بھی لمحہ فکر ہے کہ ایماندار صحافت کو درپیش خطرات سے کیسے نبرد آزما ہونا ہے۔ آج کے دونوں اجلاس میں ڈاکٹر ابرار احمد پونہ، شکیل حسن شمسی، حقانی القاسمی دہلی، سہیل انجم دہلی، ڈاکٹر ملک جاوید انور، ڈاکٹر عقیل احمد دہلی، ڈاکٹر طارق منظور، پروفیسر شہاب عنایت ملک کشمیر، ڈاکٹر حسن ضیا دہلی، پروفیسر سید سراج اجملی علی گڑھ اور معصوم مرادآبادی نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد اکمل اور دوسرے کی ڈاکٹر آفتاب نجمی نے کی۔ چیئرمین اکادمی چودھری کیف الوریٰ انصاری اور سکریٹری ایس ایم عادل حسن نے سبھی مہمانوں کو یادگاری نشان شال اور گلدستہ پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر اکادمی ممبر ڈاکٹر شاداب عالم، ڈاکٹر رضوانہ، اسلام سلطانی، حاجی ظہیر احمد، سلیس بیگ اور ماہ طلعت کے علاوہ بڑی تعداد میں محبان اردو نے بھی شرکت کی۔

صحافت سمینار کے آخری دن کے پہلے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ، صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو صحافت کی تاریخ کے دو سو سال مکمل ہونے اور یوپی اردو اکادمی کے پچاس سال پورے ہونے پر سمینار منعقد کر کے اکادمی کے ارباب اختیار نے بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ صحافت کا میدان ہماری اجتماعی زندگی کے لیے نہایت کارآمد اور مفید ہے کیونکہ صحافی وہ اشخاص ہوتے ہیں جو سماج اور تہذیب کی نبض شناسی کرتے ہیں اور زندگی کو بہتر بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پروفیسر رضی الرحمٰن، شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کہا کہ جشن اردو اکادمی اور دو صد سالہ جشن صحافت کے سلسلے میں منعقدہ اردو صحافت سمینار اہمیت کا حامل ہے۔ اردو اکادمی نے ایک اچھا قدم اٹھایا

ہے۔ اس سمینار کے انعقاد سے اردو صحافت کی ایک تاریخ مرتب ہوگی۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبۂ اردو بنارس یونیورسٹی نے سمینار کے دوسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت نے جنگ آزادی میں جہاں کلیدی کردار ادا کیا ہے وہیں آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ ملک کی تعمیر وترقی اور عوام کی ذہنی وفکری تعمیر میں اردو صحافت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد علی جوہر نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافیوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کو ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ بیان کریں۔ اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ صداقت کا پہلو کم نہ ہونے پائے۔ اس موقعے پر حیدرآباد سے آئے پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے بھی خطاب کیا۔ آج کے سمینار میں ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی لکھنؤ، ڈاکٹر درخشاں تاجور گورکھپور، ڈاکٹر محمد طاہر اعظم گڑھ، ڈاکٹر نورین علی حق دہلی، ڈاکٹر لئیق احمد بنارس، ڈاکٹر ثاقب عمران دہلی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن الہ آباد، ڈاکٹر رضی شہاب ویسٹ بنگال، ڈاکٹر اشفاق احمد گورکھپوری، پروفیسر سید شفیق شرفی لکھنؤ، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی لکھنؤ، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر سلیم احمد لکھنؤ، ڈاکٹر مرسلین پونے، ڈاکٹر محمد اختر حیدرآباد، ڈاکٹر مشیر احمد دہلی، ڈاکٹر محمد شارق علی گڑھ، ڈاکٹر جاوید عالم دہلی، ڈاکٹر خوشتر زریں ملک دہلی، پروفیسر ندیم احمد دہلی وغیرہ نے پہلے اور دوسرے سیشن میں اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلے سیشن کی نظامت ڈاکٹر سید حسین جیلانی اور دوسرے سیشن کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 18 جون، روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جون 2023، اور دیگر اخبارات

حیات اللہ انصاری کی شخصیت اور خدمات

لکھنؤ: حیات اللہ انصاری کی شخصیت جامع صفات کی حامل تھی۔ وہ ایک ممتاز ناول نویس، جید صحافی، ناقد، ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک اردو کے قائد بھی تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اپنے قلم سے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ملک میں رہنے والے تمام طبقات کی رہنمائی کی۔ وہ صحیح معنوں میں سیکولرزم کے حامی اور قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ ان کے یہاں نفرت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان خیالات کا اظہار فرنگی محل کے مولانا عبدالوحید ہال میں قومی یکجہتی کے علمبردار حیات اللہ انصاری موضوع پر منعقد قومی سمینار میں مقررین نے کیا۔ سمینار کا انعقاد ریاستی انجمن ترقی اردو اترپردیش کے تحت ہوا تھا جس کی صدارت معروف صحافی احمد ابراہیم علوی (لکھنؤ) نے کی۔ بطور مہمان خصوصی کلیدی خطبہ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی (مرادآباد) نے پیش کیا اور بطور مہمان ذی وقار وائس آف امریکہ کے نمائندے معروف صحافی سہیل انجم (دہلی) شریک ہوئے۔ اس موقعے پر معصوم مرادآبادی کو صحافتی ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔ صدارتی خطاب میں سینئر صحافی و افسانہ نگار احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کی شخصیت کے جس پہلو پر یہ سمینار ہو رہا ہے اس کی آج کے ہندوستان میں سخت ضرورت ہے۔ حیات اللہ انصاری قلم کے سپاہی تھے۔ انھوں نے بطور صحافی اور بطور افسانہ و ناول نگار عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ان کی تحریوں کا مقصد ہی قومی یکجہتی تھا۔ سینئر صحافی مہمان خصوصی معصوم مرادآبادی نے اپنے جامع خطاب میں کہا کہ حیات اللہ انصاری صحافی، دانشور، ناول نگار و افسانہ نویس تھے۔ ان کا نظریہ ترقی پسندانہ اور قومی یکجہتی کا تھا۔ ان کے پاس بہت مواقع تھے لیکن انھوں نے ان مواقع کا استعمال مال و دولت جمع کرنے کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنی پوری توانائی قوم وملک کی تعمیر اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے صرف کی۔ انھوں نے پانچ جلدوں میں اردو کا ضخیم ترین ناول لہو کے پھول لکھا۔ جدید صحافت کی بنیاد رکھی۔ مہمان ذی وقار سینئر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کی شخصیت میں فرنگی محل کی تہذیبی وراثت اور ہندوستان کے سیکولرزم کا حسین امتزاج تھا۔ انھوں نے اپنے قلم سے دو قومی نظریہ کی نفی کی اور متحدہ ہندوستان کی بھرپور وکالت کی۔ ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ سمینار میں ڈاکٹر تنویر (اندور، مدھیہ پردیش)، ڈاکٹر شاداب خاں (ملیح آباد) اور ڈاکٹر خالد (علی گڑھ) وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ اس سے قبل صحافی و ادیب راشد خان ندوی نے مہمان کرام اور موضوع کا تعارف کرایا۔ نظامت معروف شاعر شکیل گیاوی نے کی۔ سمینار کی کنوینر بیگم شہناز سدرت اور کوآرڈینیٹر سدرت اللہ انصاری نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جون 2023

محفل افسانہ خوانی

لکھنؤ : کہانی کہی اور ان کہی کے درمیان کی چیز ہوتی ہے۔ آج کا مصنف سب کچھ نہیں کہتا بلکہ قاری کے لیے بھی کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ آج پڑھی گئی دونوں کہانیاں ماضی اور حال سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔ دونوں کہانیوں میں حال کے مسائل اور ان سے مقابلہ کرتے کردار پیش کیے گئے

ہیں۔ ہندی کہانی میں جزئیات نگاری اور تفصیلی بیان ملتا ہے جبکہ اردو کہانی میں اشاروں کنایوں میں بات ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد اور افسانہ نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے 20 جون کو لکھنؤ میں منعقدہ افسانہ خوانی کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ عوامی کلچرل فورم اور بھارتیہ جن ناٹیہ سنگھ (اپٹا) کی جانب سے ہندی کے کہانی نویس راجہ سنگھ اور اردو کے افسانہ نگار راجیو پرکاش ساحر کی کہانی سنانے کا اہتمام اپٹا کے دفتر، واقع قیصر باغ، لکھنؤ کے احاطے میں کیا گیا تھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنی گفتگو میں آگے کہا کہ ہندی اور اردو ترقی پسند تحریک کے دوران قریب آئے تھے۔ دونوں زبانوں میں اتحاد تھا۔ پریم چند اس کے مرکز میں تھے۔ آج کے سیاسی حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں زبانوں کے لوگوں میں اتحاد کے عمل کو آگے بڑھایا جائے، دونوں آپس میں ملیں اور بات چیت کریں۔ اس سمت میں لکھنؤ میں اردو اور ہندی کہانی کاروں کے افسانہ سنانے کا یہ اہتمام ایک اچھی شروعات ہے۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ زندگی کی کہانیاں ہیں۔ راجہ سنگھ کی کہانی سوچ پر مبنی ہے۔ زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اسے سامنے لایا ہے۔ راجیو پرکاش ساحر کی کہانی خواتین کی زندگی کے حالات کے خلاف مزاحمت کی خوبصورتی کو سامنے لاتی ہے۔ ہندی اور اردو کہانی سنانے کا اہتمام دلوں کو جوڑنے کے لیے ہے۔ ہندی- اردو کو قریب لانے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ایسی تقریبات کا انعقاد باقاعدگی سے ہونا چاہیے۔ پروگرام کی نظامت عوامی کلچرل فورم، لکھنؤ کے سکریٹری اور نوجوان افسانہ نگار فرزانہ مہدی نے کی۔

اس موقعے پر اردو کے افسانہ نگار راجیو پرکاش ساحر نے اپنی کہانی 'مردانی' سنائی۔ اس کا آغاز مجاز کی اس نظم سے ہوتا ہے جس میں وہ آنچل کو جھنڈا بنانے کی بات کرتا ہے۔ کہانی دو خواتین کے گرد گھومتی ہے۔ یہ 'نصیبن' اور اس کی سہیلی 'سرلا' ہیں۔ دونوں کے شوہر شرابی، جواری اور نالائق ہیں۔ سرلا بھی اپنے شوہر کے جبر

کا شکار ہے۔ گھر چلانے اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دونوں ای رکشہ چلانے پر مجبور ہیں۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر دوڑتا اس کا ای رکشہ ان لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے جو خواتین کو پدرانہ نظریہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ دونوں مل کر ایسے شہدوں کو سبق سکھاتی ہیں۔ بعد ازاں دونوں کہانیوں پر ایک سنجیدہ بحث کا آغاز ہوا جس کی شروعات عوامی کلچرل فورم اتر پردیش کے ایگزیکٹو صدر کوشل کشور نے کی۔ دوردرشن لکھنؤ کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر اور شاعرو ادیب ڈاکٹر شیلیش پنڈت نے کہا کہ اردو افسانوں کی بنیادی خوبی ان کا کہانی پَن ہے۔ ہندی والوں کے یہاں اس کہانی پن کو برقرار رکھنے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پڑھی گئی دونوں کہانیوں میں یہ عنصر موجود تھا۔

تقریب میں ڈاکٹر احتشام خان (ڈائریکٹر امریکن انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ)، ڈاکٹر مسیح الدین (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)، پروفیسر تقی (شیعہ پی جی کالج)، ڈاکٹر ارشاد سیانوی (میرٹھ یونیورسٹی)، اپٹا کے قومی کارگزار صدر راکیش سنگھ، شاعر بھگوان سوروپ کٹیار، انڈیا انسائیڈر کے ایڈیٹر ارون سنگھ، شاعرہ ولی کشور اور کلپنا پانڈے، شاہد حبیب فلاحی، راکیش کمار سینی، آر کے سنہا وغیرہ نے اپنے خیالات رکھے۔

بہ حوالہ: قندیل ڈاٹ کام (https://qindeelonline.com)

اردو ویب سائٹس کی ادبی خدمات

میرٹھ: ''جلد بازی میں ہم کو اپنی چیزیں شائع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ باپ اور استاد ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی اولاد یا اس کے شاگرد اس سے آگے جائیں۔ ویب سائٹس سے اردو کا فروغ ہو رہا ہے یا اردو پیچھے جا رہی ہے اس تعلق سے سوچنا ضروری ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب و شاعر عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو اور آیوسا کے ذریعے منعقد ہفتہ واری ادب نما پروگرام میں 'ویب سائٹس کی ادبی خدمات' کے موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ مہمان خصوصی کے بطور ریختہ ایڈیٹوریل کے سالم سلیم شریک ہوئے اور مہمان اعزازی کے بطور چھتیس گڑھ کے معروف ناقد خورشید حیات نے شرکت کی جب کہ مقررین کے بطور ڈاکٹر نوشاد منظر (بانی و مدیر ادبی میراث ویب پورٹل) ابواللیث قاسمی (مدیر انتظامی، قندیل ویب پورٹل) اور لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات علمہ ملک، نظامت سیدہ مریم الٰہی اور شکریے کی رسم نوید خان نے انجام دی۔

پروگرام کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اگر آج ہم اردو سائٹس اور پورٹل کو دیکھیں تو اردو کے مضامین و مقالات آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اردو کی بڑی ویب سائٹ ریختہ نے طلبا کو خوب فائدہ پہنچایا ہے۔ آج ہمارے بہت سے طالب علم ویب سائٹس سے مواد لے کر اپنا تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نوشاد منظر نے کہا کہ ادبی میراث ویب پورٹل تحقیق کرنے والے طلبا کے لیے بہت اہم ثابت ہوا ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس ویب کے ذریعے طلبا اور خصوصاً ریسرچ اسکالرز کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں اور اچھا مواد طالب علموں تک پہنچ سکے۔

ابواللیث قاسمی نے کہا ہمارا اصل مقصد نئے قلم کاروں کی تخلیقات کو شائع کرنا ہے۔ سبھی پورٹل اپنے آپ میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ادبی و تنقیدی مضامین کے علاوہ سیاسی و سماجی موضوعات والے ایسے مضامین بھی شائع کرتے ہیں جن سے ہمارے قارئین فائدہ حاصل کر سکیں۔ سالم سلیم نے کہا کہ ریختہ ویب سائٹ کا آغاز 2013 میں ہوا۔ ریختہ کے Content میں ہزاروں کی تعداد میں نظمیں، غزلیں، کہانیاں اور مضامین ہیں۔ کسی شاعر کا شعر اس پر سرچ کریں تو آسانی سے مل جاتا ہے۔ ایک لاکھ اسی ہزار کتابیں اس پر دستیاب ہیں۔ ہندی کی کتابوں کے علاوہ گجراتی زبان کے ساتھ ہی اردو اور دیگر زبان و تہذیب کو یہاں خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ ہم سب طالب علم ہیں۔ ہم سب کے لیے مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ دور حاضر میں ویب سائٹس سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ لائبریریوں سے بھی تعلق ضرور رکھیں۔ آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ نوشاد منظر، سالم سلیم اور ابو اللیث صاحب وغیرہ کی ویب سائٹس سے طلبا ضرور استفادہ کریں گے۔ ہم سب کو پڑھنے کی عادت تو ڈالنی ہی ہوگی لیکن آج کے دور میں ویب سائٹس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ خورشید حیات نے کہا کہ ڈیجیٹل معاشرہ ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرح ہے۔ خالق کائنات نے انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے ان میں سے عظیم ترین نعمت انسان کی فہم، قوت فکر، گویائی، ذہن و دماغ میں تخیلات اور تصورات کی موجودگی ہے۔ اردو کی ویب سائٹس نے تحقیق کرنے والوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ آج تحقیق کے معنی کسی بھی ویب سائٹ سے کاپی، کٹ، پیسٹ رہ گیا ہے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر عامر نظیر ڈار، ڈاکٹر ریشما قمر، شفا، ابوطلحہ، فیضان ظفر، روضہ خان، اور سعید احمد سہارنپوری جڑے رہے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ میرٹھ، 8 جون 2023

شام پیس فاؤنڈیشن کا پروگرام

لکھنؤ: شام پیس فاؤنڈیشن نے مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے اشتراک سے 'انسان' ردیف پر شعرا کو دعوت سخن دی، محفل شعر وسخن آراستہ ہوئی۔ نثری حصہ کو طاقت بخشی ڈاکٹر اسرار الحق قریشی کے مقالہ نے جو کہ مائل ملیح آبادی کے ناول 'آرزو' پر تحریر کیا گیا ہے۔ مقالہ میں ناول کی خوبیوں اور خامیوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس کا اعتراف پروگرام کے سرپرست بیباک ادیب و خطیب اور افسانہ نگار احمد ابراہیم علوی نے کیا اور کہا کہ مائل ملیح آبادی نے بڑے نفسیاتی اور تاریخ ساز ناول لکھے۔ (انسان) عنوان پر ہوئے مشاعرے کی صدارت ممتاز رباعی گو شاعر رہبر تابانی نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر صاحب دیوان شاعر مرزا شارق لاہرپوری اور معروف شاعر رفعت شیدا صدیقی پروگرام حصہ رہے۔ خصوصی شرکا میں ثابت لکھنوی، محمد علی علوی، عاصم کاکوروی، شاہد حبیب فلاحی، محمد شمیم قدوائی، شہاب الدین خاں، یوگیش مشرا، خالد حلیم اور فیضان خان وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' لکھنؤ، 2023

سید محمد اشرف کی تخلیقی کائنات

میرٹھ: سید محمد اشرف اپنے آپ کو حقیقت نگار کہیں یا نہ کہیں، ترقی پسند کہیں یا نہ کہیں لیکن وہ ایک اچھے ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ سید محمد اشرف کے افسانوں اور ناولوں نے نوجوان نسل کو کافی متاثر کیا ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب و شاعر عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو اور آیوسا کے ذریعے منعقد ہفتہ واری ادب نما پروگرام میں 'سید محمد اشرف کی تخلیقی کائنات' موضوع پر منعقدہ 15 جون کو اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔

پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے آن لائن شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کے بطور سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر قدوس جاوید اور مہمان اعزازی کے بطور جموں سے ڈاکٹر ریاض توحیدی

نے پروگرام میں شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور عرفان عارف (اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ایس پی ایم آر کالج آف کامرس، جموں) اور ڈاکٹر ریشما قمر شریک رہے جب کہ مقرر کی حیثیت سے لکھنؤ سے آیوسا کی صدر ڈاکٹر ریشما پروین نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دی۔

صدر شعبۂ اردو اور معروف فکشن ناقد و فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ جدیدیت کے زمانے میں جب کہانیوں اور ناولوں میں گنجلک علامات کا خوب استعمال ہو رہا تھا ایسے وقت میں سید محمد اشرف نے گنجلک علامات سے کنارہ کشی کرتے ہوئے منفرد راستہ اختیار کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت عمدہ زبان خلق کرتے ہیں اور اپنے متعدد فکشن نگاروں سے اچھی زبان لکھتے ہیں۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی سید محمد اشرف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی کہانی کے لیے تکنیک ہی اہم ہوتی ہے جو کہانی کو اونچائی تک لے جاتی ہے۔ اسی لیے اچھا افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے جب کہ ناول میں ایسا نہیں ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے ڈاکٹر شاداب علیم کے بہت سے سوالوں اور خاص کر طلبا کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آج اردو کی بڑی اہمیت ہے۔ آج کی تاریخ میں اردو موضوع لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اردو کا اسکوپ آج بھی کم نہیں ہے۔ جب تک ہم اردو والے احساس کمتری کا شکار رہیں گے تب تک کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔

پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ حقانی القاسمی، طارق چھتاری اور صغیر افراہیم وغیرہ نے سید محمد اشرف کی افسانہ نگاری پر کافی لکھا ہے۔ سید محمد اشرف کے یہاں جو کردار نگاری اور خیال آرائی ملتی ہے اس پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کسی خاص تحریک کا سہارا نہیں لیا۔ وہ وہی لکھتے ہیں جس کا تجربہ اپنی زندگی میں کیا ہے۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ ایک کامیاب افسانہ نگار وہی ہے جو کہانی لکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کے ہنر سے بھی واقف ہو۔ سید محمد اشرف کا شمار بھی ایسے ہی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی کہانی میں کردار، قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کہا کہ سید محمد اشرف کے افسانوں کے داستانی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ اسلوب، کردار نگاری اور منظر نگاری قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجرباتی رنگ اور سماجی مسائل کے سچے ثبوت ملتے ہیں۔

پروگرام میں ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد، سیدہ مریم الٰہی، فیضان ظفر موجود رہے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ

میرٹھ، 15 جون 2023

مجلس علم و ادب کی ادبی محفل

لکھنؤ: حقانی القاسمی کی لکھنؤ آمد پر ان کے اعزاز میں برمکان مجاہد سید، واقع مہدی گنج لکھنؤ ایک باوقار ادبی محفل کا انعقاد و اہتمام ہوا جس میں شعرا، صحافی اور دانشور

ایک بینر تلے یکجا نظر آئے۔ فریضہ صدارت ہفتہ وار 'آگ' میگزین کے ایڈیٹر سید حسین افسر نے انجام دیے اور کہا: اردو کی پرانی بستیاں مائل بہ زوال ہیں۔ وہاں سے ادب رخصت ہو رہا ہے لیکن نئی بستیاں پھل پھول اور پنپ رہی ہیں۔ مہمان خاص حقانی القاسمی نے مجاہد سید کی شاعری، ان کے خلوص اور جذبے کی تعریف کی اور کہا کہ اردو کے سچے شیدائی و فدائی سود و زیاں سے بے نیاز رہ کر کام کرتے ہیں۔ انھوں نے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ پر زور دیا۔ معروف شاعر و صحافی مجاہد سید نے کہا کہ خود کو فنا ہونے سے بچانا ہے تو اردو کو بچایئے اردو ہے تو آپ بھی ہیں۔ پریم چند پر تحقیقی مقالہ لکھنے والے جاوید عالم نے بتایا کہ پریم چند کو ذو لسانی ادیب کی حیثیت حاصل ہے۔ ریڈیو اور دوسرے محکموں سے وابستہ رہے معراج الدین خان نے لن ترانیوں سے زیادہ فروغ اردو کی عملی کوششوں پر زور دیا۔ میٹرلنک کے پروپرائٹر قاضی محمد زکریا نے کہا ہم اردو کتابوں کے سلسلے میں مایوس نہیں ہیں۔ اس ادبی محفل کی خصوصیت یہ بھی رہی کہ صاحب خانہ مجاہد سید نے پر لطف انداز میں شرکا و سامعین کا تعارف کرایا۔ کارآمد گفتگو کی اور اپنے دانشورانہ انداز سے ایسا ماحول بنا دیا کہ شاعری کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ معید رہبر اور طارق سخا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ انھوں نے اردو کے سلسلے میں متاثر کن اشعار پڑھے۔ اس موقعے پر خاندان مجاہد کے صاحبان ذوق موجود تھے۔ مخصوص شرکا کے نام اس طرح ہیں احرار الہدیٰ شمس، اختر ہاشمی، کیف کاکوروی، زبیر احمد، حشیم فاروقی، فیضان خان، جلال لکھنوی، پپلو لکھنوی، تاشفین محمد سید، سید انبساط، محمد ندیم، سید محمد وغیرہ۔ اس ادبی محفل کا اختتام صاحب خانہ کے کلمات تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' لکھنؤ، 20 جون 2023

بہار

اردو طلبا کے مابین مباحثہ و مسابقہ خطابت

چھپرہ: دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اپنی مادری زبان سے بہت محبت کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اپنی مادری زبان سے اسی طرح کی محبت کرنی ہوگی۔ یہ باتیں مہمان خصوصی وڈپٹی الیکشن افسر جاوید اقبال نے اردو داں طلبا کی حوصلہ افزائی منصوبہ کے تحت منعقدہ مباحثہ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم اردو کو پڑھیں، بولیں اور اس کا استعمال کریں۔ اردو کا استعمال گھروں میں کیا جائے تا کہ اردو کو فروغ حاصل ہو۔ مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو سیل کے انچارج افسر و ضلع اقلیتی فلاح افسر جنیش کمار رائے نے تقریب پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام یہ پروگرام ہر سال ضلع اردو زبان سیل کے ذریعے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مشاعرہ، سمینار اور ورکشاپ اور اردو رسالے کی اشاعت وغیرہ کے ذریعے اردو کی ترقی کے لیے بامعنی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اردو کو خالص ہندوستانی زبان قرار دیتے ہوئے انھوں نے اسے پیاری زبان قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اس کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ آج بھی اردو کا استعمال ایوان سے لے کر سڑکوں تک بھائی چارہ اور یکجہتی کو قائم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تقریب کا افتتاح ضلع اقلیتی فلاح افسر اور ضلع ڈپٹی الیکشن افسر نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ مقابلے میں کل 54 طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ میٹرک سطح پر رخسار اسلم نے پہلا، شازیہ اور تبسم نے دوسرا اور سمرن نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر بشریٰ نے پہلا، فرحہ اور دیان علی نے دوسرا اور شائستہ اور فضا نے تیسرا مقام جب کہ گریجویشن سطح پر زینب نے پہلا، صبا اور دلاور نے دوسرا اور روشنی وہدیٰ نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ ضلع اقلیتی فلاح افسر جنیش کمار

نے بتایا کہ تمام فاتحین خصوصی تقریب میں نقد انعامات اوراسناد سے نوازے جائیں گے۔ جنید میر، انصاف علی ور آفتاب عالم نے جج کے فرائض بخوبی انجام دیے جب کہ نظامت کے فرائض ندیم احمد نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جون 2023

ادبی وشعری نشست

ارریہ: ارریہ شہر میں فروغ اردو اوراس کی ترویج واشاعت کے لیے عملی طور پر کوشاں 'اسلوب' کی دسویں نشست کا انعقاد ہوا۔ مفتی ہمدم نے اسلوب کے مقاصد اور پروگرام کے ایجنڈوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ایک شعری و ادبی تنظیم ہے، جس کے اہم ترین مقاصد ہیں۔ اردو کی ترویج واشاعت، بامقصد وصحت منداد ب کی حوصلہ افزائی اور گمنام ادبا وشعرا اور ان کے کاموں کو آگے لانا اور آج کی نشست کے دو ادوار ہوں گے۔ پہلا دور اسلوب کی توسیع اوراس کے کاموں کی شفافیت کے لیے رجسٹریشن پر غور نیز ارریہ سے نکلنے والے سہ ماہی دینی وادبی رسالہ 'چشمۂ رحمت' ارریہ کے اجرائے نو کے سلسلے میں اور دوسرا دور شعری وادبی نشست کا ہوگا، اس تمہیدی گفتگو کے بعد نشست کے مشاورتی حصے میں شرکا نے دلچسپی سے مشورے پیش کیے اور امیر مجلس کے فیصلے سے جو امور طے ہوئے ان کے اہم نکات یہ ہیں۔ فی الحال نشست میں موجود تمام افراد کو اسلوب کا ممبر بنالیا جائے۔ ایک دستورالعمل طے ہو۔ رجسٹریشن کی باڈی متعین کی جائے اور آئندہ رسالہ چشمۂ رحمت کو اسلوب کے تحت شائع کیا جائے۔ اس لیے اسلوب کے تمام ممبران مالیات فراہمی کی کوشش کریں گے، اس کے علاوہ رسالے کے مدیر اعلیٰ حسب سابق مفتی حسین احمد ہمدم رہیں گے جب کہ نائب مدیر مولانا ارشد علیگ قاسمی اور معاون مدیر قاضی عتیق اللہ رحمانی ہوں گے۔ نشست کے دوسرے دور میں صام احمد معروفی، خطیب حیدر، خورشید قمر، ارشد ہمراز، عنایت وصی اور مفتی حسین احمد ہمدم نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔ اس موقعے پر مذکورہ حضرات کے علاوہ بزرگ شاعر فرمان علی فرمان، قاری مزمل حسین، محمد آزاد، سیف الوری اور محمد خالد صبا وغیرہ بھی موجود تھے۔ آخر میں مفتی حسین ہمدم نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' بہار 28 جون 2023

عبدالرحمٰن بجنوری کے یوم پیدائش پر نشست

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگلپور کے زیراہتمام معظم چک میں ڈاکٹر عمارہ خاتون کی رہائش گاہ پر شاعر مظہر مجاہدی کی صدارت میں عبدالرحمٰن بجنوری کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری اردو ادب کی ایک ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، تنقید نگار، مکتوب نگار اور ماہر تعلیمات تھے۔ وہ بنیادی طور پر تنقید نگار تھے۔ انھوں نے محاسن کلام غالب لکھ کر اپنا ایک لاثانی مقام بنالیا۔ ان کی تنقید جمالیاتی تنقید کا اچھا نمونہ ہے اور محاسن کلام غالب تقابلی تنقید کی بہترین مثال ہے۔ ان کا اصل نام عبدالرحمٰن تھا اور قلمی نام عبدالرحمٰن بجنوری۔ 10 جون 1885 کو سیوہارہ، ضلع بجنور، یوپی میں پیدا ہوئے اور وفات 7 نومبر 1918 کو ہوئی۔ والد کا نام خان بہادر نورالاسلام، والدہ کا نام آمنہ خاتون اور اہلیہ کا نام جمیلہ بیگم تھا۔ انھوں نے 1902 میں کوئٹہ سے ہائی اسکول پاس کیا، 1904 میں انٹر، 1906 میں بی اے کیا۔ 1909 میں انھوں نے علی گڑھ سے ایل ایل بی کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ اور جرمنی گئے۔ کچھ سال انھوں نے وکالت بھی کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ان کے مخلصانہ مراسم تھے۔ ان کی ادبی زندگی گیارہ بارہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ ان کی تصانیف میں محاسن کلام غالب، باقیات بجنوری وغیرہ ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں مقدس وید اور دیوان غالب۔ اس موقعے پر مظہر مجاہدی نے کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری اردو ناقدین میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ نشست میں شامل محمد بلال الدین، محمد تاج الدین، ڈاکٹر عمارہ خاتون، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے حیات وفن پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جون 2023

مہاراشٹر

انگریزی ومراٹھی میڈیم طلبہ کے لیے اردو کریش کورس

سولاپور: اردو ایک زندہ زبان ہے اور یہ دنیا کی معیاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ تاریخی ثبوت کی بنا پر ملک کی تعمیر وترقی میں اردو زبان وادب کا اہم کردار رہا ہے۔ اس بات کا اظہار پروفیسر اسما خان نے کیا۔ پروفیسر اسما خان خادمان اردو فورم کے زیراہتمام انگریزی اور مراٹھی میڈیم کے طلبہ کے لیے سرگرمیوں کی تعطیلات میں 40 روزہ اردو کلاس کے کریش کورس کے اختتامی اور تقسیم اسناد پروگرام میں اپنے تاثرات پیش کررہی تھیں۔ انھوں نے خادمان اردو فورم کے اس اقدام کی بھرپور تائید کی اور کہا کہ اردو کی ترقی واشاعت کے لیے جو بنیادی قدم اٹھایا گیا ہے، سبھوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیے کیونکہ یہ صرف زبان نہیں اس میں ہماری تہذیب وثقافت مضمر ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ دو سالوں سے خادمان اردو فورم سولاپور گرمیوں کی تعطیلات میں غیراردو میڈیم طلبہ کے لیے مفت اردو کلاسز کا انعقاد کرتا ہے۔ اس سال 15 طلبہ کو داخلہ دیا گیا۔ یہ پروگرام نامور تاجر اور سماجی خدمت گار ناصر خلیفہ کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ بعد ازاں فورم کے ڈائرکٹر انور کمشنر نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور فورم کی طرف سے پرتپاک استقبال کیا۔ فورم کے صدر وقار احمد شیخ نے اغراض ومقاصد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی اور مراٹھی میڈیم کے طلبہ کو گرمی کی تعطیلات میں پچھلے دو سالوں سے اردو سکھائی جارہی ہے۔ فورم سات سالوں سے تعمیری پروگراموں کے ذریعے سال بھر اردو کی بقا وترقی کی کوشش کررہا ہے۔ غیراردو داں طلبہ کو اردو سکھانے کا یہ ایک منفرد اقدام ہے۔ اس سے ہماری تہذیب بھی زندہ رہے گی اور طلبہ کی ہمہ جہت ترقی میں مدد بھی ملے گی۔ اردو کے ماہر استاد اور کاتب محترم عرفان کاریگر جنھوں نے انگریزی اور مراٹھی میڈیم کے طلبہ کو 40 دنوں میں بہترین انداز میں اردو سکھایا۔ اس کلاس کی جامع انداز میں رپورٹ پیش کی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے محترم ناصر خلیفہ نے کہا کہ خادمان اردو فورم پچھلے کئی سالوں سے مسلسل اپنے مختلف تعمیری پروگراموں کے ذریعے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ قابل ستائش ہیں۔ غیراردو داں طلبہ کو اردو سکھانے کی کوشش ہماری قوم کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جون 2023

اعزاز و اکرام

بینک آف بڑودہ راشٹر بھاشا سمان 2023

نئی دھلی: اردو ناول 'اللہ میاں کا کارخانہ' کے مصنف محسن خان اوراس کے ہندی کے مترجم سعید احمد کو بینک آف بڑودہ نے بینک آف بڑودہ راشٹر بھاشا سمان 2023 ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ وہ یہ انعام جیتنے والے سال اول

کے فاتح بن گئے۔ فاتحین کا اعلان دہلی میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ پانچ ناول ابھی

پریت کال (اڑیہ، اجے کمار پٹنائک)، چینی کوٹھی (اردو، صدیق عالم، مترجم: ارجمند آرا)، گھر پالنو چھیلے (بنگلہ، منورنجن ویاپاری، مترجم: امریتا بیرا)، ندیشٹ (مراٹھی، منوج بور گاؤکر، مترجم: گورکھ تھوراٹ) اور نعمت خانہ (اردو، خالد جاوید، مترجم: زمان طارق) کو اس سال کے رنرأپ ایوارڈز ملے۔ اردو ناول 'اللہ میاں کا کارخانہ' کے فاتح محسن خان اور ہندی کے مترجم سعید احمد کو بینک آف بڑودہ راشٹریہ بھاشا سمان اور بالترتیب 21 لاکھ روپے و 15 لاکھ روپے اعزازیہ دیا گیا۔ دوسرے پانچ رنرأپ مصنفین اور متعلقہ ہندی مترجمین میں سے ہر ایک کو بالترتیب 3 لاکھ اور 2 لاکھ روپے سے نوازا گیا۔ پانچ رکنی ایوارڈ جیوری کی سربراہی نامور مصنفہ اور بین الاقوامی بوکر پرائز فاتح محترمہ گیتانجلی شری کررہی تھیں اور جیوری کے دیگر ارکین کے ساتھ معروف ہندوستانی شاعر شری ارون کمل، ماہر تعلیم اور نقاد شری پشپیش پنت، شاعرہ اور ناول نگار محترمہ انامیکا اور ہندی افسانہ نگار اور مترجم پربھات رنجن نے ایوارڈ کے لیے درج ذیل 6 نامزد کتابوں میں سے فاتح کا انتخاب کیا۔ خیال رہے کہ بینک آف بڑودہ ہندوستان کے سرکردہ پبلک سیکٹر بینکوں میں سے ایک ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 جون 2023

ساہتیہ اکادمی کے 'بال ساہتیہ پرسکار' اور 'یووا پرسکار' 2023 کا اعلان

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک کی صدارت میں نئی دہلی میں ساہتیہ اکادمی کی ایکزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ ہوئی جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کے 'بال ساہتیہ پرسکار' اور 'یووا پرسکار' 2023 کے لیے کتابوں

کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں 'بال ساہتیہ پرسکار' کے لیے ادب اطفال کے معروف ادیب و شاعر متین اچل پوری (بعد از مرگ) کی کتاب 'ممتا کی ڈور' جب کہ 'یووا پرسکار' کے لیے جواں سال ادیب توصیف بریلوی کی کتاب 'ذہن زاد' کا انتخاب عمل میں آیا۔ 'بال ساہتیہ پرسکار' کے لیے اس سال یکم جنوری 2017 سے 31 دسمبر 2021 کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی کتابیں زیر غور آئیں۔ جیوری ممبران میں عازم گروندر سنگھ کوہلی، اسلم جمشید پوری، فریاد آزر شامل تھے جب کہ جیوری کی صدارت کنوینز، اردو مشاورتی بورڈ جناب چندر بھان خیال نے کی۔ یہ ایوارڈ ساہتیہ اکادمی کے امتیازی نشان اور 50 ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ 'یووا پرسکار' ان کتابوں پر دیے گئے ہیں جن کے لکھنے والوں کی عمر یکم جنوری 2023 کو 35 سال یا اس سے کم ہے۔ یہ ایوارڈ بھی پچاس ہزار روپے اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ جیوری ممبران میں کوثر صدیقی، محمد خلیل اور سید جمال شبیر رضوی شامل تھے، جب کہ صدارت چندر بھان خیال نے کی۔ انعامات ساہتیہ اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں دیے جائیں گے۔ 'بال ساہتیہ پرسکار' کے دوسرے انعام یافتگان میں سوریہ ناتھ سنگھ (ہندی)، سدھا رموورتی (انگریزی)، گرمت کریالوی (پنجابی)، کرن بادل (راجستھانی)، بلونت سنگھ جموریا (ڈوگری) شامل ہیں۔ کشمیری زبان میں اس سال 'بال ساہتیہ پرسکار' کے لیے کسی کا انتخاب عمل میں نہیں آیا جب کہ منی پوری کے انعام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ 'یووا پرسکار' کے دیگر انعام یافتگان میں نگہت نصرین (کشمیری)، اتل کمار رائے (ہندی)، انیردھ کنی شیٹی (انگریزی)، دھیرج بسمل (ڈوگری)، حمیرالدین مدیا (بنگالی)، ساگر شاہ (گجراتی)، سندیپ (پنجابی)، دیوی لال ماہیا (راجستھانی)، نینا ادھیکاری (نیپالی) وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ اخبار مشرق 24 جون 2023

راجیش آنند اسیر

دیوبند: حکومت اتراکھنڈ نے پروفیسر عنوان چشتی کی ادبی، لسانی، علمی، محققانہ، سماجی اور قومی خدمات کے اعتراف میں صوبہ کا سب سے بڑا اردو ایوارڈ 'پروفیسر عنوان چشتی اردو ایوارڈ' کے نام سے سند مع ایک لاکھ روپے نقد جواں سال شاعر جناب راجیش آنند اسیر کو ان کی علمی اور ادبی استعداد کے پیش نظر وزیر اعلیٰ شری پشکر سنگھ دھامی نے عطا کیے۔ راجیش آنند اسیر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی کے نام سے معنون یہ اردو ایوارڈ محبان اردو کے لیے مژدۂ مسرت ہے۔ اس موقع پر اظہار رائے کرنے والوں میں بڑی تعداد میں اردو ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور سجادگان، صوفیا اور سادھو سنت شامل تھے۔

واضح رہے کہ پروفیسر عنوان چشتی کا تعلق قصبہ منگلور ضلع ہری دوار سے تھا۔ پروفیسر عنوان چشتی اردو ادب کی کثیر الجہات شخصیت کے ساتھ ساتھ شاعر، نقاد، محقق، انشاپرداز، خاکہ نگار، صاحب طرز، نثر نگار، مفسر، تصوف اور ممتاز مقرر بھی تھے، آپ نے کئی درجن کتابیں تصنیف کیں، سیکڑوں مقالے تحریر کیے، اور متعدد ممالک کے علمی دورے اور اسفار بھی کیے، پروفیسر عنوان چشتی کے فکر و فن پر ایک درجن سے زائد افراد نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اس کے علاوہ ان کی شخصیت اور خدمات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 جولائی 2023

تنظیم فروغ اردو میوات

نوح، میوات: علاقہ میوات میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کو لے کر گذشتہ ڈھائی سال سے کوشاں 'تنظیم فروغ اردو میوات' کو اس کی شاندار کارکردگی کے لیے گذشتہ روز صوبہ راجستھان کے ضلع الور میں 'اردو زبان کی ترقی و بقا' کے عنوان سے قومی اردو شکشک کرمچاری سنگھ راجستھان کے زیراہتمام منعقد صوبائی سطحی یک روزہ سیمنار میں اعزاز سے نوازا گیا۔ تنظیم کو اس کی شاندار کارکردگی کے لیے قومی اردو شکشک کرمچاری سنگھ کی جانب سے پیش کیے گئے اعزاز سے کارکنان تنظیم و علاقہ کے محبین اردو میں خوشی کا ماحول ہے۔ اردو ٹیچر ونگھ کے صوبہ راجستھان کے جنرل سکریٹری ساہون محمد کانپوری نے کہا کہ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تنظیم نے گذشتہ سالوں میں جو اردو کے فروغ کے لیے کام کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج صوبہ ہریانہ میں 121 ٹی جی ٹی اردو اساتذہ کی مستقل تقرری چل رہی ہے وہ تنظیم کی کاوشوں و محنت کا ہی نتیجہ ہے۔ تنظیم کے کاموں کو سراہتے ہوئے مورخ صدیق احمد میو نے کہا کہ تنظیم کے کارکنان نے جو ایم آئی ایس پورٹل پر اردو زبان کو طلبا کے لیے بطور تیسری زبان کے اَپ ڈیٹ کرانے میں شب و روز جدوجہد کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ممتاز عالم دین مولانا محمد خالد قاسمی نے کہا کہ تنظیم اس اعزاز کی مستحق تھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان جس کا جنگ آزادی میں اہم کردار رہا ہے وہ خطہ میوات میں صرف مکتب و مدارس تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس خلوص و محنت کے ساتھ محبین اردو علاقے میں کام کر رہے ہیں اس سے لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میوات کے سبھی سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری ہوگی اور سرکاری سطح پر اس کو اس کا واجب حق ملے گا۔ واضح رہے کہ مذکورہ ایوارڈ ڈاکٹر حسین رضا خاں چیئرمین راجستھان اردو اکادمی، چودھری واصل علی گوجر صدر قومی اردو شکشک کرمچاری سنگھ و صوبائی صدر محترمہ ڈاکٹر سیما بھاٹی کے ہاتھوں تنظیم کے سرپرست ماسٹر اشرف میواتی و صدر محترم مولانا محمد صدیق سنابلی گورنمنٹ لیکچرر کو دیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 جولائی 2023

پروفیسر شیخ عقیل احمد کو

'رہنمائے کاروانِ اردو' ایوارڈ

وانمباڑی: آج یہاں جنوبی ہند کے ممتاز علمی وثقافتی شہر وانمباڑی کی تاریخی دانشگاہ اسلامیہ کالج میں الکوثر طب نبوی ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام، ڈاکٹر شیخ اکبر کوثر کی صدارت میں جشن اردو واعزازی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کی خدمات کا خصوصی طور پر

اعتراف کیا گیا اور انھیں 'رہنمائے کاروان اردو' ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وانمباڑی اردو زبان کے فروغ اور اس سے محبت کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہا ہے۔ انھوں نے الکوثر طب نبوی ریسرچ فاؤنڈیشن کے اس اقدام کو تاریخی قرار دیتے ہوئے کہا کہ طب یونانی اور اردو زبان کا بہت قدیم اور مضبوط رشتہ ہے، طب یونانی کا تمام تر لٹریچر اور اس کی لفظیات واصطلاحات کا سارا ذخیرہ اردو میں ہی موجود ہے، اس طرح طب یونانی اردو کے لسانی وادبی فروغ میں بھی اہم رول ادا کر رہا ہے جس کا ہمیں ہر سطح پر اعتراف کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی کی اسی اہمیت کی وجہ سے قومی اردو کونسل میں باقاعدہ طب یونانی کا پینل ہے جس کے تحت مختلف موضوعات پر طب یونانی کی اہم کتابیں شائع کی جاتی ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم مستقبل قریب میں ایک پروجیکٹ کے طور پر ملک بھر میں پائے جانے والے طب یونانی کے نادر علمی و تحقیقی نمونوں کی دریافت واشاعت کا سلسلہ شروع کریں گے۔ انھوں نے اس اعزازی تقریب کے منتظمین خصوصاً اس کے سربراہ ڈاکٹر حکیم کوثر اکبر کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب کی شخصیت پر ان کے نام کے ہر جز کا مکمل اثر پایا جاتا ہے چنانچہ وہ حکیم بھی ہیں، صوفی بھی ہیں، اکبر بھی ہیں اور کوثر بھی ہیں، ان کے ذریعے مجھے یہ ایوارڈ ملنا جامِ کوثر سے کم نہیں ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ اس ایوارڈ کے حصول کے ساتھ ہی اردو زبان کی خدمت کے تئیں میری ذمے داری بڑھ گئی ہے اور آج میں یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کونسل کا ڈائرکٹر رہوں یا نہ رہوں فروغ اردو کی مخلصانہ کوششیں جاری رکھوں گا اور وانمباڑی سے فروغ اردو کا جو کارواں چلا ہے اسے منزل تک پہنچانے کی ہر تدبیر کروں گا۔

شیخ عقیل نے اس پروگرام کے انعقاد میں غیر معمولی تعاون پیش کرنے کے لیے اسلامیہ کالج کے تمام عہدے داران واراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس سال جنوری میں ہم نے اسی کالج میں وانمباڑی مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے اشتراک سے قومی اردو کونسل کا پچیسواں قومی اردو کتاب میلہ منعقد کیا تھا، جس میں کالج کے تمام اراکین و ذمے داران نے غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا اور میلے کو تاریخی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس شہر کو جنوبی ہند کا علی گڑھ کہا جاتا ہے، مجھے امید ہے کہ اپنی علمی و تعلیمی خصوصیات کی وجہ سے اسلامیہ کالج یہاں کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگا۔

قبل ازاں پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر ایم سعید الدین نے تعارفی خطاب کیا اور ڈاکٹر یاسر عرفات نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شیخ عقیل احمد کی شخصیت وخدمات کے تذکرے پر مشتمل کتابچے اور تمل ناڈو میں اردو زبان کی تاریخ و تجزیے پر مشتمل ایک خصوصی مجلّے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جبکہ پروفیسر عقیل کے لیے معروف شاعر عبید اعظم اعظمی کے ذریعے لکھا گیا منظوم سپاس نامہ جناب قیصر صاحب نے پڑھا۔

اس تقریب میں شیخ عقیل احمد کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد قاسمی مشیر برائے وزارت آیوش حکومت ہند کو حکیم اجمل خان ایوارڈ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالودود کو حکیم عبدالحمید ایوارڈ، جناب سی قیصر احمد کو چراغ اردو ایوارڈ، جناب سید اسد حسین کو ستارہ ہند ایوارڈ، جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشنل آفیسر قومی اردو کونسل) کو سفیر اردو ایوارڈ اور جناب منیر انجم (او ایس قومی اردو کونسل) کو محبِ اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر مختار احمد قاسمی و پروفیسر عبدالودود صاحبان نے بھی اظہار خیال کیا اور اعزازات کی پیش کش پر الکوثر فاؤنڈیشن اور پروگرام کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اردو زبان اور طب یونانی کے اٹوٹ رشتے کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے لیے جہاں ہندوستان کے اس قدیم طریقہ علاج کا تحفظ ضروری ہے وہیں اردو زبان کا تحفظ و فروغ بھی ضروری ہے اس لیے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔

ڈاکٹر شیخ اکبر کوثر نے اپنے صدارتی خطاب میں ایوارڈ حاصل کرنے والی تمام شخصیات کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے خصوصی طور پر پروفیسر شیخ عقیل احمد کی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا، اسی طرح ڈاکٹر مختار احمد قاسمی اور پروفیسر عبدالودود کی طب یونانی کے فروغ کے لیے کی جانے والی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہماری سرکار طب یونانی کے فروغ کے لیے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اس پر بہت بڑا بجٹ خرچ کیا جا رہا ہے، جو یقیناً قابل تعریف ہے مگر طب یونانی کا فروغ اردو کے بغیر نہیں ہوسکتا، کیوں کہ ملک کے تمام طبی کالجوں میں طب یونانی کی تعلیم اردو زبان میں ہی دی جاتی ہے، اس لیے ہماری مرکزی وریاستی سرکاروں کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا سے اعلیٰ سطح تک اردو کی باضابطہ تعلیم کا نظم ہونا چاہیے تاکہ طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انھوں نے کہا کہ وانمباڑی جنوبی ہند کا ایسا شہر ہے، جس کی قابل فخر ادبی وثقافتی تاریخ ہے، تعلیمی اعتبار سے بھی اس کی بڑی مستحکم شناخت رہی ہے، اکیسویں صدی میں پروفیسر شیخ عقیل احمد کی سربراہی میں قومی اردو کونسل نے اس شہر میں کتاب میلے کے انعقاد کے ساتھ فروغ اردو زبان کی ایک نئی تحریک شروع کی ہے، جسے آج کے اس تاریخی پروگرام کے ذریعے مزید توانائی حاصل ہوگی اور ہمیں امید قوی ہے کہ پروفیسر شیخ عقیل کی رہنمائی میں ہمارا اردو کارواں بے مثال کامیابیوں سے ہم کنار ہوگا۔

ڈاکٹر اشہر وحید کے اظہار تشکر کے ساتھ اس اعزازی تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اہل علم ودانش شریک رہے۔ اس پروگرام کے بعد دوسری محفل شام غزل کی منعقد ہوئی جس میں معروف غزل سنگر اتل بیلے نے سامعین کو اپنی گلوکاری سے محظوظ کیا۔

ڈاکٹر سیّد احمد خاں، محمد عارف اقبال اور حکیم عطاء الرحمٰن اجملی اعزاز سے سرفراز

نئی دھلی: ڈاکٹر سیّد احمد خاں (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، سی سی آر یو ایم، بھارت سرکار) کی اردو خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ طب یونانی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں اور گزشتہ 25 برسوں سے 'عالمی یوم اردو' کا انعقاد کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے دہلی میں قیام پذیر صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی جیسی حوصلہ افزائی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ یہ باتیں علمت لیٹین چیریٹیبل ٹرسٹ کی چیئرپرسن محترمہ خوشبو زیب نے دہلی کے دریا گنج میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (یوڈی او) کے دفتر میں منعقدہ ایک ایوارڈ تقریب کے موقع پر اپنے ٹیلی-فونک بیان میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں سید احمد خان کو پہلا زبیر رضوی نیشنل ایوارڈ دے کر فخر کا احساس ہورہا ہے۔ محمد عارف اقبال نے پچھلے پچیس برسوں سے 'اردو بک ریویو' جیسا معیاری رسالہ نامساعد حالات کے باوجود جاری رکھا ہے یہ اردو سے ان کی محبت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے اپنی سماجی و طبی خدمات سے ہزاروں افراد کو مستفید کیا ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں آج ہمیں سند اعزاز دیتے ہوئے مسرت کا احساس ہورہا ہے۔

اس موقعے پر معروف ادیب اور صحافی جناب حقانی القاسمی نے کہا کہ سید صاحب، محمد عارف اقبال اور اجملی صاحبان کی کوششوں سے اردو زبان و ادب کو توانائی اور تقویت ملی ہے۔ ان کی کوششوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ دربھنگہ سے تشریف لائے ڈاکٹر عبدالحی نے سید احمد خان، عارف اقبال اور حکیم اجملی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سید احمد خان اردو زبان کے فرہاد ہیں۔ عارف اقبال صاحب اپنی بیماری کے بعد بھی نہیں تھکے اور 'اردو بک ریویو' جیسا انوکھا رسالہ نکال رہے ہیں۔

حکیم اجملی صاحب اپنی سماجی و طبی خدمات کے لیے جانے جاتے ہیں اور ان کا کام بھی لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے اس موقع پر ٹرسٹ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے اس ایوارڈ سے ایک نئی توانائی ملی ہے اور میں مزید بہتر کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ محمد عارف اقبال اور حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر اسرار احمد اُجینی، محمد عمران قنوجی، ندیم عارف اور دیگر حضرات موجود تھے۔ سبھی نے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: محمد عمران قنوجی، پریس رکریٹری، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن،
نئی دہلی، 23 جون 2023

عالمی نامہ

جشن ہندوستان

دبئی: یہاں انڈین قونصلیٹ دبئی اور ٹیکس اوینٹس دبئی کے اشتراک سے شیخ راشد آڈیٹوریم میں 'جشن ہندوستان' کا انعقاد کیا گیا۔ اس جشن میں ہزاروں کی تعداد میں دبئی میں رہنے والے ہندوستانیوں نے شرکت کی۔ آزادی کے 75 ویں امرت مہوتسو کے موقعے پر ایک عالمی مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا، جس میں ہندوستان، پاکستان، یواے ای اور مصر کے شعرا نے شرکت کی۔ اس موقعے پر واسوصراف چیرمین ڈی پی ایس اور انڈین ہائی اسکول دبئی کو ان کے تعلیمی فروغ کے لیے بیگم امیر حیدر ایوارڈ فار ایجوکیشن 2023 سے نوازا گیا، جب کہ سینئر صحافی بابی نقوی کو صحافت میں ان کی اہم کارکردگی کے لیے 'عظمٰی حیدر ایوارڈ فار جرنلزم 2023' سے نوازا گیا۔ مہمان خصوصی امن پوری قونصلیٹ انڈیا نے کہا کہ مشاعرہ ایک ادبی اور شعری تربیت گاہ ہے، اس سے صرف شاعری کی فہم ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سلیقہ مندی بھی آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ آج کل لوگوں کے پاس اچھی اردو سننے اور سیکھنے کا وقت نہیں ہے، ایسے ماحول میں چند گھنٹوں کے لیے منعقد مشاعرے اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ذہنی سکون کا بھی ذریعہ بنتے ہیں۔ دبئی کے شیخ راشد آڈیٹوریم میں منعقدہ عالمی مشاعرہ 'جشن ہندوستان' میں دنیائے اردو کے جن شعرا و شاعرات کو مدعو کیا گیا ان میں صدر مشاعرہ منظر بھوپالی (ہندوستان)، عباس تابش (پاکستان)، اقبال اشہر (ہندوستان)، جوہر کانپوری (ہندوستان)، قیصر وجدی (پاکستان)، محترمہ شبینہ ادیب (ہندوستان)، محشر آفریدی (ہندوستان)، عرفان اظہار (دبئی)، محترمہ ولا جمال (مصر)، امان حیدر (ہندوستان) کے نام قابل ذکر ہیں۔ تمام شعرا کے کلام کو بہت پسند کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جون 2023

رسم اجرا

کلیات نسیم

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں یوگیندر اپادھیائے نسیم گورکھپوری کی کلیات نسیم کے اردو ایڈیشن کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے نسیم گورکھپوری کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ نسیم گورکھپوری کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ ساحر لدھیانوی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ نسیم گورکھپوری کا بچپن آزادی کی جدوجہد کے سائے میں گزرا، ان کا خاندان مذہبی تھا۔ ایک دوسرے سے پیار اور عزت کرنا ان کی خاندانی وراثت تھی۔ نسیم گورکھپوری نے انسانیت کو اپنا مذہب بنایا۔ کلیات نسیم میں ان کا مکمل کلام ہے جس میں نظم، گیت، قطعات وغیرہ ہیں۔ چاروں مجموعوں کے علاوہ بھی کلیات میں نیا کلام شامل ہے۔ اس موقعے پر فاروق ارگلی نے کہا کہ ان کے یہاں کلاسیکل رنگ ہے۔ وہ انسانی قدروں پر یقین رکھنے والے ہیں۔ انھوں نے شعری روایتوں میں استعارہ کا استعمال کیا ہے۔ شاداب تبسم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی روح ہندوستان میں رہتی ہے، گیت کا سر بہت مدھر ہے۔ اس موقعے پر دو یا جین نے مبارک باد پیش کی اور کہا کہ نسیم گورکھپوری صاحب کی پچھلے سال رومن اور ہندی میں کلیات آئی تھی، کلیات نسیم اردو رسم الخط میں ہے۔ نسیم گورکھپوری صاحب کی خواہش تھی کہ جب تک یہ کلیات اردو میں نہ آئے اس کو مکمل نہیں مانا جائے۔ نسیم گورکھپوری نے اس موقعے پر کہا کہ شاعری روح سے آتی ہے دماغ سے نہیں۔ اس کا تعلق شاعر کے تخیل سے ہے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شاعری بڑی چیز ہے۔ نسیم گورکھپوری کا لب ولہجہ الگ ہے۔ ان کی شاعری پر ہندی کا اثر بہت ہے۔ اس موقعے پر متین امروہوی نے ایک نظم پیش کی اور موجودہ شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 جون 2023

دیوان شہاب انور

امروھہ: تحریک مساوات کی جانب سے آر ایس ریسورٹس میں 'دیوانِ شہاب انور' کی رسم اجرا کی تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت مشہور عالم دین مفتی محمد عفان منصور پوری نے کی۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مفتی محمد عفان منصور پوری و مہمان کے ہاتھوں دیوان شہاب انور کا اجرا کیا گیا جس کے بعد سبھی نے شہاب انور کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کہا کہ شہاب انور نے ہمیشہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو اہمیت دے کر اس کا ازالہ نہایت فنکارانہ چابکدستی اور دانشمندی سے کیا ہے۔ جس

کے نتیجے میں ان کا دیوان آج منظر عام پر آگیا ہے۔ ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی نے کہا کہ دیوان شاعر کے اس شعری مجموعہ کو کہا جاتا ہے جس میں شاعر حروفِ تہجی کے ہر حرف کو ردیف بنا کر شعر کہتا ہے۔ شہاب انور ایک طویل عرصے کے بعد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس مردہ ومتروک ادبی سنت کی تجدید کی ہے۔ مفتی محمد عفان منصور پوری نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ شہاب انور کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔ دیوانِ شہاب انور اردو غزل میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ وہ شاعری میں غزل کی ایک انتہائی توانا آواز ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 جون 2023

تدریس نامہ

نئی دھلی: اکادمی برائے فروغِ استعداد اردو میڈیم اساتذہ کے جرنل 'تدریس نامہ' کے نویں شمارے کا اجرا کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہورہی ہے۔ تدریس نامہ کے مشمولات بیش بہا ہیں۔ میں اس رسالے کی اشاعت پر اکادمی کے تمام ذمے داران کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ان خیالات کا اظہار شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پدم شری پروفیسر نجمہ اختر نے اردو جرنل 'تدریس نامہ' کے اجرا کے موقع پر کیا۔ یہ جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یاسر عرفات ہال میں 22 جون 2023 کو منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر نجمہ اختر صاحبہ نے فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں اردو زبان وادب کا فروغ شامل ہے۔ جامعہ کے اساتذہ اور تمام ذمے داران کو اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو اساتذہ اکادمی کو اپنے دائرۂ کار میں وسعت لانے کی ضرورت ہے۔ اس اکادمی کا معاہدہ SCERT دہلی سے اکادمی کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لیے ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف صوبوں کے SCERT سے بھی اس ادارے کا معاہدہ ہو۔ ہماری نیک خواہشات اکادمی کے ساتھ ہیں۔ اس اکادمی کو تدریسی موضوعات سے متعلق ترجمے کے میدان میں بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر اکادمی کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے اکادمی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کے بنیادی مقاصد میں اردو میڈیم اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کو قوت بخشنا، تدریسی مواد فراہم کرنا، نصابی اور حوالہ جاتی کتابوں کو تیار کرنا ہے۔ 'تدریس نامہ' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ اکادمی اپنے بنیادی مقاصد پر پوری طرح کاربند ہے اور اپنی ذمے داریوں کو بہتر ڈھنگ سے انجام دے رہی ہے۔

واضح ہو کہ 'تدریس نامہ' کے اس شمارے میں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، داستان، ناول، افسانہ، خاکہ، ڈراما اور مرثیے کی تدریس کے تعلق سے مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کی تربیت، معلم کی شخصیت، مہارتِ ترسیل وابلاغ کے فروغ کا طریقۂ کار، زبان کی تدریس میں لغات کا کردار، اسکولی سطح پر زبان کی تدریس کے مسائل، شعری متن کی تدریس، نثری متن کی تدریس، غیر ملکی طلبا کو اردو زبان کی تدریس وغیرہ موضوعات پر ماہرینِ ادب وتعلیم کے مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس جلسے کی نظامت اکادمی کے استاد اور معروف شاعر واحد نظیر نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ اخیر میں اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر صاحبہ اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: پروفیسر شہزاد انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 22 جون 2023

اردو شاعری کا معاصر منظرنامہ

نئی دھلی: اردو شاعری نہ صرف احساسات بلکہ اپنے وقت کے مسائل بیان کرنے میں بھی کامیاب رہی ہے۔ آج بھی اردو شاعری کا مزاحمتی تیور برقرار ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن نے آصف اعظمی کی نئی کتاب 'اردو شاعری کا معاصر منظرنامہ' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ آئیڈیا کمیونی کیشنز اور اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس (آئی جی این سی اے) کے اشتراک سے منعقد اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ آصف اعظمی نے معاصر شعری منظرنامے کا تحریری دستاویز پیش کیا ہے، جس کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ پروگرام کی صدارت آئی جی این سی اے کے صدر رام بہادر رائے نے کی، جب کہ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے گنیشور کمار (آئی اے ایس)، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر خالد محمود اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے مشہور نیوز اینکر سلمیٰ سلطان اور رما پانڈے نے شرکت کی۔ مہمانوں کا استقبال آئیڈیا کمیونی کیشنز کے وائس چیئرمین دھرمیندر پرکاش (آئی ایف ایس) نے کیا اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے ادا کیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں رام بہادر رائے نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اردو اور ہندی کے درمیان نزاع کو چھوڑ کر ربط وتعاون کے فروغ کی کوشش کی جائے، یہ بہت اچھی بات ہے کہ اردو شاعری عشق ومحبت کے بیان کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین اور گلوبلائزیشن کے مسائل کو بھی بیان کررہی ہے، آصف اعظمی کی یہ کتاب اردو شاعری کا نیا رخ پیش کررہی ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اس کتاب کو ہندی میں ترجمہ کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آصف اعظمی کی یہ کتاب ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر، خلیجی ممالک اور امریکہ اور یورپین ممالک میں اردو شاعری اور اس کے فروغ کے لیے جاری کوششوں کا احاطہ کرتی ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ میں اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی کے تجربے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہ کتاب مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع دے رہی ہے۔ آصف اعظمی نے بہت ہی مخلصانہ کوششوں سے اردو شاعری کے معاصر منظرنامے کو معیاری اور معتبر انداز میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ صاحب کتاب نے اپنے خطاب میں کہا کہ شاعری جدت طرازی کا نام ہے، شعرا، ادبا اور اسکالرز کو اپنی بات سنانے سے زیادہ دوسروں کو سننے، سمجھنے اور مطالعہ سے رشتہ مضبوط رکھنے اور اچھی شاعری پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ کتاب اردو شاعری کے معاصر منظرنامے پر پہلی کتاب ہے، آخری نہیں۔ اس کتاب سے اسکالرز کو مزید تحقیق کی تحریک ملنی چاہیے۔ اس کتاب میں ابوہریرہ کے ذریعے ترتیب دیا گیا تقریباً 1200 اہم معاصر شاعروں کا اشاریہ، اور دنیا بھر میں اردو شاعری کے فروغ کے لیے کام کرنے والے اداروں کا تعارف بھی کافی اہم ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جون 2023

مسلمان فلسفی اور سائنسداں

حیدرآباد: ڈاکٹر عبدالقیوم، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ نظم ونسق عامہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی کتاب 'مسلمان فلسفی اور سائنس داں جنھوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی' کی رسم اجرا پروفیسر شگفتہ شاہین، او ایس ڈی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انھوں نے کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالی اور اردو کی علمی کتابوں کی تصنیف کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقیوم کی خدمات کی ستائش کی۔ پروفیسر فریدہ صدیقی، ڈین اسکول برائے فنون وسماجی علوم نے صدارت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں انگریزی مواد کی اردو میں منتقلی پر مصنف کو مبارکباد دی۔ پروفیسر کنیز زہرہ، صدر شعبۂ نظم ونسق عامہ نے خیرمقدم کیا۔ پروفیسر فہیم اختر، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے تبصرہ پیش کیا اور کتاب کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 جون 2023

تمثیل ادراک

بارہ بنکی: بزم افقر کی ماہانہ طرحی نشست صدر بزم رہبر تابانی دریابادی کی صدارت اور صغیر نوری کی نظامت میں ہوئی۔ مہمان خصوصی کے طور پر محسن ادب ڈاکٹر ایس ایم حیدر جب کہ مہمان ذی وقار کے طور پر سماجی کارکن طارق جیلانی اور سلیم صدیقی شریک رہے۔ نشست کے مہمان اعزازی ادبی حوالے سے نہایت ہی زرخیز ضلع مئوناتھ بھنجن کے خوش فکر اور نوجوان سال شاعر عمران ساغر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ان کی نظموں کے مجموعہ 'تمثیل ادراک' کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ عمران ساغر کے شعری اور ادبی سفر کی مفصل روداد پیش کرتے ہوئے شاعر نقاد ادیب اور صحافی امیر حمزہ اعظمی نے کہا کہ عمران کی غزلوں کا مجموعہ 'تمہید تمنا' بھی شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ کم عمری میں ان کا تیسرا مجموعہ کلام طباعتی مراحل میں ہے۔ عمران جس گہرائی، گیرائی اور جس ذوق وشوق کے ساتھ شعری سفر پر رواں دواں ہیں عنقریب ادبی دنیا ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانے گی۔ آخر میں بزم کے جنرل سکریٹری ارشاد بارہ بنکوی نے کلمات تشکر ادا کیے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 جولائی 2023

گلنار

جلال پور، امبیڈکر نگر: ادب شالہ انوار جلال پوری اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن جلال پور کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کے مالی تعاون سے مصنف فیروز جلال پوری کے افسانوں کا مجموعہ 'گلنار' کی رسم اجرا و افتتاح بدست ڈاکٹر حاجی محبوب عالم جلال پوری سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو ترلوک ناتھ پی جی کالج ٹانڈہ مدرسہ فیضان عزیزی قاضی پورہ جلال پور کے وسیع ہال میں شاعر وادیب زاہد جلال پوری کی صدارت اور ڈاکٹر ذیشان حیدر کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ پروگرام میں آستوش سنگھ سینی، اکمل جلال پوری، تنویر جلال پوری، شاہکار عالم، شوق اشرفی، محمد حمزہ کا خصوصی تعاون رہا۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی پروفیسر سید شفیق اشرفی، سماجی کارکن دھرم ویر سنگھ بگا، فخر عالم خان نے شرکت کی جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر پیرزادہ سید فیضان اشرف ایڈووکیٹ، محمد ظفر سا، محمد شہزاد کے علاوہ مہمان ذی وقار کے طور پر شمسی قریشی، مولانا حبیب الرحمٰن نوری، شاعر فراق جلال پوری، مولانا جعفر رضا جوہری، شاعر ساجد جلال پوری، پروفیسر محمد راشد ربانی، مولانا محمد عباس وغیرہ نے پروگرام میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، یکم جولائی 2023

جیسا دیکھا، سنا اور پایا

پونہ: (خواجہ کوثر حیات، اورنگ آباد (دکن)) عابدہ انعامدار سینئر کالج، شعبۂ اردو، اعظم کیمپس، پونہ کی سابق صدر شعبہ اردو اور دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم سبحانی

کی کتاب 'شمیم طارق جیسا دیکھا، سنا اور پایا' کا اجرا بتاریخ 24 جون 2023 پروفیسر آفتاب عالم آفاقی صدر شعبہ، ہندو بنارس یونیورسٹی، وارانسی کی صدارت میں بمقام اے کے خان لا کالج، اعظم کیمپس بوقت 10:30 بجے صبح منعقد ہوا۔

بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر گل رعنا، حیدرآباد اور ڈاکٹر وحیدہ شیخ موجود تھیں۔ ڈاکٹر عظمت دلال نے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی صاحب کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر پروفیسر ابراہیم صاحب (اعظم کیمپس) نے شمیم طارق صاحب کا تعارف پیش کیا۔ شاعر وادیب جناب رفیق جعفر، معروف شاعر اسلم چشتی صاحب نے مقالہ جات میں شمیم طارق صاحب کی شخصیت ان کے فن اور ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم کی کتاب پر پرمغز گفتگو کی۔

شعبہ اردو عابدہ انعام دار سینئر کالج پونہ کی جانب سے ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم کا استقبال کیا گیا۔ شمیم طارق صاحب کی جانب سے کوثر حیات نے ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم سبحانی کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم نے اپنے اظہار خیال میں صدر جلسہ اور شرکا کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی شمیم طارق صاحب کی عملی زندگی کو ان کی تحریروں میں عکاسی کو اپنی کتاب کا محرک بتایا۔ ڈاکٹر گل رعنا، صدر شعبہ اردو، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد نے ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم کی پہلی کاوش کو کتابی شکل میں لانے پر مبارکباد پیش کی اور شمیم طارق صاحب کی فنی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے ان کے چند خوبصورت اشعار پیش کیے۔

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبہ اردو، بنارس ہندو بنارس یونیورسٹی، وارانسی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ 'شمیم طارق جیسا دیکھا سنا اور پایا' ایک مونوگراف ہے۔ مونوگراف کسی شخصیت کا ایک مختصر جائزہ ہوتا ہے، اور اس سے اس شخصیت کے متعلق مزید تحقیق کرنے پر ابھارتا ہے۔ شمیم طارق صاحب بڑے ادیب، شاعر اور دانشور ہی نہیں بڑے انسان بھی ہیں۔ شمیم طارق کی یہ سوانح پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حالات ناموافق ہوں تو بھی شمیم طارق بنا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر شمیم طارق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کتاب کی مرتبہ وسامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عظمت دلال نے کی۔ اس تقریب میں خصوصاً عابدہ انعامدار سینئر کالج کے تمام اساتذہ، طلبہ و طالبات کثیر تعداد میں شریک تھے۔

پریس ریلیز: عظمیٰ تسنیم، پونے، مہاراشٹر، 6 جولائی 2023

وفیات

پروفیسر امتیاز احمد

نئی دہلی: مشہور وممتاز ماہر سماجیات، جے این یو کے سابق پروفیسر کئی کتابوں کے مصنف پروفیسر امتیاز احمد 19 جون

کو داغ مفارقت دے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 83 سال تھی۔ 'ہندوستانی مسلمانوں میں طبقات اور سماجی درجہ بندی' ایسا موضوع تھا جس پر ان کی تصنیف کو اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں، جے این یو میں ان کے دور تدریس کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بہت سے طلبہ

بتاتے ہیں کہ انھوں نے جے این یو کی سرزمین پر امتیاز احمد کے بارے میں کافی کچھ سنا ہے جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں پروفیسر صاحب کے احترام میں اضافہ ہوا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد پروفیسر امتیاز احمد دہلی یونیورسٹی سے بحیثیت تحقیقی تجزیہ کار (ریسرچ اینالسٹ) وابستہ ہوگئے تھے اور پھر اسی یونیورسٹی میں سماجیات کے لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ 1972 میں جے این یو سے وابستگی سے قبل وہ یونیورسٹی آف میسور سے منسلک رہے۔ جے این یو ان کی اصل جولان گاہ ثابت ہوا جہاں انھوں نے تقریباً تین دہائی تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر امتیاز مسلمانوں کے بااختیار ہونے کی دشواریوں، اقلیتی حقوق اور مسلمانوں کی تعلیم جیسے موضوعات پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جون 2023

ڈاکٹر حسان نگرامی

لکھنؤ: یش بھارتی ایوارڈ یافتہ، سابق ڈپٹی ڈائرکٹر طب یونانی ڈاکٹر حسان نگرامی نے 8 جولائی کو داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ان کی عمر تقریباً 69 برس تھی۔ کینسر کے عارضے میں مبتلا ڈاکٹر حسان نگرامی گزشتہ کچھ مہینوں سے انتہائی علیل تھے۔

نووا ہسپتال گومتی نگر اور ریلیف ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ تھوڑا افاقہ ہونے پر وہ گھر آگئے تھے، لیکن پیٹ میں انفیکشن ہوجانے کے بعد سحر نرسنگ ہوم میں بھی زیر علاج رہے۔ ہفتے کو بعد نماز مغرب انھوں نے اپنی رہائش گاہ نزد پولیس چوکی مدح گنج، کھدرا میں آخری سانس لی۔ تدفین تکیہ تارن شاہ قبرستان میں ہوئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے نعمان رؤف، ڈاکٹر احسان رؤف، ڈاکٹر محسن رؤف اور دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر حسان نگرامی تقریباً 35 کتابوں کے مصنف تھے۔ طبی موضوعات پر تحقیقی اور دوسری زبانوں سے علوم طب کی کتابوں کے تراجم، مضامین و مقالات میں ان کی خاص دلچسپی رہی۔ موجودہ زمانے میں طب یونانی میں اردو میں جن لوگوں نے تصنیفی وتالیفی سلسلے کو آگے بڑھایا اور اس کی آبیاری کی ان میں حکیم سید محمد حسان نگرامی کا نام نمایاں ہے۔ اپنے علمی و تحقیقی سفر میں انھوں نے کتاب الجامع المفردات کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی تالیفات میں تاریخ طب، سرریات، یونانی میٹریا میڈیکا، یونانی ادویہ مرکبہ، علم القابلہ، تاریخ علم الادویہ، طب ماقبل بقراط تا جالینوس، طب تیرہویں تا پندرہویں صدی، طب نبوی کی دوائیں: ایک سائنٹفک جائزہ، اطباءِ قدیم کے دستیاب طبی مخطوطات سمیت طویل فہرست ہے۔ آخری دنوں میں سرجری پر 500 سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب لکھ رہے تھے جو کہ مکمل ہوچکی ہے۔ متعلقین ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر حسان کی یہ کتاب نایاب ثابت ہوگی۔ ان کی کتاب 'بھگوت گیتا کے بیتک سندیش' کافی مقبول ہوئی۔ وہیں کئی دیگر کتابیں بھی منظر عام پر آنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ڈپٹی ڈائرکٹر طب یونانی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت اترپردیش نے انھیں 17-2016 میں یش بھارتی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ انھیں کئی دیگر اہم ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔ حکیم سید حسان نگرامی نے 75 سے زائد قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں شرکت کی، ان کے 150 سے زائد مقالات شائع ہوچکے ہیں۔ عمر کے آخری دنوں میں بھی وہ ہربل کلینک اور ریسرچ سینٹر کے نام سے ایک مطب چلانے کے علاوہ دیگر علمی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ علاوہ ازیں، اردو ادبا و شعرا پر بھی انھوں نے متعدد مضامین لکھے۔ وہ نیشنل یونانی ڈاکٹرس ویلفیئر ایسوسی ایشن (نڈوا) کے قومی سرپرست ہونے کے ساتھ ہی کئی طبی اور ادبی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالغفار ندوی سوسائٹی کے تحت متعدد مذاکروں اور سیمناروں کا انعقاد کیا۔ حال ہی میں انھوں نے اپنے والد مولانا عبدالغفار ندوی کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع کیا تھا، جس کا اجرا پریس کلب میں ہوا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جولائی 2023

شاہنواز قریشی

لکھنؤ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، نیا دور کے سابق ایڈیٹر اور اترپردیش اردو اکادمی کے سابق سکریٹری شاہنواز قریشی کا جمعہ کی شب 23 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ کے بعد 24 جولائی ہفتہ کو صبح تقریباً ساڑھے 8 بجے کھجوا قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کی عمر تقریباً 75 برس تھی، پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم شاہنواز قریشی کا شمار شہر کے سینئر صحافی و ادیب و افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی حلقے میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ متعدد تنظیموں و اہم شخصیات نے تعزیت پیش کیا۔

شاہنواز قریشی کا ہارنیہ کا آپریشن ہوا تھا، افاقہ نہ ہونے پر ایک ہفتہ قبل ان کی آنتوں کا دوبارہ آپریشن ہوا، جس کے بعد سے وہ ونٹی لیٹر پر تھے۔ 23 کی شام ڈاکٹروں کے مشورے سے اہل خانہ بازار کھالا واقع رہائش گاہ پر لے آئے، جہاں تقریباً ساڑھے 9 بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ شاہنواز قریشی 1948 میں کولکاتا میں پیدا ہوئے۔ یہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1959 میں ان کے والدین لکھنؤ آگئے۔ شاہنواز قریشی نے آگے کی تعلیم یہیں سے حاصل کی۔ انھوں نے اپنا صحافتی سفر 1969 میں ہفت روزہ ندائے ملت سے شروع کیا۔ 1977 میں محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش کے انفارمیشن افسر کے طور پر اپنی خدمات شروع کیں اور ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ انھوں نے 2003 میں وی آر ایس لیتے ہوئے ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ انھوں نے 1995 سے 1997 تک اردو اکادمی کے سکریٹری کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں۔ اسٹیٹ الیکشن کمیشن اترپردیش میں ایڈوائزر کے طور پر کام کیا۔ اس دوران انھوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا، کئی اخبارات سے بھی وابستہ رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جون 2023

احمد حسن دانش

پورنیہ: شہر کی معروف شخصیت اور پورنیہ کالج کے سابق شعبہ اردو اور فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانش کا 10 جولائی کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ لائن بازار میں واقع ڈاکٹر نور اختر کے یہاں کولھے کے آپریشن

کے بعد جب گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنے گھر سجاد کالونی میں اچانک آخری سانس لی۔ 12 جولائی کو بعد نماز مغرب لائن بازار کے قبرستان میں تجہیز و تکفین کی گئی۔ جنازے کی نماز جامع مسجد کے خزانچی ہاٹ کے امام و خطیب مولانا وحید الزماں قاسمی نے پڑھائی۔ پروفیسر احمد حسن دانش مرحوم بھاگلپور ضلع کے نوگچھیا سب ڈویژن کے مکھا تکیہ گاؤں میں مولوی طیب علی کے گھر 13 ستمبر 1945 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ٹی این بی کالج بھاگلپور سے بی اے کیا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر شمیم احمد کی نگرانی میں 'بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ احمد حسن دانش نے ایل ایل بی اور بی ایڈ بھی کیا تھا۔ 1973 میں پورنیہ کالج میں لیکچرر ہوئے۔ بی این منڈل یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے۔ ان کی تصانیف بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا، مثنوی کا فن اور بہار کی معروف مثنویاں، بہار میں اردو مثنوی کی تاریخ و تنقید، سیمانچل میں اردو شاعری، جانچ پرکھ (تنقیدی مضامین)، پیکر سخن (شاعری)، شمع پگھلتی رہی (افسانوی مجموعہ)، سُر سریتا (کویتا سنگرہ)، یُگ یُگ دیپ جلے (کویتا سنگرہ)، پورنیہ کا ساہتیک بھوگول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر مرحوم کے پسماندگان میں پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے انتقال سے سیمانچل کا علاقہ سوگوار ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 'تاثیر' پٹنہ اور دیگر اخبارات سے

ناشاد اورنگ آبادی

پٹنہ: بہار کے معروف و مشہور شاعر ناشاد اورنگ آبادی کا 17 جون کی شام تقریباً 7 بجے پٹنہ کے ایک نجی اسپتال

میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً نوے سال کے تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور چار بیٹے ہیں۔ موصوف کچھ دنوں سے علیل تھے۔ ان کی تجہیز تدفین آبائی قبرستان انجھر شریف، ہسپورہ (اورنگ آباد) میں عمل میں آئی۔ ناشاد اورنگ آبادی اہم شخصیت کے مالک تھے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو کی طرح ہندی ادب سے بھی ان کا خاص لگاؤ تھا۔ ناشاد اورنگ آبادی کے انتقال پر سیاسی، سماجی، علمی، ادبی حلقوں کے سرکردہ افراد نے غم اور صدمے کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے انتقال سے بہار کے ادبی حلقہ میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا۔ وہ اکثر مشاعروں کی زینت ہوا کرتے تھے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ ان کا اصل نام محمد عین الحق خاں تھا ان کی پیدائش 15 جنوری 1935 میں اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ وہ ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں پرانی قدروں کی آمیزش تھی۔ ترنم میں وہ بہت اچھی شاعری کرتے تھے۔ ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

بہ حوالہ: قندیل ڈاٹ کام(https://qindeelonline.com)

مولانا محمد اسلام قاسمی

دیوبند: دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ حدیث اور اردو زبان وادب کے مستند ادیب وصحافی نیز عربی زبان وادب کی معروف شخصیت مولانا مفتی محمد اسلام قاسمی کا طویل علالت کے باعث 16 جون کو صبح ساڑھے آٹھ بجے محلّہ خانقاہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ مولانا محمد اسلام قاسمی گزشتہ تین سالوں سے متعدد پیچیدہ امراض میں مبتلا تھے۔ کئی مرتبہ فالج اور لقوہ کا بھی شکار ہوئے جس کے سبب ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔ متعدد امراض کی شدت کے باوجود انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کو ترک نہیں کیا۔ مولانا محمد اسلام قاسمی کا تعلق جھارکھنڈ کے ضلع جامتاڑا سے تھا، لیکن انھوں نے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر دیوبند میں سکونت اختیار کرلی۔ مولانا محمد اسلام قاسمی اردو زبان وادب کے علاوہ عربی زبان ادب کے بھی ماہر تھے۔ ان کے متعدد مضامین مختلف اردو اخبارات، رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ مولانا مرحوم دارالعلوم کے عربی رسالہ الداعی کے معاون مدیر رہے۔ دارالعلوم کے سابق مہتمم مولانا قاری محمد طیب سے ان کی خاص وابستگی تھی۔ عربی اور اردو میں ان کی درجن بھر تصانیف ہیں۔ ان کے انتقال پر بہت سے اہل علم نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم کی نماز جنازہ رات دس بجے دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مولسری میں ادا کی گئی اور تدفین قبرستان قاسمی میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب'، 17 جون 2023

خراج عقیدت

یادِ رشید قریشی

لکھنؤ: علامہ حبیب الرحمٰن خان میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن امین آباد میں ماہنامہ لاریب کے بانی و مدیر رشید قریشی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب کا انعقاد مراد آباد سے تشریف لائیں معروف ادیبہ وافسانہ نگار ڈاکٹر زیبا ناز کی صدارت میں کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی نیا دور کے سابق مدیر وصحافی شاہ نواز قریشی رہے۔ مہمان اعزازی کرامت حسین گرلس ڈگری کالج کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نزہت فاطمہ رہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زیبا ناز نے رشید قریشی کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ عصر حاضر کے مجاہد اردو تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت انجام دی۔ مہمان خصوصی معروف صحافی شاہ نواز قریشی نے رشید قریشی سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے رسالہ لاریب کو صرف اردو کی بے لوث خدمت کے جذبے سے نکالا جب کہ دوسری طرف ایسے بھی رسالوں کے مدیر ماضی میں گزرے ہیں، جنھوں نے اردو رسائل وجرائد کی آڑ میں خوب دولت کمائی مگر رشید نے بڑی جانفشانی اور محنت سے زندگی کی آخری سانس تک ماہنامہ لاریب کو جاری رکھا۔ باوجود مسلسل طبیعت کی ناسازی اور ضعف کے وہ لاریب کو صحت مند وتوانا چھوڑ گئے۔ مولانا فیروز خان ندوی نے کہا کہ رشید قریشی کے سانحہ ارتحال کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ماہنامہ لاریب کے استحکام و بقا کا ہے ہم اردو والوں کی ذمے داری ہے کہ زیادہ سے زیادہ رسالہ کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیں اور ہر شاعر ایک ممبر بنائے۔ معروف ناظم مشاعرہ واصف فاروقی نے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سب لوگ مل کر رسالہ کو آگے بڑھانے کا کام کریں۔ معروف ادیب پرویز ملک زادہ نے ہر طرح سے رسالے کے تعاون کی یقین دہانی کرائی اور کہا کہ یہ بات ہم سب اردو والوں کے لیے قابل غور ہے کہ جن حالات میں رشید قریشی نے رسالہ کو جاری رکھا، ہم لوگ مزید اس کو آگے بڑھانے کا کام کریں تاکہ رسالہ کو دوام واستحکام مل سکے۔ ڈاکٹر احتشام الحق خان نے ذاتی طور پر رسالہ کے ممبر بنانے اور اس کو زیادہ سے زیادہ اردو داں لوگوں تک پہنچانے کی بات کہی۔ شہر نگاراں کے معروف شاعر خالد فتح پوری نے رشید قریشی اور ماہنامہ لاریب کو جذباتی انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ نظامت کے فرائض بحسن وخوبی عاصم کاکوروی نے انجام دیے۔ کلمات تشکر ابوہریرہ عثمانی نے ادا کیے۔ اس موقعے پر سلیم تابش کو رشید قریشی ایوارڈ، ڈاکٹر زیبا ناز کو جگر مراد آبادی ایوارڈ اور ڈاکٹر نزہت فاطمہ کو فخر ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 جون 2023

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب وثقافت، تعلیم و تدریس، زبان ولسانیات، سائنس وٹکنالوجی، طب وفلسفہ، فنون لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کرلیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد وشمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہوچکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف: سید احتشام حسین
بارہویں اشاعت: 2023
صفحات: 327
قیمت: 150 روپے

کلیات کاوش بدری

ترتیب: سید ظہیر
پہلی اشاعت: 2023
صفحات: 224
قیمت: 145 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار

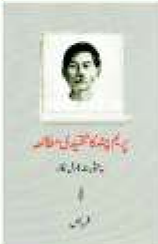

مصنف: قمر رئیس
دوسری اشاعت: 2022
صفحات: 378
قیمت: 220 روپے

طبی اخلاقیات

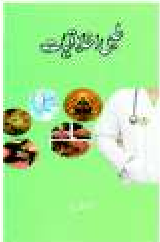

مصنف: حکیم فخر عالم
پہلی اشاعت: 2023
صفحات: 234
قیمت: 150 روپے

اخبار کی کہانی

مصنف: غلام حیدر
پانچویں طباعت: 2023
صفحات: 134
قیمت: 95 روپے

دور سے معلومات کا حصول

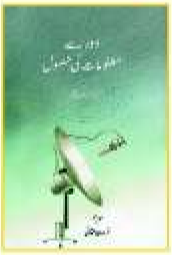

مصنف: محمد احرار عالم، مترجم: فرحت عثمانی
پہلی اشاعت: 2022
صفحات: 130
قیمت: 90 روپے

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

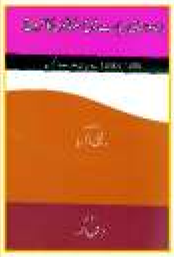

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور
دوسری اشاعت: 2022
صفحات: 533
قیمت: 245 روپے

ممتاز محل

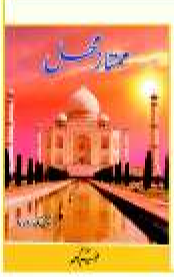

مترجم: فہیم احمد
پہلی اشاعت: 2022
صفحات: 442
قیمت: 210 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अगस्त-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०८

URDU DUNIYA Monthly, August-2023, Vol.25, Issue:08

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/07/2023

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages: 100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6